Sir Syed aur unki Tehreek
By
Zia-ud-din Lahori
ISBN: 978-969-8793-67-8

ضابطہ

نام کتاب	سرسیّداوراُن کی تحریک
تالیف	ضیاءالدین لاہوری
ناشر	محمد ریاض درانی
اشاعتِ اوّل	۲۰۰۷ء
کمپوزنگ	جمعیۃ کمپوزنگ سنٹر، وحدت روڈ لاہور
مطبع	اشتیاق اے مشتاق پریس' لاہور
قیمت	-/200 روپے

بہ اہتمام	محمد بلال درانی
قانونی مشیر	سید طارق ہمدانی (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)

فہرست

اسماء: لغاتی ترتیب کے مطابق

اصل نام کے پہلے حرف کے اعتبار سے

چند معروف ہم عصر علما کے فتوے

عقائد و قیام مدرسہ پر

استفتا

الجواب

کانگرس میں شرکت کے مسئلے پر

استفتا

الجواب

ایک اور استفتا اور اس کا جواب

مفتیانِ حرمین شریفین

عقائد سرسید پر

استفتا

الجواب

قیامِ مدرسہ پر

استفتا

الجواب

مفتیانِ مکہ معظمہ مذاہب اربعہ:

عربی میں نقد و نظر

عہدِ سرسید کے بعد

حرفِ آخر

کتابیات

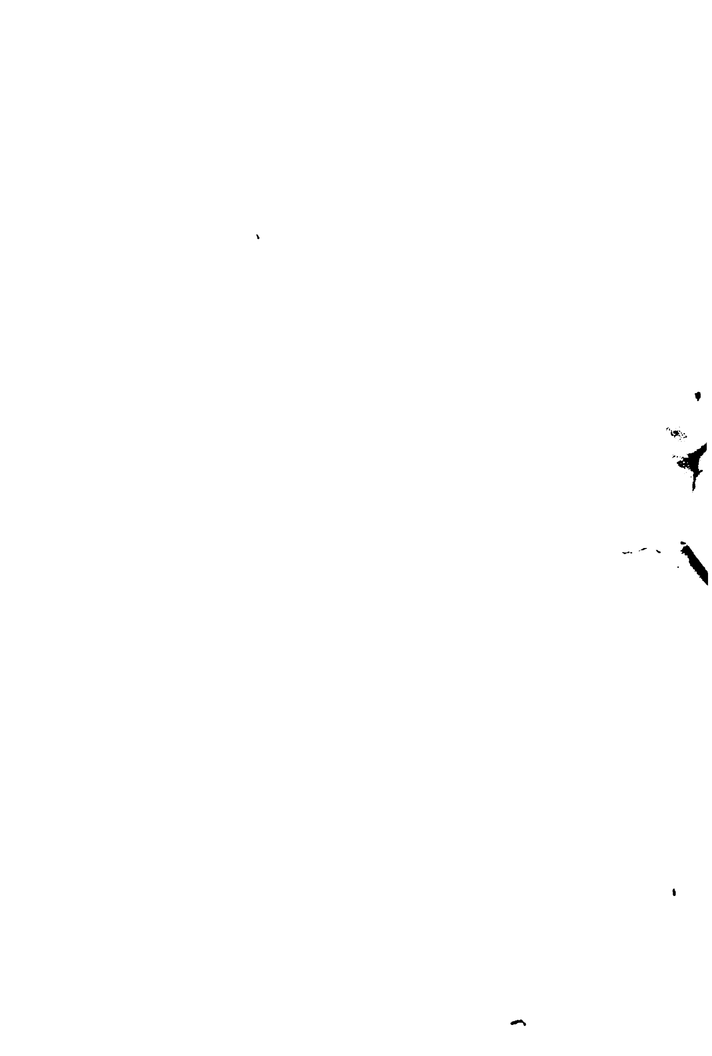
عرضِ ناشر

محترم جناب ضیاء الدین لاہوری سرسید احمد خاں پر متخصص کا درجہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے سرسید احمد خاں پر لکھتے ہوئے جس دقت نظر اور وسعت مطالعہ کا ثبوت دیا ہے، وہ اردو زبان میں اپنی مثال آپ ہے۔ آپ نے سرسید کی زندگی، فکر، کاموں اور کارناموں ہر شعبے اور ہر شعبے پر داد تحقیق دی ہے۔ انہوں نے یہ کام نہ تو کسی یونیورسٹی میں بیٹھ کر کیا ہے، نہ یونیورسٹی کی کسی ڈگری کے حصول کے لیے۔ اس کے باوجود ان کا کام یونیورسٹیوں کے سکالرز کے لیے ایک نمونہ اور معیار بن سکتا ہے اور بننا چاہیے۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم ان کے تحقیقی کاموں کو زیور طباعت سے آراستہ کر کے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

زیر نظر کتاب سرسید پر اب تک ہونے والے کاموں کا خلاصہ ہے۔ اس میں اب تک کے مفکرین و محققین کے حاصلاتِ تحقیق کا افشردہ انہی کے لفظوں میں پیش کیا گیا ہے۔ اس مجموعے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید احمد خاں کے بارے میں صرف مدح ہی نہیں، قدح بھی ملتی ہے۔ سرسید احمد خاں کے مخالفین اور موافقین نے آپ کے جن کاموں اور جن پہلوؤں پر نقد کیا، یہ تاریخ و ادب کا اہم باب ہے۔ یہ باب فکر و نظر کی ایک ایسی دنیا کی طرف کھلتا ہے جس میں اصول پسندی کا سکہ چلتا ہے، جہاں حق گوئی و حق شناسی کا دور دورہ ہے، جہاں صدق بیانی و راست گفتاری کا اصول رائج ہے، جہاں دروغ گوئی و دروغ بافی کے کھوٹے سکے نہیں چلتے، جہاں حق کو حق دیکھنے کا رواج ہے۔ ضیاء الدین لاہوری ہمیں اس دنیا کے شہر ہزار در تک لے جاتے ہیں۔ یہی ان کا کمال ہے۔ ہم ان کے باکمال شہ پارے شائع کرنے کا فخر حاصل کرتے ہیں۔ یہی ہماری خوش بختی و خوش نصیبی ہے۔

والسلام

محمد ریاض درانی



سخنے چند

تحقیق مسلمانوں کا تہذیبی ورثہ بھی ہے اور طرز زندگی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے دین و دانش کے بے شمار شعبوں میں بے شمار حقائق دریافت کیے اور عالم انسانی کو زندگی گزارنے کے لیے آسانیاں مہیا کیں۔ دین و دانش کے مختلف شعبوں میں اسماءالرجال اور تاریخ کے شعبے بھی ہیں۔ اسماءالرجال علم حدیث کا ذیلی شعبہ ہے۔ اس شعبہ علم میں مسلمانوں نے تحقیق کے وہ چراغ جلائے کہ آج بھی ان کی روشنی میں تاریخ کا ایک پورا دور روشن ہے۔ مسلمان کبھی نام و نسب سے مرعوب نہیں ہوئے۔ انھوں نے حق گوئی اور راست گفتاری کا فریضہ ادا کرتے ہوئے کسی کی شخصی وجاہت سے رعب نہیں کھایا۔ تحقیق کا یہی کڑا معیار تھا جس نے علم حدیث کو یقین کا درجہ مہیا کیا۔

مسلمان پر تاریخ کے ایک دور میں یہ بجوگ پڑا کہ دنیا بھر کو حریت اور آزادی کا پیغام دینے والے برطانوی امپیریلزم کے غلام ہو گئے۔ غلامی میں قوموں کا ضمیر بدل ہی جاتا ہے۔ یہی حال مسلمانوں کا ہوا۔ اب حقیقت پر شخصیات حاوی ہو گئیں، دلیل پر مفاد غالب آ گیا۔ تلاش حق کا فریضہ ادا کرنے والی بصارتیں اور بصیرتیں تعصب، شخصیت پرستی، مداہنت، مفاد اور مرعوبیت کے بوجھ تلے دب گئیں۔ کسی بڑے آدمی کے ہاتھ کی کھینچی ہوئی ٹیڑھی لکیر صراط مستقیم ہو گئی، گپ کا وہ احترام ہوا کہ ایسا احترام صرف وحی الٰہی کا کیا جا سکتا ہے۔ شخصیت کا وہ احترام ہونے لگا جو صرف مامور من اللہ کا ہو سکتا ہے۔ اس فضا میں جامعات میں تحقیق کا کام بھی مفروضہ سازی اور گپ بازی سے نجات نہ پا سکا۔ مقالے تو لکھے گئے، لیکن اکثر میں تحقیق کی روشنی تھی نہ علم کا وزن اور وقار، صفحات کا بوجھ تھا یا بے سود لفظوں کے ڈھیر۔ ایسے میں جو معدودے چند مقالات تحقیق کے معیار پر پورے اُترتے تھے وہ بھی لایعنی مقالوں کے ڈھیر میں گم ہو گئے۔

ہمارے عہد میں جامعات اور جامعات کے باہر چند درویش صفت لوگ اب بھی تحقیق کے چراغ جلا رہے ہیں۔ ان کی تحقیق کالے لفظوں کا ڈھیر نہیں ہوتی، صداقت کی روشنی ہوتی ہے۔ انھی چند درویش صفت لوگوں میں ضیاء الدین لاہوری کا نام بہت نمایاں ہے۔ ان کے

موضوعاتِ تحقیق کوئی بہت زیادہ نہیں ہیں، مگر انھوں نے جن چند ایک موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے۔ تحقیق کا حق ادا کر رہا ہے۔ ان کا ایک موضوع سرسیّد احمد خاں ہے۔ اس موضوع پر اب تک ان کی چار تالیفات زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ زیرِنظر کتاب اسی سلسلے کی پانچویں کتاب ہے۔ ابھی ان کا سفر جاری ہے، یہ سفر بالیقین بامراد ہے۔

جناب ضیاءالدین لاہوری نے سرسیّد احمد خاں کی حقیقی تصویریں پیش کی ہیں اور اُن کے نظریات کی من مانی یا خودساختہ تعبیریں پیش کرنے کی کہیں کوشش نہیں کی۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے زیادہ تر سرسیّد کی اپنی تحریروں کو پیش کیا ہے یا سرسیّد کے قریب ترین رفقا یا مستند سوانح نگار مولانا حالی کی تحریروں کو پیش کیا ہے۔ زیرِنظر کتاب میں انھوں نے عہدِ سرسیّد سے اب تک اُن پر ہونے والے نقد و نظر کا جائزہ لیا ہے اور ایسے منتخب اقتباسات پیش کیے ہیں جن میں سرسیّد کے فکر و نظر کا حقیقی منظر نامہ بھی مرتب ہو گیا ہے اور نقدِ سرسیّد کی تاریخ بھی ایک تسلسل اور ترتیب سے مدوّن ہو گئی ہے۔

سرسیّد کے عہد سے اب تک بعض لوگوں نے انھیں کلیتہً مسترد کر دیا۔ بعض نے انھیں جزواً قبول کیا اور بعض نے انھیں سرتاسر تسلیم کر لیا۔ تیسری قسم کے لوگ جب فکرِ سرسیّد پر لکھنے بیٹھتے ہیں تو تاویلِ فاسد کا سہارا لیتے ہیں یا ان کی تعبیر پیش کرنے میں وہ انداز اختیار کرتے ہیں جو سرسیّد نے تفسیرِ قرآن میں اختیار کیا تھا۔ اس کے باوجود وہ سرسیّد سے اختلاف کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جناب ضیاءالدین نے ان تینوں طرح کے لوگوں کے نقد و تجزیہ کو ایک خوبصورت ترتیب سے جمع کیا ہے۔ یہ نقد و تجزیہ نئے مطالعات کا در کھولتا ہے۔ یہی اس کا جواز بھی ہے اور امتیاز بھی۔

ہمارے ہاں بعض شخصیات کے بارے میں نقد و نظر کا باب بند سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے ہمارے ہاں اپنی تاریخ سے بے اعتنائی اور جہالت کا رویہ پیدا ہوا ہے۔ جناب ضیاءالدین نے اس بند دروازے کو کھولنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش یقیناً تاریخ سے آگاہی پر منتج ہوگی۔ تاریخ سے حاصل ہونے والا شعور ہمارے آج کو روشن اور آنے والے آج کو روشن تر بنانے میں ممد و معاون ہوگا۔

والسلام

امجد علی شاکر

192- ای پی آئی اے ہاؤسنگ سوسائٹی لاہور

۱۲ شوال ۱۴۲۷ھ

حرفِ اوّل

سرسید پر بہت کچھ لکھا گیا، لکھا جا رہا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ عام قارئین کے ذہنوں میں اس عظیم شخصیت کے بارے میں حسین انداز کا ایک ایسا خاص تاثر جاگزیں کیا جاچکا ہے کہ وہ اس تاثر کی حامل تحریروں پر محض ایک طائرانہ نظر ڈال کر ہی دلی سکون حاصل کر لیتے ہیں۔ان کے لئے بس یہی خوش کن کیفیت ہوتی ہے کہ ان کے مثالی ہیرو کے بارے میں تعریفی مضمون لکھا گیا۔ان میں سے کوئی بھی ان تحریروں کا تاریخی اور تحقیقی طور پر مطالعہ کرنے کی زحمت نہیں کرتا حالانکہ ان میں بھی بعض ایسے نکات مل جاتے ہیں جنہیں اگر باقی مضمون سے الگ کر کے بیان کیا جائے تو بہت سی جبینوں پر بل پڑ جائیں۔مطالعہ سرسید میں جب ایسے بہت سے نکتے نظر سے گزرتے رہے تو ایک مرتبہ راقم کو خیال آیا کہ سرسید کے متعلق تحریروں کی چھان پھٹک کر کے ان میں سے زیادہ سے زیادہ اہم نکات جمع کئے جائیں جو قارئین کو ایک ہی جلد میں مہیا ہوں۔ چند سال قبل اس منصوبے پر کام شروع کیا اور عہدِ سرسید سے لے کر موجودہ زمانے تک کی سرسید سے متعلق بے شمار تحریروں کی ورق گردانی کرتا ہوا بالآخر اس منزل پر پہنچا کہ اڑھائی سو سے زائد افراد کے بیان کردہ اہم نکات ترتیب پا گئے۔محدود وسائل کے باعث سینکڑوں تحریریں مطالعہ سے رہ گئیں مگر انہی کو غنیمت جان کر قارئین کی خدمت میں پیش کرنے

کا فیصلہ کیا۔ ان میں ایسی تحریریں بھی ہیں جن میں اعتدال کی کیفیت پائی جاتی ہے جبکہ ایک تعداد ایسی بھی ملے گی جو مخالفت یا موافقت میں انتہا پسندانہ رویے کی حامل کہی جا سکتی ہیں۔ شدید قسم کی تنقیدوں کو پڑھ کر سرسید کے شیدائی کہیں گے کہ یہ کھلی سرسید دشمنی کا مظہر ہیں۔ اس کے برعکس سرسید کی شان میں زمین اور آسمان کے قلابے ملا ڈالنے والی آرا کو پڑھ کر دوسرا طبقہ کہہ سکتا ہے کہ سرسید کی پوجا میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی۔ نظر اپنی اپنی خیال اپنا اپنا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ سرسید کی شخصیت اور اُن کے کاموں پر کوئی حتمی رائے قائم کرنے سے پہلے دونوں پہلوؤں کا مطالعہ بہت ضروری ہے کیونکہ بعض تحریروں میں ایسے نکات ملیں گے جو اس موضوع کے متخصصین کے لئے بھی حیران کن ہو سکتے ہیں، اور عام قارئین کے لئے تو اکثر تحریروں میں بیان کردہ معمولی معمولی نکتے بھی ان کے لئے نئی معلومات ہوں گے۔

اس مطالعہ میں سرسید کے قریب ترین رفقائے کار کی تنقیدیں خاص طور پر قابلِ غور ہیں کیونکہ وہ علی گڑھ مشن کے ستون تھے اور ان علما کے قطعاً زیرِ اثر نہ تھے جنھوں نے سرسید کے خلاف فتوے جاری کئے یا کروائے۔ ان فتووں کے متعلق اکثر یہ بدگمانی پھیلائی جاتی ہے کہ فتویٰ باز علما انگریزی پڑھنا کفر جانتے تھے جبکہ سرسید انگریزی تعلیم کے زبردست حامی تھے، اس لئے انہوں نے سرسید کے خلاف فتوے جاری کئے۔ اصل صورتِ حال کی وضاحت کے لئے فتووں کے باب میں استفتا اور جوابات کی عبارتیں بھی متن میں شامل کی گئی ہیں تاکہ قارئین حقیقت جان سکیں۔

اگرچہ بعض غیر مسلم مصنفین نے بھی مذہبی معاملے میں سرسید پر تنقیدیں کی ہیں اور بعض نے ان کی سیاسی حکمتِ عملی کی تعریف کی ہے مگر راقم نے صرف اور صرف مسلمانوں کی تحریروں سے انتخاب کیا ہے، البتہ اگر مسلمانوں جیسے نام کی مشابہت کے باعث کوئی غیر مسلم بھی ان میں شامل ہو گیا ہو تو اس لاعلمی پر معذرت قبول فرمائیے۔

میں عمر کے اس حصے میں داخل ہو چکا ہوں جہاں ایک طرف بڑھاپے کے عوارض سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے اور دوسری طرف قویٰ میں تنزل انسانی عزائم پر اثر انداز ہونے لگتا ہے۔ اس کے باوجود میں اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے اتنی ہمت دے رکھی

ہے کہ اپنے کام میں جتا رہتا ہوں۔ بعض سیانوں کی طرح اپنی تالیفات کی تیاری اور تکمیل میں سہولت اور ان میں اضافہ کی خاطر کبھی ملازم یا شاگرد پالنے کا دھندا اختیار نہیں کیا۔ مواد کی تلاش میں کتب خانوں کی خاک چھاننے، حوالے نقل کرنے، مسودات تحریر کرنے، کمپوزنگ کے لئے تحریر کے خاکے تجویز کرنے اور پروف ریڈنگ تک کے تمام مراحل خود ہی طے کرتا ہوں البتہ اس کتاب کے مواد کی تلاش میں خاص تعاون پر میں جناب شبیر احمد میواتی کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اس موضوع کے ساتھ خصوصی دلچسپی کے پیشِ نظر وہ مجھے وقتاً فوقتاً متعلقہ کتابیں اور جرائد نقل کے لئے مہیا کرتے رہے۔

ضیاءالدین لاہوری

الحقائق۔ آصف بلاک
علامہ اقبال ٹاؤن۔ لاہور
(۲۰۰۷ء)

رفقائے سرسید کا انتقاد

الطاف حسین حالی

محکوم بن کر رہنے کا سبق:

سرسید احمد خاں مرحوم کے جہاں ہم پر اور بہت سے احسانات ہیں، اُنہی میں سے ایک بہت بڑا احسان یہ ہے کہ وہ ہمارے لئے ایک ایسی بے بہا زندگی کا نمونہ چھوڑ گئے ہیں جس سے بہتر ہم اپنی موجودہ حالت کے موافق کوئی نمونہ قوم کی تاریخ میں نہیں پا سکتے۔ اگرچہ ہماری قوم میں بڑے بڑے اولوالعزم بادشاہ، بڑے بڑے دانشمند وزیر اور بڑے بڑے بہادر سپہ سالار گزرے ہیں مگر اُن کے حالات اس کٹھن منزل میں، جو ہم کو اور ہماری نسلوں کو درپیش ہے، براہ راست کچھ رہبری نہیں کر سکتے۔ ہم کو اب دنیا میں محکوم بن کر رہنا ہے اور اس لئے وہ لیاقتیں، جو سلطنت اور کشور کشائی کے لئے درکار ہیں، ہمارے لئے بے سود ہوں گی۔

(حیاتِ جاوید (۱): ص ۱)

انگریزی گورنمنٹ کی برکات کی دل سے قدر:

اس کوہ وقار شخص نے کبھی ہمت نہ ہاری، یہاں تک کہ اپنی کوششوں میں کامیاب



اور ہزاروں یہ خیال کرتے تھے کہ مدرسہ قوم کے فائدہ کے لئے قائم نہیں کیا گیا بلکہ اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ انگریزی سلطنت کو زیادہ استحکام ہو۔ اگرچہ اس خیال کا دوسرا جز صحیح تھا مگر پہلا جز اس لئے غلط تھا کہ حالت موجودہ میں مسلمانوں کی قومی زندگی اسی بات پر موقوف ہے کہ انگریزی سلطنت کو زیادہ استحکام ہو۔

(حیات جاوید (۲) ص ۳۱۷)

شریفانہ اور باقاعدہ اطاعت وفرماں برداری، جو ہر قوم کا اور خاص کر محکوم قوم کا زیور ہے، اس کی عادت ڈلوانے اور مشق کرانے کے جو ذریعے اس بورڈنگ ہاؤس میں موجود ہیں، ظاہراً ہندوستان کے کسی انسٹی ٹیوشن میں موجود نہیں ہیں۔ (ایضاً ص ۹۷)

کالج کے تعلیمی نتائج میں کوئی خصوصیت نہیں:

ان نتائج سے محمدن کالج کی کوئی ایسی خصوصیت ظاہر نہیں ہوتی جس کی رو سے اس کو ہندوستان کے اور کالجوں پر ترجیح دی جاسکے یا اس کو مسلمانوں کے حق میں زیادہ مفید سمجھا جائے۔ سوا اس کے کہ اس کالج میں ہندوستان کے اور کالجوں کی نسبت مسلمان طلبہ کی تعداد کسی قدر زیادہ پائی جاتی ہے، کوئی تفاوت تعلیم اور نتائج تعلیم کے لحاظ سے محسوس نہیں ہوتا، نہ یہاں کے طالب علموں نے آج تک فضیلت اور علمی لیاقت میں اور کالجوں کے طلبہ پر کوئی صریح فوقیت دکھائی ہے اور نہ یہ ثابت کیا ہے کہ یونیورسٹی کے نتائج امتحان میں اس کالج کے تعلیم یافتہ بہ نسبت دیگر کالجوں کے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ پس تاوقتیکہ کوئی وجہ امتیاز کی نہ بتائی جائے، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے اس سے بہتر اور اس سے مفید تر کوئی انسٹی ٹیوشن نہیں ہے۔ (ایضاً: ص ۸۴)

نکمے ٹرسٹیوں کی بھرتی:

نکمے ٹرسٹیوں کی بھرتی درحقیقت سرسید کے وقت میں شروع ہوئی تھی۔ انہوں نے کالج کی وقعت بڑھانے کے لئے اور نیز اس لئے کہ اُن کے دور اندیشانہ منصوبے بغیر کسی اختلاف کے پورے ہوتے رہیں گے، ایسے لوگوں کو کالج فنڈ کمیٹی کا ممبر بنایا تھا جن سے مالی امداد کی توقع

ہو یا جو قوم میں کسی وجہ سے شہرت رکھتے ہوں اور سیکرٹری سے کسی معاملہ میں اختلاف کرنے کا نہ اُن میں مادہ ہو اور نہ ارادہ۔ پھر جب ٹرسٹی بل پاس ہوا تو وہ ہی لوگ ٹرسٹی مقرر کئے گئے۔

(مجموعہ خطوط حالی بحوالہ تذکرۂ محسن ص ۲۱۳)

تفسیر میں جا بجا ٹھوکریں، رکیک لغزشیں، فاحش غلطیاں، بودی تاویلیں، بایں ہمہ:

آخر عمر میں سرسید کی خود آرائی یا جو وثوق کہ ان کو اپنی رایوں پر تھا، وہ حد اعتدال سے متجاوز ہو گیا تھا۔ بعض آیات قرآنی کے وہ ایسے معنی بیان کرتے تھے جن کو سن کر تعجب ہوتا تھا کہ کیونکر ایسا عالی دماغ آدمی ان کمزور اور بودی تاویلوں کو صحیح سمجھتا ہے! ہر چند کہ ان کے دوست ان تاویلوں پر ہنستے تھے مگر وہ کسی طرح اپنی رائے سے رجوع نہ کرتے تھے۔

(حیات جاوید (۲) ص ۵۲۲)

بہت سے مقامات ان کی تفسیر میں ایسے بھی موجود ہیں جن کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایسے عالی دماغ شخص کو کیونکر ایسی تاویلات باردہ پر اطمینان ہو گیا اور کیونکر ایسی فاحش غلطیاں ان کے قلم سے سرزد ہوئی ہیں!

(مقالات حالی (۱) ص ۲۲۵)

اگرچہ سرسید نے اس تفسیر میں جا بجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض بعض مقامات پر ان سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی ہیں، بایں ہمہ اس تفسیر کو ہم ان کی مذہبی خدمات میں ایک نہایت جلیل القدر خدمت سمجھتے ہیں۔ (ایضاً (۱) ص ۲۳۲)

شبلی نعمانی

کمینہ قومیں اور حکومتی عہدے:

نیشنل کانگرس کی مخالفت کی سب سے بڑی وجہ سرسید نے یہ ظاہر کی تھی کہ اگر مقابلہ کا امتحان، جو نیشنل کانگرس کے مطالبات میں ہے، ہندوستان میں جاری ہوا تو کمینہ قوموں کو حکومت کی کرسیاں نصیب ہوں گی اور ہندوستان کی شریف قومیں اپنے ملک کے ایک ادنیٰ درجہ کے شخص کا، جس کی جڑ بنیاد سے وہ واقف ہیں، کبھی اپنی جان اور مال پر حاکم ہونا پسند نہ کریں گے۔ لیکن

ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ بڑھئی، جلاہے، رائیں کاڈیں بڑے بڑے عہدوں پر پہنچے اور بڑے بڑے تیس مار خانوں اور نسلِ تیمور اور آلِ ہاشم نے ان کے آگے گردنیں جھکا دیں۔

(مقالات شبلی [۸] ص ۱۶۸)

ارکانِ کالج کی جانب سے عربی تعلیم کی تحقیر:

ارکانِ کالج سے ایک بڑا نکتہ جو فروگزاشت ہوا اور ہو رہا ہے، وہ یہ ہے کہ موجودہ طریقہ سے وہ صرف ان لوگوں کو انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ کر سکے اور کر سکتے ہیں جن کو معاش کی ضرورت نے انگریزی تعلیم پر مجبور کر رکھا ہے اور اُمرا اور رؤسا، جن کو معاش کی فکر نہیں، وہ انگریزی کے واسطے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ لیکن اگر انگریزی تعلیم کے ساتھ پورے طور پر عربی اور مذہبی تعلیم کا بھی بندوبست ہوتا تو علی گڑھ کالج کے احاطہ میں تعلقہ دارانِ اودھ اور اہالیانِ ملک کے خاندان کی یادگاریں بھی نظر آتیں میری ہرگز یہ رائے نہیں کہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے ہٹا کر عربی کی طرف متوجہ کیا جائے۔ ایسا کرنا بے شبہ قوم کے ساتھ دشمنی ہے، لیکن اس بحث میں خواہ مخواہ علومِ عربیہ کی تحقیر میں ارکانِ کالج کا اس قسم کے فقرے استعمال کرنا کہ ''ہم سے ہرگز یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ہم عربی تعلیم پر ایک حبہ بھی صرف کریں گے'' نہایت ظلم اور ناانصافی ہے اور اس سے ظاہر ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں کے دل میں کیا جذبات پوشیدہ ہیں۔ یہ کہنا کہ عربی زبان ہماری مذہبی زبان نہیں ہے، اور ہے تو صرف قرآن پڑھ لینا کافی ہے، ایک عامیانہ فریب دہی بلکہ بیہودہ ڈپلومیسی ہے۔ صاف کہنا چاہیے کہ ہم کو قرآن کی بھی ضرورت نہیں عربی کی تحقیر نے ثابت کر دیا کہ قوم واقعی ذلت کے اخیر درجہ پر پہنچ گئی ہے کیونکہ کوئی قوم اس وقت تک ذلیل نہیں ہوتی جب تک وہ خود اپنے آپ کو ذلیل نہ سمجھے، اور یہ درجہ اب قوم نے حاصل کر لیا۔

(بحوالہ ''سرسید تحریک کا ردِ عمل'' ص ۱۰۷)

سرسید سے مذہبی اور سیاسی مسائل پر اختلاف:

مجھ کو سرسید کے مذہبی مسائل سے سخت اختلاف تھا اور میں ان کے بہت سے عقائد و خیالات کو بالکل غلط سمجھتا تھا۔

(انتخاب مقالاتِ شبلی ص ۶۲)

سرسید کے ساتھ سولہ برس رہالیکن پولیٹیکل مسائل میں ہمیشہ ان کے مخالف رہا اور سرسید سے بارہا بحثیں رہیں۔

(بحوالہ ''شبلی نامہ'': ص۷۹)

نواب وقارالملک مولوی مشتاق حسین

پیشوایانِ دین پر تبرا:

(بنام سرسید) فقہ حنفیہ کی وہ کتابیں ''جن میں سراسر حیلہ ہی بھرا پڑا ہے'' میں نے نہیں پڑھیں، پس مجھے اس کا طعنہ فضول ہے۔اور آج کل اس غریب فقہ کا خلیہ کس شمار میں ہے جہاں قانون میں ایسی ایسی باریکیاں موجود ہوں اور مفتیانِ زمانہ میں ایسے ایسے عالی دماغ موجود ہوں اگر آپ کے خط میں امام ابوحنیفہؒ پر طعن وتشنیع نہ ہوتی اور آپ ان کو ضمناً حیلہ باز نہ کہتے تو میں اس جملے کے جواب ہی کو قلم انداز کر جاتا لیکن اس بات کی آپ مجھ سے توقع چھوڑ دیں کہ میں ان پیشوایانِ دین پر، جنھوں نے نہایت نیک نیتی سے آپ ہی کی مانند اپنی عمر اُمت اسلامیہ کی درستیٔ احوال میں صرف کی ہو، تبرا سننے پر راضی ہوں۔

(سلیکٹڈ ڈاکومنٹس فرام دی علی گڑھ آرکائیوز: ص۱۸۵۔۱۸۶)

''تہذیب الاخلاق'' کے بے لگام مضمون:

(بنام سرسید)... لوگوں کی رائے سے میں آپ کو صحیح صحیح اطلاع دیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اس مدرسہ کی طرف سے تو اس وقت تک کسی کو شکایت نہیں ہے۔ہاں، ''تہذیب الاخلاق'' کے مضامین تازہ کے سبب سے البتہ لوگوں کو ایک بدگمانی ہے۔لیکن وہ بدگمانی آپ کی ذات کے ساتھ ہے، نہ اس مدرسہ کی نسبت ہاں، ایک بات میں بھی لکھنے کو تھا کہ اس کے سبب سے آپ مجھ کو منافق یا دغاباز کہہ لیں، اور وہ یہ ہے کہ جب تک اس مدرسہ کے لئے پورا چندہ نہ ہو جائے، تب تک ''تہذیب الاخلاق'' کے لئے بے لگام مضمونوں کی فی الجملہ روک تھام ضرور ہے۔آپ کو شاید معلوم نہیں کہ وہ مضامین ایک قوی مزاحمت کرتے ہیں اس چندہ کے واسطے۔

اور کیا آپ کو ایسے مضامین کے سوا اور کچھ مضمون نہیں ملتا؟ (ایضاً ص ۱۸۱)

آزادیٔ رائے --صرف اپنے لئے!

یہ ایک امر مسلّمہ ہے کہ آپ نے جس قدر آزادیٔ رائے کی خوبیوں پر زور دیا ہے وہ صرف آپ اپنے واسطے کام میں لانا چاہتے ہیں اور دوسرے کی آزادیٔ رائے کو، جو آپ سے کسی بات میں اختلاف کرتا ہو، وہ آپ تہِ دل سے سننا نہیں چاہتے مجھ کو اس بات کا یقین ہے کہ اب جو آپ کے قلم سے 'ناں' نکل گئی ہے تو خدا ہی ہے جو اس کی جگہ 'ہاں' نکلے۔

(مکاتیب نواب محسن الملک و نواب وقار الملک ص ۷۴-۷۵)

(علی گڑھ تحریک کے معاون نواب حاجی محمد اسمٰعیل خاں رئیس دتاولی تحریر کرتے ہیں "مجھ کو خوب یاد ہے کہ کالج کے معاملات میں نواب وقار الملک مرحوم اور سید صاحب مرحوم کے درمیان ہمیشہ سخت اختلاف رہا مگر دونوں بزرگ تحمل اور بُردباری سے رہتے تھے اور احمقانہ رنجشوں سے دور رہتے تھے نواب وقار الملک مرحوم نے ہمیشہ باوجود اختلافوں اور سید صاحب مرحوم کے غصہ کے، سید صاحب مرحوم اور سید محمود صاحب مرحوم سے نہایت سنجیدہ اور محبت آمیز سلوک رکھا اور سوائے اس کے کہ وہ سید صاحب مرحوم کی رایوں کو نہ مانتے تھے، اور کسی طرح پر ادب و لحاظ میں کمی نہ کرتے تھے۔)

(تذکرہ وقار ص ۱۰۹)

سرسید کی یورپین نواز پالیسی پر رفقائے کار کی تشویش کا عالم:

(بنام الطاف حسین حالی) ایک خاص مضمون بہت ہی کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اگر جناب سرسید مرحوم و مغفور ایک مہینہ بھی اور زندہ رہتے تو جناب اور محسن الملک اور خاکسار کے دستخطوں سے ایک یادداشت ٹرسٹیوں میں جاری ہو چکی تھی کہ کالج کی خبر لیں اور اس کو یورپین سٹاف کے ہاتھوں میں چلے جانے سے روکیں۔

(مکاتیب نواب محسن الملک و نواب وقار الملک ص ۹۵)

.....ان حالات کو دیکھ کر وہ لوگ، جن کو قوم کا زیادہ درد تھا، بہت فکر میں پڑ گئے تھے اور باہم سرگوشیاں ہونے لگی تھیں۔ اور بالآخر باوجود سرسید مرحوم و مغفور کے ان اقتدارات اعظم

وہ نعمت ہو ہے جس کی دوسری نظیر شاید مدت تک نہ ملے گی، بعض ٹرسٹیوں نے فیصلہ کر
یہ تھا کہ اب ہم کو صرف قوم کی بہبودی کا خیال مدنظر رکھنا چاہیے اور جناب مرحوم و مغفور کی
مروت کو قوم کے مقابلہ میں بالائے طاق رکھنا چاہیے۔ مضامین کا ایک سلسلہ روزانہ پیسہ اخبار
لاہور میں چھپنا تجویز ہوا تھا جو گمنام نہ ہوتا بلکہ اس پر ایسے لوگوں کے دستخط ثبت ہوتے جیسے کہ
نواب محسن الملک اور شمس العلما مولوی خواجہ الطاف حسین حالی اور ایک یہ خاکسار مشتاق
حسین۔ اور مجھ کو اس وقت اچھی طرح یاد نہیں رہا، غالباً آنریبل حاجی محمد اسمٰعیل خاں بہادر کے
دستخطوں کا بھی ان مضامین پر ثبت ہونا تجویز ہو گیا تھا۔ ان مضامین کے ذریعہ یہ بات ثابت
کرنی مقصود تھی کہ کالج کے قیام سے جو اصل مقصد تھا، اب جناب مرحوم و مغفور اپنے ہاتھ سے
اس کو برباد کر رہے ہیں اور ٹرسٹیوں اور قوم کو چاہیے کہ وہ جناب مرحوم کی اس خود مختاری کو روکے
اور کالج کو تباہی سے بچائے۔ پہلا نمبر اس سلسلہ مضامین کا میں نے اپنے قلم سے لکھا تھا اور
نواب محسن الملک بہادر اور شمس العلما مولوی حالی صاحب کی خدمت میں، جو غالباً اس وقت علی
گڑھ ہی میں تشریف رکھتے تھے، دستخطوں کے لئے بھیجا گیا تھا کہ دفعتاً جناب مرحوم و مغفور کی
رحلت کی خبر پہنچی اور میں نے فوراً نواب محسن الملک کو تار دیا کہ وہ مضمون واپس کر دیں کیونکہ اب
ہمارے دلوں میں جناب ممدوح کی خوبیوں اور بے نظیر عمدہ اوصاف کے سوا اور کوئی خیال باقی
نہیں ہے۔ چنانچہ اسی وقت سے ان مضامین کا سلسلہ ترک کر دیا گیا۔

(پیسہ اخبار لاہور [۱۹۰۷ء] بحوالہ ''تذکرہ وقار'' ص ۱۵۳۔۱۵۴)

نواب محسن الملک سید مہدی علی خاں

زمانہ جدید کے لامذہبوں پر غیر معمولی یقین:

(بنام سرسید) افسوس ہے کہ آپ نے ان مسائل کو، جو آج کل یورپ کے وہ تعلیم
یافتہ لوگ جو مذہب کے پورے پابند اور معتقد نہیں ہیں، صحیح اور یقینی اور غیر قابل الاعتراض سمجھتے
ہیں، مان لیا اور قرآن کی آیتوں کو جن میں اُن کا ذکر ہے ایسا ماول کر دیا کہ وہ تاویل ایسے درجہ پر
پہنچ گئی کہ اس پر تاویل کا لفظ بھی صادق نہیں ہو سکتا۔ آپ نے مسلمان مفسروں کو تو خوب گالیاں

دیں اور برا بھلا کہا اور یہودیوں کا مقلد بتایا مگر آپ نے خود اس زمانہ کے لامذہبوں کی باتوں پر ایسا یقین کر لیا کہ اُن کو مسائل محققہ صحیحہ یقینیہ قرار دے کر تمام آیتوں کو قرآن کے ماول کر دیا اور لطف یہ ہے کہ اسے تاویل بھی قرار نہیں دیتے (تاویل کو تو آپ کفر سمجھتے ہیں) بلکہ صحیح تفسیر اور اصلی تفسیر قرآن کی سمجھتے ہیں۔

(تحریر فی اصول التفسیر ص ۲)

قرآن کے مقصود کے مخالف تاویلیں:

(بنام سرسید) مجھ سے بڑھ کر کوئی نہیں جانتا کہ تفسیر لکھنے سے آپ کا مقصود کیا ہے۔ کچھ نہیں، سوائے اس کے کہ اسلام اپنی سلطنت پر قائم رہے اور علم اس کا دوست سمجھا جائے۔ اور آپ کی تفسیر میں اس بات کی بہت سی نشانیاں بھی پائی جاتی ہیں اور وہ غور سے دیکھنے والے کو نہایت اعلیٰ مضامین اور حکیمانہ خیالات اور محققانہ باتوں سے بھری ہوئی نظر آتی ہے مگر میں یہ نہیں مانتا کہ آپ ہر جگہ اس مقصود کے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے، بلکہ برخلاف اس کے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ بعض جگہ تسامح کے درجہ سے گزر کر مغالطہ میں پڑ گئے اور جس حد پر پہنچ کر آپ کو ٹھہرنا چاہیے تھا، اُس سے گزر گئے۔ آپ نے اُن باتوں کو، جو اس زمانہ کے فلاسفہ نے پیدا کی ہیں، بغیر کسی شک وشبہ کے صحیح اور یقینی مان لیا اور جو باتیں قرآن میں بظاہر اس کی مخالف معلوم ہوئیں اُس میں ایسی تاویلیں کرنی شروع کیں کہ قرآن کا مقصود ہی فوت ہو گیا، اور اس پر ستم ظریفی آپ یہ ہے کہ آپ تاویل کو کفر قرار دیتے اور اپنی تفسیر کو قرآن کے الفاظ اور سیاق اور محاورے اور مقصود ومحاورے کے مطابق بتاتے ہیں۔ بعض جگہ تو آپ قرآن کا وہ مطلب سمجھے جو نہ خدا سمجھا، نہ جبریل، نہ محمدؐ، نہ اصحابہ، نہ اہل بیت، نہ عامہ مسلمان، اور کہیں نیچر کے دائرہ سے نکل گئے اور مذہبی آدمیوں کی طرح پرانے خیالات اور پرانی دلیلوں اور پرانی باتوں کا گیت گانے لگے۔ چنانچہ آپ کی تفسیر میں دونوں باتوں کا جلوہ نظر آتا ہے۔ جہاں آپ نے دعا اور اجابت دعا کے مشہور معنوں سے انکار کیا، معجزات اور خرقِ عادات کو ناممکن سمجھ کر حضرت عیسیٰ کے بے باپ پیدا ہونے اور اُن کی طفلی کے زمانہ کے واقعات اور احیائے اموات وغیرہ باتوں کو اہل کتاب کی کہانیاں بتلایا وہاں آپ نے دکھادیا کہ آپ کی تفسیر قرآن کے الفاظ اور سیاق عبارت

اور اس کے عام منشا سے کچھ مناسبت اور مطابقت نہیں رکھتی۔ (ایضاً ص۲۲۔۲۳)

تفسیر میں مثبت اور منفی مطالب کی شدت کا عالم:

جب کسی بات کا خیال کسی کے دل میں پورے طور پر بیٹھ جاتا ہے تو اس کے خیالات جادۂ اعتدال سے گزر جاتے ہیں۔ یہی حال ہمارے سرسید کا ہے۔ ان کی تفسیر اٹھا کر دیکھئے۔ بعض جگہ ان کے خیالات ایسے روشن اور پاک نظر آتے ہیں کہ گویا ایک صاف دریا ہے کہ بہتا چلا جا رہا ہے اور خدا کی زمین یعنی مسلمانوں کے دلوں کو شاداب کر رہا ہے اور بعض مقام پر وہ آیات قرآنی کی ایسی تفسیر کرتے ہیں کہ قرآن ایک کلام مہمل اور پوچ معلوم ہوتا ہے اور اس کا مقصود اور مطلب سارا فوت ہو جاتا ہے۔ کہیں ان کے دلائل ایسے مستحکم اور مضبوط ہیں جو ہندسی دلیلوں کے موافق دل پر اثر کرتے ہیں، کہیں وہ اپنے دعویٰ کا ایسا ثبوت دیتے ہیں کہ اس پر ہنسی آتی ہے۔

(مکاتبات دلچسپ بحوالہ سرسید تحریک کا ردعمل ص۱۵۰)

مرحوم سرسید کے خیالات کا سب سے زیادہ جاننے والا اور ماننے والا میں ہوں۔ مجھ سے زیادہ کوئی شخص ان کا عقیدت مند اور ان کی عزت کرنے والا نہ ہوگا لیکن ان کی رائے مثل قرآن وحدیث کے نہ تھی۔ وہ نبی نہ تھے، وہ معصوم نہ تھے، ان کی گفتگو وحی آسمانی نہ تھی۔ جب ان کا کوئی قول پیش کیا جائے جو خلاف حدیث ہو تو باوجود ہم ان کی عزت، عظمت و اقتدار کے سر تسلیم خم نہ کریں گے۔

(مجموعہ لیکچرز و اسپیچ نواب محسن الملک ص۳۴۲)

مسلمہ عقائد سے اختلاف پر کفر کے فتوے:

یہ سچ ہے کہ ہمارے مسلمہ عقائد سے وہ اختلاف رکھتے تھے اور اس اختلاف کو انہوں نے شد و مد کے ساتھ ظاہر بھی کر دیا جس کی وجہ سے تمام مسلمان اور اکثر علما کو اُن کے اسلام پر قائم رہنے میں شبہ تھا اور بعض نے یہاں تک کہ کفر کے فتوے بھی دے دئے۔ اور اُن کو کیا کہوں، خود مجھ کو بہت سے مسائل میں ان سے اختلاف کرنا پڑا، بحث و مباحثے رہے۔ (ایضاً ص۵۰۸)

شاید سب سے پہلے میں نے ہی اُن کے کفر کا فتویٰ دیا تھا، اُن کو ''چھپا پادری'' کہا۔

(ایضاً ص۴۱۲)

اپنی پولٹیکل مجلس نہ بنانے کے باعث اپنے حقوق سے محرومی:

اب تک ہمارا خاموش رہنا اور اپنی پولٹیکل مجلس نہ بنانا اور اپنے نفع و نقصان پر غور نہ کرنا اور تعلیم یافتوں کو آزادی کے ساتھ ان مسائل پر بحث کرنے کا موقع نہ دینا، جن پر ان کی قوم کی بقاو ثبات کا دارومدار ہے، ایک ایسی حالت تھی جس کی وجہ سے ہم کو بہت کچھ نقصان اٹھانا پڑا ہے اور بد قسمتی سے اس خاموش پالیسی نے ہمارے بہت سے حقوق غصب کروادئے ہیں

(بحوالہ" تذکرہ وقار" ص ۲۴۶۔۲۴۷)

سرسید کی غلط رائے اور ضد سے کالج کا نقصان:

(بصورت مکتوب) میں جب تک علی گڑھ رہا، کالج کے معاملات سے درحقیقت غفلت نہیں کی مگر کیا کیجئے کہ کوئی بات نہ چلی اور کسی بات کو (سر) سید صاحب نے نہ مانا۔ دو تین مرتبہ تو ایسا اتفاق ہوا کہ مجھے بھی سخت رنج ہوا اور سید صاحب کو نہایت غصہ آیا اور میں نے ٹرسٹی ہونے سے استعفا دینے کا ارادہ ظاہر کر دیا، مگر سید صاحب کی ذاتی حالت نے مجھے پھر اس ارادہ سے باز رکھا۔ ان پر آج کل ایسے صدمہ ہیں اور ان کی طبیعت بلحاظ صحت کے ایسی خراب ہے کہ میں نے اس پر رنج دینا مناسب نہ جانا۔ ان کی حالت نہایت رحم کے قابل ہے اور جہاں تک ہو، ان کو رنج دینے سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔ اگر ان کی یہ خاص حالت نہ ہوتی تو آپ یقین کیجئے کہ میں ایک روز کے واسطے بھی ٹرسٹی رہنا گوارا نہ کرتا۔ ان کی رائے اس درجہ میری رائے سے مخالف ہے کہ گویا دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور میری رائے میں جو کچھ نقصان کالج کا ہو رہا ہے، وہ ان کی رائے کی غلطی اور ضد کا نتیجہ ہے۔

(مکاتیب نواب محسن الملک و نواب وقار الملک: ص ۳۰)

کالج انگریزوں کے ہاتھ میں جانے کا خدشہ:

ٹرسٹی اول تو حقیقت میں کچھ کرتے نہیں، اور اگر تھوڑا بہت کرتے ہیں تو وہ عارضی طور پر، اس لئے سید صاحب تمام ٹرسٹیوں کی طرف سے ناامید ہو گئے ہیں اور وہ سوائے اس کے کچھ چارہ نہیں دیکھتے کہ تمام انتظام کالج کا انگریزوں کے سپرد کر دیا جائے۔ اور چنانچہ وہ ایسا ہی کرتے

بیٹھے ہیں ٹرسٹی جب خود کچھ کرتے نہیں، اور جو کرنے والے ہیں وہ علی گڑھ میں رہتے نہیں، تو پھر انگریزی سٹاف کے ہاتھ میں کام نہ دیا جائے تو کیا ہو اور کام کیونکر چلے؟ یہ تو ظاہر ہے کہ سید صاحب سے اب خود کچھ ہوسکتا نہیں، سید محمود سے توقع نہیں۔ ہم اپنے افکار میں مبتلا اور علی گڑھ سے غیر حاضر، پھر کیا جائے تو کیا کیا جائے؟ سید صاحب کو جس قدر کالج کا خیال ہے وہ کسی دوسرے کو نہیں ہوسکتا اور ان کی نیت جیسی کچھ کالج کی بھلائی اور ترقی کی طرف ہے، اس سے انکار نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے اپنے نزدیک کالج کی بہبودی اسی میں خیال کی ہے کہ کُل کام انگریزی سٹاف کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے کالج کا انگریزی سٹاف نہایت عمدہ اور لائق اور مسلمانوں کا خیر خواہ ہے اور اپنے فرائض کا دل سے ادا کرنے والا مگر غیر قوم اور غیر مذہب کے آدمی سے، گو وہ کتنا ہی خیر خواہ کیوں نہ ہو اور نیک نیت بھی ہو، کوئی امید نہیں ہوسکتی جو اپنے ہم مذہب اور ہم قوم سے ہوسکتی ہے۔ (ایضاً: ص۳۱)

کالج کے بیج سے گورنمنٹ انگریزی کی برکتوں کے پھل تک:

افسوس ہے کہ جس طرح پر وہ (سرسید) اس کالج کو قائم کرنا چاہتے تھے وہ خیال ان کا پورا نہ ہوا۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک ایسا کالج تیار ہو جو مسلمانوں میں یورپین سائنس اور لٹریچر کو رواج دے اور ایک ایسا فرقہ پیدا کرے جو از روئے مذہب کے مسلمان اور از روئے خون اور رنگ کے ہندوستانی ہوں مگر باعتبار مذاق اور رائے اور فہم کے انگریز ہوں۔

(مجموعہ لکچرز و اسپیچز محسن الملک: ص۳۱۶)

اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ جو کچھ سامان تربیت کا یہاں مہیا کیا گیا ہے اور جس طریقہ سے یہاں بورڈر رکھے جاتے ہیں، آج ہندوستان میں بے مثل ہے۔ ہر ایک بورڈر، جو مدرستہ العلوم کی چار دیواری میں قدم رکھتا ہے، اپنے تئیں نئی آب وہوا اور ایک نئی زندگی میں پاتا ہے اور اپنے گرد و پیش کی تمام چیزوں میں زندہ دلی اور شگفتگی اور حرکت اور جوش دیکھتا ہے۔ اُس کے کانوں میں ہر طرف سے محبت، ہمدردی اور گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی کی آوازیں آتی ہیں اور وہ اپنے تمام جائز جذبات اور امنگوں کے لئے چاروں طرف آزادی کی راہیں کھلی پاتا ہے۔ (ایضاً: ص۴۶۶)

کوئی بیج زمین پر جب ڈالا جائے، اگر اس کو پانی دیتے رہو تو بڑھتے بڑھتے ایک

تناور درخت ہوگیا ہے اور ہزاروں ذی روح اس میں پرورش پاتے ہیں۔ بعینہٖ یہی مثال ہماری یونیورسٹی کی ہے کہ اس کا تخم تو بویا سرسید نے۔ اب جب کہ یہ پھلے پھولے گا اور اس میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو تہذیب، شائستگی، علمی قابلیت اور گورنمنٹ کی وفادار رعایا ہونے کی حیثیت سے اپنی مثال آپ ہوں گے تو اس وقت گورنمنٹ انگریزی کی برکتوں اور آزادی کی بشارت دیتے پھریں گے۔ (ایضاً ص۴۸۶)

ڈپٹی نذیر احمد

تفسیر سرسید بمقابلہ شروح دیوان حافظ:

سید احمد خاں صاحب کی شان اتنی ارفع و اعلیٰ ہے کہ ماوشما کو ان کی نسبت کسی رائے کا اظہار کرنا داخلِ شوخ چشمی ہے ..... میں نے مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں بورڈنگ ہاؤس بنوایا، دو کنوئیں ہیں دونوں میں چندہ دیا، اپنے سارے خاندان کے نام کی جالیاں احاطۂ مدرسہ میں نصب کرائیں یعنی مدرسۃ العلوم کو مسلمانوں کے لئے مفید اور اس کی تائید کو داخلِ مثوبات سمجھا۔ اس وقت تک سید احمد خاں صاحب کے اخبار یا لکچر یا مواعظ یا تحریرات کا ایک پرچہ کبھی مول نہیں لیا یعنی مجھ کو ان کے معتقدات باسرہا تسلیم نہیں۔ سید احمد خاں کی تفسیر ایک دوست کے پاس دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میرے نزدیک وہ تفسیر ''دیوان حافظ'' کی ان شروح سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جن کے مصنفین نے جوتڑوں سے کان گانٹھ کر سارے دیوان کو کتاب تصوف بنانا چاہا۔ جو معانی سید احمد خاں صاحب نے منطوقِ آیاتِ قرآنی سے اپنے پندار میں استنباط کئے (اور میرے نزدیک زبردستی مڑھے اور چپکائے)، قرآن کے منزل من اللہ ہونے سے انکار کرنا سہل ہے اور ان معانی کو ماننا مشکل ..... یہ وہ معانی ہیں جن کی طرف نہ خدا کا ذہن منتقل ہوا، نہ جبریل حاملِ وحی کا، نہ رسولِ خدا کا، نہ قرآن کے کاتب و مدون کا، نہ اصحاب کا، نہ تابعین کا، نہ تبع تابعین کا، نہ جمہور مسلمین کا۔

(موعظہ حسنہ ص۱۷۵)

جنات، شیطان، جنت و دوزخ کی تاویل:

ملائکہ سے جو انکار کیا جاتا ہے تو صرف اتنی بات پر کہ دکھائی نہیں دیتے .... تاویل یہ کرتے ہیں کہ ملائکہ سے اللہ کے نیک بندے یا انسان کی وہ روحانی قوتیں جو نیک کام کرنے کی داعی ہوتی ہیں، مراد ہیں۔ لیکن ہم فرشتوں کو اسی طرح کی مخلوق مانیں جیسا کہ عام مسلمان مانتے ہیں تو میں نہیں سمجھتا کہ اس سے کیا قباحت لازم آجائے گی! کوئی بدعقل، جو خدا ہی کا قائل نہیں، اس قسم کے اعتراضات اور اشتباہات کرے تو ایک بات بھی ہے، بڑا تعجب اور افسوس تو اس وقت ہوتا ہے جب کوئی آدمی خدا کو مان کر کہتا ہے کہ فرشتوں اور جنوں اور شیطان کا ہونا میری سمجھ میں نہیں آتا اور اسی لئے مجھے ان کا ہونا تسلیم نہیں، یا میں کسی معجزے کے وقوع کو باور نہیں کرتا، یا میں کسی دعا کا معتقد نہیں کہ وہ حصول مدعا کا سبب ہوسکتی ہے یا یہ کہ گناہ نزول عذاب کا سبب ہوا ہے یا ہوسکتا ہے، یا جنت اور دوزخ اور قیامت کی وہی حقیقت ہے جو مذہبی کتابوں میں بیان کی جاتی ہے، یا آفرینش کا سلسلہ اسی طرح پر شروع ہوا ہے جیسا آسمانی کتابوں میں لکھا ہے، اگر ان میں سے کوئی بات اس کی سمجھ سے باہر ہے اور اسی وجہ سے اس کو انکار ہے تو ہم نہیں سمجھتے کہ خدا کو اس نے کیوں کر سمجھ لیا؟ اور خدا کو سمجھ لیا تو پھر اس کو کسی چیز، کسی بات پر تعجب اور انکار کا کیا حق باقی رہا؟

(حیات النذیر ص ۵۳۷-۵۳۸)

نیچری کہتے ہیں کہ لوگوں کے سمجھانے کو تمثیل کے طور پر جنت کے مزے اور دوزخ کی تکلیفیں بیان کردی ہیں۔ رنج و راحت آخرت میں بھی ہے مگر ہم اس کی کیفیت کے سمجھنے کے لائق نہیں۔ ناک اُسی جگہ ہے، سامنے سے بتاؤ تو، اور گدی کے پیچھے ہاتھ لے جا کر بتاؤ تو! ہم تو چھوٹتے ہی جواب دیتے ہیں کہ دوزخ ہو یا جنت، یہ وہ چیزیں ہیں جن سے مرے پیچھے واسطہ پڑے گا۔ وحی کے سوائے ہم کو کوئی ذریعہ ان کی حقیقت دریافت کرنے کا نہیں اور جو کچھ وحی میں ہے، ہم اس سے نہ ایک حرف کم کہہ سکتے ہیں اور نہ ایک حرف زیادہ، اور نہ تاویل کرتے ہیں بلکہ سکوت۔ اور زیادہ تفتیش کرنے کو اپنے حق میں بالکل غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ (ایضاً ص ۵۳۹)

دیگر ہم عصر ناقدین

سید امداد العلی

''تغیر ظنون وافکار'' کے مرض کا شکار:

جناب سی آئی ای سید احمد خاں صاحب بہادر نے مخالفین تجویز مدرسۃ العلوم کو سات قسطوں پر بیان کیا ہے۔ کسی کو خبیث النفس اور بد باطن، کسی کو خود غرض، کسی کو اپنا یار بنا کے حاسد اور ترقی پر خفا ہونے والا قرار دیا ہے اور کسی کو متعصب وہابی، یہود ہٰذہ الامتہ ٹھہرایا اور کسی کو خود غرض اور خود پرست فرمایا اور کسی کو ٹٹ پنجیا اخبار نویس لکھا اور کسی کو بدتمیز اور کسی کو نادان مسلمان بیان کیا۔ سو مخالفین اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ہم کو اس کی کچھ شکایت جناب سید احمد خاں بہادر سی آئی ای سے نہیں ہے کہ شاید وہ معذور ہوں۔

کچھ عجیب نہیں کہ ان کو ... ایک مرض پیدا ہو گیا ہو کہ جس کی صفت تغیر ظنون وافکار ہے ... صاحب اس مرض کا ہمیشہ بدگمان رہتا ہے۔ اپنے ناصحوں کو حاسد اور دشمن سمجھتا ہے ... بے چارے سید احمد خاں کس گنتی شمار میں ہیں، یہ مرض بڑے بڑے فلاسفہ، امصار فلاطون اور فارابی کو لاحق ہو گیا تھا ... مالیخولیا والا خیال کرتا ہے کہ سارے کمالات عالم کو جو حاصل ہیں وہ اثر ہے میرے خیالات کی موافقت کا اور جتنے عیوب ونقائص دنیا میں موجود ہیں

وہ نتیجہ ہیں میرے معاملات کی مخالفت کا بہت سے انسان ایسے ہیں کہ اپنی قوم کی بھلائی کے لئے کوشش کرتے ہیں اور صرف قومی فائدے کے لئے محنتیں شاقہ اٹھاتے ہیں اور یہ کوششیں اور محنتیں ان کی اکثر موجب رسوخ اور تقرب کے بہ حضور حکام اور باعث نام آوری کے درمیان خواص وعوام ہو جاتی ہیں۔ لیکن ان کی کوششوں اور محنتوں کو کوئی ان کی ذاتی غرض پر محمول نہیں کرتا ہے اور نہیں کہتا ہے کہ یہ جو کام کرتے ہیں نام آوری اور شہرت کے لئے، حکام وقت کے سامنے رسوخ پیدا کرنے اور ان کو دھوکا اور فریب دینے کو کرتے ہیں۔ پس وجہ مخصوص ہونے سید احمد خاں صاحب کے ساتھ ان ظنون کے اصحاب اور ان ظنون کی خباثت نفسی اور بد باطنی کو میں خیال نہیں کر سکتا ہوں جو لوگ مدرسۃ العلوم کے مخالف ہیں ان میں بعض وجاہت دنیا میں جناب سید احمد خاں صاحب سے بہ مراتب فائق ہیں۔

(امداد الآفاق بحوالہ سرسید احمد خاں، ایک سیاسی مطالعہ ص ۱۳۸۔۱۳۹)

جاہل صدر الصدور اور لامذہب:

سید احمد خاں، بلکہ اکثر ممبر کمیٹی تجویز مدرسۃ العلوم کے، نہ علوم قدیمہ سے واقف ہیں نہ علوم جدیدہ کے ماہر، نہ انہوں نے کسی مدرسے میں پڑھا ہے اور نہ کسی اہل علم کے سامنے کسی علم کی کتاب کو رکھا، مفید یا غیر مفید ہونا کسی علم یا کسی کتاب کا ان کو کیوں کر معلوم ہو سکتا ہے؟ طریقہ تعلیم کا حسن و قبح ان کو کس طرح دریافت ہو سکتا ہے؟ طریقہ تعلیم میں تغیر و تبدل کرنا اہل علم کا منصب ہے نہ کہ کسی جاہل صدر الصدور اور لامذہب کا

نئے دار العلوم خیالی کے واسطے جس فقہ اور اصول حدیث اور تفسیر اور منطق اور طبعیات اور فلسفہ تعلیم کے لئے تجویز ہوا ہے جو سید احمد خان صاحب کی رائے کے موافق مدون ہوں گے اور جن کا نیا تصنیف ہونا سید احمد خاں صاحب چاہتے ہیں، تو عام مسلمان سید احمد خاں صاحب کو ایک شخص ناخواندہ و ناکارآزمودہ حقائق علوم اور دقائق فنون سے جانتے ہیں، جس کو کسی علم میں کسی مسئلے کے صحیح طور پر سمجھنے کی بھی کچھ قدرت نہیں اور امور دینی میں ان کی رائے ملحدانہ ہے اور غیر امور دینی میں ان کی تقریر اور تحریر جاہلانہ

"اے ممبران کمیٹی تجویز مدرسۃ العلوم کے! صفائی اور سچائی اور ایمان داری سے کہو کہ

مدرسۃ العلوم کا تجویز کرنا آیا قوم کی بھلائی اور بہتری اور علم کی روشنی پھیلانے اور روشن ضمیر بنانے اور اعلیٰ درجے کی لیاقت اور تہذیب اور شائستگی بخشنے کے لئے ہے یا واسطے نام آوری اور فخر اور خواہش ہم سری گورنمنٹ اور قضائے ہوائے نفس اور مسلمانوں کو سیدھی راہ بھلانے اور قوم کو جہالت میں ڈالنے اور دنیوی اور اخروی منافع سے محروم رکھنے کے لئے ہے؟ (ایضاً ص۱۳۹ تا ۱۴۱)

خود ہمدردی کے امتحان میں ناکام، دوسروں پر طعن:

ہمدردی کا لفظ زبان سے کہنا اور منہ سے بک ڈالنا، ایسے وقت میں کہ جو وقت امتحان کا نہیں، جناب سید احمد خاں صاحب بہادر کو آسان ہے۔ ہمدردی کے امتحان کا وقت گزر گیا۔ وہ وقت غدر کا تھا۔ کسی کی ہمدردی یہ ہے کہ کہ بجنور سے اٹھے، راجہ پرتاپ سنگھ کے پاس رہے، وہاں سے بچھراؤں ضلع مرادآباد میں آرام فرمایا، دہلی وطن تھا جو باغیوں اور مفسدوں کا گھر تھا، جب دیکھا کہ دہلی کو شکست ہوگئی، میرٹھ میں شریف فرما ہوگئے؟ دعویٰ بڑی ہمدردی کا ہے اور افسوس کہ کسی مقام پر کسی باغی کے مقابلے میں بھاگنے کے وقت بھی کوئی لاٹھی اپنی پشت مبارک پر نہ کھائی، زخم تلوار یا بندوق تو دیگر چیز ہے۔

(امداد الآفاق......ص۶، بحوالہ ''سرسید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک کے ناقدین'' ص۳۴۹)

جس خیرخواہ سرکار کی نسبت یہ سی۔ ایس۔ آئی سید احمد خاں یہ ظن رکھتا ہے کہ وہ ہمدردی کو کفر خیال کرتا ہے، اس تحریر کا محاکمہ میں حکام وقت اور جملہ مسلمانان واہلِ ہنود پر چھوڑتا ہوں کہ آیا جو شخص سینہ سپر ہوکر، بنظرِ نمک حلالی اپنے آقا کے، سینہ پر گولی باغیوں کی کھائے اور ہزار ہا روپیہ کا مال ان سے چھڑائے اور وہ گولی چھ مہینے بعد ڈاکٹر رے صاحب بہادر نکالیں کہ جس کا خون مسٹر لو صاحب، داماد جناب لفٹنٹ گورنر صاحب بہادر، اور جینٹ صاحب کلکٹر و مجسٹریٹ متھرا پونچھتے جائیں اور اس گولی کا نشانِ تصدیق، ایک تمغہ ہمدردی اور نمک حلالی ملکہ معظمہ کا، جس بہادر کے سینہ پر موجود ہو تو انصاف فرمایا جائے کہ کیا وہ شخص ہمدردی کو کفر سمجھنے والا ہوسکتا ہے یا کہ جو اُس کو ایسا کہے اور طعن دے؟ بے شک ایسا ہی شخص

تمام دنیا کا جھوٹا، مفسد، حاسد اور خبیث النفس ہے۔

(مضحکات و مطائبات سرسید [۱] ص ۹۰)

(مولوی سید امداد العلی ڈپٹی کلکٹر کانپور ــــ نے غدر میں سرکار کی بڑی خیر خواہی کی تھی اور اس میں سینے پر گولی کھا کر زخمی ہوئے تھے۔) (ایضاً)

عبدالحق حقانی

تفسیر نہیں، تحریف قرآن:

سترھویں صدی میں فرانس اور جرمنی میں سینکڑوں ایسے لوگ صاحب تصنیف ظاہر ہوئے کہ جو صرف خدا کے قائل تھے، باقی انبیا اور ان کے معجزات اور امور آخرت اور جن و ملائکہ بلکہ وجود آسمان سب کو قصہ کہانی جانتے تھے اور پھر تو انگلستان میں بھی اس کا چرچا پھیلا اور پھر تو امریکہ، سپانیہ وغیرہ جمیع بلاد یورپ میں بھی یہ بلا پھیل گئی۔ اور ان نام کے عیسائیوں کی یہ بلا ہندوستان میں بھی آئی اور کلکتہ میں رام موہن نامی بنگالی نے ۱۸۳۰ء میں انہی اصول پر بت پرستی سے ناراض ہو کر ایک جدید مذہب کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام برہمو سماج رکھا۔ پھر اس کے شاگردوں نے انگریزی خواں بنگالیوں میں اس کو بہت رواج دیا۔ اور ان کی تقلید سے ایک شخص دہلی کے رہنے والے سید احمد خاں نے بھی مذہب اسلام کو برائے نام رکھ کر ایک جدید مذہب کی انہی اصول ملحدانہ پر بنیاد ڈالی اور قرآن مجید کو تفسیر کے پیرائے میں اپنے خیالات ملحدانہ کے تابع بنایا۔

(تفسیر حقانی جلد دوم ص ۱۲۷)

آنریبل سید احمد خاں بہادر دہلوی کی تصنیف ہنوز ناتمام ہے۔ اس شخص نے ترجمہ شاہ عبدالقادر کو ذرا بدل کر ترجمہ لکھا ہے اور باقی اپنے ان خیالات باطلہ کو کہ جو ملحدین یورپ سے حاصل کیے ہیں اور جن کے اتباع کو ان کے نزدیک ترقی قومی اور فلاح اسلام سے وابستہ کیا ہے اور بے مناسبت آیات و احادیث و اقوال علما کو اپنی تائید میں لا کر اہل اسلام کو تحریف کیا ہے۔ در اصل یہ کتاب تحریف قرآن ہے نہ تفسیر۔ (ایضاً مقدمہ ص ۱۵۲)

سید صاحب نے اسلام جدید کو وسیع کیا اپنے خیالات کی ترقی کے لئے ایک مدرسہ علی گڑھ میں قائم کیا اور ایک اخبار تہذیب الاخلاق جاری کیا اور اس پر بس نہ کر کے قرآن مجید کی تفسیر اور قرآن مجید کو اپنے اسلام جدید کے مطابق بنانا چاہا۔ اس زمانے کے امرا تو نام پر مرتے ہیں، جہاں ان کو سبز باغ دکھلایا (کہ اس مدرسہ سے اہل اسلام کو دینی و دنیوی ترقی ہوگی) جھٹ معین و مددگار ہوگئے اور گورنمنٹ برٹش میں ان کی معیت کو عمدہ ذریعہ تقرب سمجھا۔ اور بعض وہ لوگ بھی کہ جن کو انگریزی خیالات نے بے قید کر دیا اور وہ برائے نام مسلمان ہونا کافی سمجھتے ہیں، اس مذہب کے معین و مددگار بن گئے اور بعض تو صرف کوٹ پتلون پہن کر جنٹلمین کہلانے کے لئے سید صاحب کے دین میں آئے شاید حکمائے یورپ، دہریان فرنگ کے ملمع کار خیالات نے پریشان کیا ہو تو کیا عجب مگر سید صاحب نہ علوم قدیم سے واقف، نہ نئے علوم اور جدید فلسفہ سے بہرہ رکھتے ہیں، اپنی علمی کمزوری سے فلسفہ جدید سے اسلام کا شکست کھانا تسلیم کر بیٹھے اور اصول اسلام کی تاویلیں کرنے لگے حالانکہ اسلامی اصول پر فلسفہ جدید کا کوئی قوی اعتراض ہی نہیں پڑتا۔ (ایضاً، جلد دوم: ص ۱۱۴)

سید علی

نیچری کمال سے نیچری نبی ہونے کا امکان:

سرسید احمد خاں صاحب ..... وحی و الہام اور فرشتہ اور نبوّت کو فقط انسان کی فطری قوت کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ چونکہ ان کی یہ رائے عقل و نقل دونوں کے خلاف ہے، اس لئے بروجہ اجمال ان سے تعرض کرنا مناسب ہے تاکہ ناظرین کے لئے حق و باطل میں تفرقہ کرنے کا موقع ملے اور اپنے صحیح عقیدوں کو زیغ و ضلالت سے محفوظ رکھیں یہ امر بہت واضح ہے کہ سرسید احمد صاحب کی بہ نسبت اگلے مفسرین کا قول بہر حال قابلِ اعتماد زائد ہوگا، اس لئے کہ وہ لوگ اہلِ فن ہیں اور سید صاحب اس سے بالکل اجنبی ہیں..... سرسید صاحب کا یہ کہنا کہ وحی یا الہام کو ہم کامل یا بے نقص نہیں کہتے ہیں، ان کی تفسیر کی رو سے بالکل درست ہے اس لئے کہ ان کا الہام محض ایک فطری چیز ہے جو خود انسان کی طبیعت سے پیدا ہوتا ہے جس کا ناقص

ہونا نہایت واضح ہے۔ پس ناقص سے جو چیز پیدا ہوگی وہ کامل کیونکر ہوسکتی ہے! پس اگر نیچری کمال کا نام الہام رکھ دیا جائے تو لازم آئے گا کہ ہر ایک شخص نبی ہو۔ اگر نیچری کمال سے آدمی نبی ہو جاتا ہے تو لازم آئے گا کہ خود سر سید احمد صاحب کا نبی ہونا بھی تسلیم کرلیا جائے اس لئے کہ نیچر نے ان کا دماغ بھی ایک خاص وضع کا بنایا تھا جس کی نظیر کم تر مل سکتی ہے۔ پس ممکن ہے کہ ہم بھی ان کو نیچری نبی کہیں۔

(البلوغ ص ۶۸ تا ۷۶)

علی بخش خاں

علوم جدیدہ کی تحصیل ضرور، مذہبی دست اندازی نامنظور:

میں اس قدر امر میں سید احمد خاں صاحب سے مخالف نہیں ہوں کہ ہماری قوم کو علوم جدیدہ کی تحصیل ضرور ہے اور تعلیم موجودہ غیر کافی ہے۔ صدری، میبذی، شرح چغمینی وغیرہ کتب معقولات سے اب کام نہیں چلتا ہے، للہذا اگر کوئی مدرسہ ایسا قائم ہو کہ اس میں علوم جدید انگریزی سے ترجمہ ہو کر پڑھائے جائیں تو ہمدردی قومی کا پورا نتیجہ نکلے گا مگر پھر بھی تحصیل فقہ و حدیث و تفسیر میں ہرگز خلل نہ آنے پائے ...... مجھ کو اس وقت بلکہ مدت سے سخت افسوس ہے کہ ہماری قوم میں سید احمد خاں ایک شخص لائق اور نامور اور معزز اور ذی عقل پیدا ہوئے اور ترقی قومی پر آمادہ ہونا اُن کا ارادہ ظاہر کیا گیا مگر اپنی خودرائی سے مذہبی دست اندازی وانقلاب دین ایسا اُن کی طبیعت میں جم گیا کہ اصلی غرض فوت ہوگئی اور تمام قوم کو اُن سے نفرت پیدا ہوگئی ہے۔ مجھ کو بھی جس قدر مخالفت ہے اُن کے خیالات مذہبی سے ہے، نہ اُن کی ذات خاص یا تعلیم علوم جدیدہ سے۔

(سلیکٹڈ ڈاکومنٹس فرام دی علی گڑھ آرکائیوز: ص ۲۱۲۔۲۱۴)

میں صرف اس وجہ سے اب تک مدرسۃ العلوم میں شریک نہیں ہوا کہ مجھ کو اس کے طالب علموں کی مذہبی تعلیم کی طرف سے کبھی اطمینان نہیں ہوا اور ہمیشہ اس بات کا خوف رہا کہ جس قسم کے عقائد سید احمد خاں صاحب کے ہیں، ویسے عقائد کی تعلیم اس مدرسہ کے

طالب علموں کو بھی ہوئی۔

(تہذیب الاخلاق، جلد چہارم، ص ۶۷)

ہر ہر مقام پر ٹھوکر کی کیفیت:

مشرقی علوم جو قرآن و حدیث و تفسیر و اصول و فقہ و کلام و عقائد اہل اسلام ہیں، ان سے آپ کو نفرت ہو تو ہو مگر ساری خدائی کے مسلمان تو اس کو کمال دین سمجھتے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ اس کا اثر دل سے جاتا رہے۔ اسی کے حاصل نہ کرنے کی وجہ سے آپ اس خرابی میں پڑے ہیں کہ نہ تو موافق اہل اسلام کے کسی مسئلہ کی تحقیق بن پڑی تھی، نہ علوم جدیدہ کی تحصیل کی ہے جو حکیمانہ و فلسفیانہ کوئی بات عمدہ نکلی۔ اپنا جی تو چاروں طرف آپ دوڑاتے ہیں، قرآن و حدیث کو بھی فلسفیت موہومی سے ملاتے ہیں مگر ہر مقام پر ٹھوکر کھاتے ہیں۔ کسی ایک قوم کے علوم میں بھی پوری استعداد ہوتی تو کچھ کر دکھاتے۔ بعض معتزلہ کی بھی تقلید کچھ کچھ باتوں میں اختیار کی، باطنیہ کی طرف بھی رجوع کیا، شیعہ امامیہ کی بھی مدد لی مگر اب تک کوئی طریقہ ٹھیک نہ ہوا۔

(شہاب ثاقب: ص ۹۱)

وہم و خیال کی ایجاد، تفسیرِ جدید:

جناب لوتھر ثانی نیچرلسٹ لاثانی نے ...... تفسیرِ جدید قرآن شریف ...... وہم و خیال سے ایجاد کی جس کی سند نہ کسی حدیث سے ملتی ہے، نہ جمہور امت مرحومہ کے موافق ہے، نہ علم وحکمت سے مطابق ہے، نہ محاورہ اہل انسان و کتب لغت سے نشان ملتا ہے۔ (ایضاً: ص ۱۲)

جو تفسیر کہ اب حضور والا نے ایجاد کی ہے رسولؐ، بعدہ صحابہ و تابعین، بعدہ ائمہ، مفسرین، محدثین ...... کسی ایک نے بھی آپ کے موافق تفسیر آیات قرآنی کی نہ بنائی، نہ کچھ ایسا دقیق مضمون تھا کہ حضور والا کے سوا، بارہ سو برس تک کسی کو نہ سوجھا، سب کے سب غلط تفسیر کرتے رہے اور رسولؐ چیستان اور معمے ہی بولتے رہے ...... رسولؐ جو نہایت عمدہ حقائق و معارف بتاتے تھے، کیا سخت مشکل میں پڑ جاتے! افسوس ہے کہ موسیٰ کے زمانہ سے آج تک آپ ہی ایک حکیم اور فلسفی ایسے پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے صحیح معنے کلام الٰہی کے سمجھ پائے ہیں

تو خدا جانے پھر قرآن شریف کیونکر معجزہ رہے گا! شاید قرآن آپ کے نزدیک کسی معما کا نام ہے جو ہزاروں برس بعد کسی کو الہام کے ذریعے حل ہو جاتا ہے۔ (ایضاً ص ۶۸۔۶۹)

نیچری خیالات کے ذریعے دہریت والحاد کی دعوت:

اگرچہ آپ صاف صاف نہیں فرماتے ہیں اور ابھی مسلمانوں کو نہیں بھڑ کاتے ہیں اور حتی المقدور تاویلات رکیک کر کے قرآن کو نیچر سے ملاتے ہیں اور اقوال اکابر دین سے نفرت دلاتے ہیں تاکہ نیچر کی طرف آہستہ آہستہ لوگ رجوع لائیں، در پردہ تو آپ سب کچھ کر رہے ہیں۔ اپنے دوست سید مہدی کو نیچر کی طرف کھینچ بلاتے ہیں اور نبی اُمی پر نیچر کی پابندی جماتے ہیں۔ تھوڑا عرصہ نہ گزرے گا کہ جو لوگ آزادی طبع کی حرص و ہوس میں گرفتار ہیں، قید نماز و روزہ اور پابندی احکام شرعیہ منقولی میں عقلیات کو دخل دینا پسند کرتے ہیں، علوم مشرقیہ سے بیزار ہو کر پکے منکر شریعت بن جائیں گے۔ خصوصاً جس وقت کتب دین وایمان کی جگہ نیچریوں کے اقوال پر عقیدہ جمانے کی ٹھہرے گی تو کوئی دہریہ، کوئی ملحد ہوگا۔ کیا عجب ہے کہ ہمارا دین اسلام ہی سلام کر کے رخصت ہو، معاذ اللہ...... ہر ایک حکیم نیچرلسٹ نبوت کا مصداق ہو جائے گا۔ خدا نہ کرے کہ مولوی مہدی علی صاحب نیچر کے سرچشمہ کا پانی پئیں ...... ہم تو یہ دعا کرتے ہیں کہ خدا ایسا مقلب القلوب ہے کہ آپ کو بھی خیالات نیچریہ سے بچائے اور اجماع امت کی طرف لائے۔ آمین یا ارحم الراحمین! (ایضاً ص ۹۳۔۹۴)

محمد احتشام

قرآن کی آیتوں کا اُلٹ پھیر

سید احمد خاں کی عادت ہے کہ قرآن کی آیتوں کو اُلٹ پھیر کر کے مطلب کے موافق بنا لیتے ہیں اور جب کوئی تاویل نہیں بنتی تو اپنی طرف سے الفاظ بلکہ بعض جگہ جملے محذوف مان لیتے ہیں اور جب بے وجہ محذوف ماننے کا اختیار ہو گیا تو پھر کوئی مشکل نہ رہی، جس کلام کے جو چاہو معنی بنا لو۔

(تفسیر اکسیر اعظم، جلد ثانی: ص ۸۱ بحوالہ ''سرسید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک کے ناقدین'': ص ۲۶۱)

شاہ محمد اشرف علی تھانوی

مدرسہ علی گڑھ کے بدعقیدہ تعلیم یافتگان:

(بنام سرسید) اگر فرض کرلیا جائے کہ ترقی قومی انگریزی تعلیم میں ہی منحصر ہے، سو سرکاری مدارس کیا کچھ کم تھے جو جناب کے مدرسہ کی حاجت ہوئی؟ اگر یہ وجہ بتلائی جائے کہ اُن مدارس میں مذہبی خیالات خراب ہو جاتے ہیں اس لئے ایسے مدرسہ کی ضرورت ہوئی جہاں مذہبی تعلیم بھی ہو۔ مکرما! سچ کہتا ہوں اور آپ بھی دل میں جانتے ہوں گے کہ سرکاری مدارس کے تعلیم یافتہ ایسے بدعقیدہ نہیں جیسے اس مدرسہ کے اکثر تعلیم یافتہ ہیں۔ اگر نماز و وعظ کے انتظام کو آپ عذر پیش کریں تو یہ خوب جان لیں کہ جب تک آپ کے خیالات نہ بدلیں گے، آپ کے متبعین کی وہی کیفیت رہے گی۔

(اصلاح الخیال ص ۶۶ ـ ۶۷)

مدرسہ میں غریبوں کا استحقاق ندارد!

...... یہ بھی فرض کرلیا جائے کہ اس مدرسہ کی ضرورت ہی ہے اور اسی مدرسہ سے ترقی دین و دنیا کی ہو سکتی ہے تو اس صورت میں انصاف سے دیکھئے، ترقی کے مستحق زیادہ کون لوگ ہیں؟ امرا یا غربا؟ امرا کو تو پہلے سے ترقی حاصل ہے۔ آپ کی مطلوب ترقی نہ سہی، مگر کسی قسم کی تو ہے کہ جو اُن کے لئے کافی ہے۔ ان کے لئے زیادہ اہتمام کرنا تحصیل حاصل کے قبیل سے ہے۔ البتہ غربا اس کے زیادہ مستحق تھے۔ غریب بچوں کو مدرسہ میں داخل کیا جاتا، ان کے مصارف کی کفالت کی جاتی، اُن کو تعلیم و تربیت کر کے معزز عہدوں پر ممتاز کراتے، اُن کے دل سے دعا نکلتی۔ خیر، اگر قبول دعا کوئی چیز نہیں تو اُن کے دلوں کو راحت تو پہنچتی۔ یہ تو آپ کے نزدیک بھی محمود چیز ہے۔ اب تو تحقیق ہوا ہے کہ غریب کا گزر وہاں مشکل ہے۔ پھر ہمدردی قومی و خیر خواہی کہاں رہی؟...... بہر حال جو کارروائی مسلمانوں کی ترقی کے لئے اس وقت ہو رہی ہے، وہ سراسر خرابی در خرابی سے بھری ہوئی ہے۔ پس نہ خیر خواہی اسلام کے اصول صحیح

ہیں، نہ خیر خواہی مسمانان کے ذرائع راست ہیں۔ (ایضاً ص ۶۷۔۶۹)

وجہ نفرت --- دین میں رخنہ اندازی:

سرسید کی نیت تو بری نہ تھی، مسلمانوں کا ہمدرد تھا مگر عقل دین کی کمی کی وجہ سے جوراہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لئے نکالی، وہ مضر ثابت ہوئی۔ وجہ یہ ہے کہ اصل مقصود دنیا کو سمجھا سرسید کا عقیدہ توحید و رسالت کے متعلق جس درجہ کا بھی تھا، بلا وسوسہ نہایت پختہ تھا۔ جیسا کہ ان کے بعض مضامین سے مجھ کو ظاہر ہوا اور قرآن و حدیث کی جو تو جیہات انہوں نے کیں، ان کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخالفین کا اسلام پر کوئی اعتراض وارد نہ ہو، گو اس کے لئے جو طرز انہوں نے اختیار کیا وہ غلط تھا، اسی لئے میں ان کو نادان دوست کہتا ہوں ...... بڑے حوصلے کا آدمی تھا مگر اس نے خواہ مخواہ دین میں ٹانگ اڑا کر اپنے آپ کو بدنام کیا ورنہ لوگ اس کو دنیا کا پیشوا ضرور بنا لیتے۔ بڑا محب قوم تھا، دین میں رخنہ اندازی کرنے کی وجہ سے بہت سے لوگ اس سے نفرت کرنے لگے، اس سے نقصان ہوا۔

(المعارف لاہور، مارچ ۱۹۶۹ء: ص ۵۵۔۵۶)

مرزا محمد بیگ دہلوی

نئے اسلام کی بنیاد:

سرسید اگرچہ ہم ہی مسلمانوں میں ایک پرانے معزز شخص ہیں مگر زمانے کی نیرنگیوں اور تیرھویں صدی کے اثر نے نئے نئے ریفارمر مصلح قوم پیدا کر دئے۔ پھر تو وہ تھے اور ان کے ہاتھ صاف کرنے کو ہندوستان میں پردیسی اور یتیم اسلام تھا۔ سرسید نے ترمیم تو کیا بلکہ پرانے اسلام کو جڑ سے گرا کر ایک نئے اسلام کی بنیاد ڈالی اور اس کے حدود کو وسیع کر دکھایا کیونکہ اسلام قدیم میں، جو مسلمانوں کو محمدؐ سے پہنچا ہے، انبیا تو کیا ایک نبی کو بھی نہ مانے، کتب آسمانی تو کیا ایک کتاب کا بھی انکار کرے، وہ قطعاً دائرہ اسلام سے خارج۔ قرآن مجید کی متعدد آیتیں اور بے شمار صحیح احادیث صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ ان باتوں میں ایک کا بھی منکر جہنمی ہے جو

خالداً مخلداً جہنم میں جلے گا۔ سرسید کے اسلام میں ہندو، عیسائی، دہریئے، بت پرست سب داخل ہیں اور جنت کے مستحق ہیں۔ پھر اسلام جدید کے بموجب سرسید نے تفسیر میں مغربی فلاسفروں کے خیالات بٹھلانے اور اصلی معانی کو دھکے دے کر باہر نکالنے میں جو کوشش کی وہ اسلام جدید کے پیروؤں کے نزدیک قابل مشکوری ہے۔اس کے بعد سرسید نے ایک اور بھاری کام کیا۔ وحی، جنت، دوزخ، ملائکہ بلکہ خدااور نبی کے لفظ کو تو ایمان لانے کے قابل قرار دیا مگر ان کے معانی بدل دئے...... اب میں نہیں سمجھتا کہ یہ نئے اسلام کا بانی اسلام قدیم کے پابندوں کی تعلیم کی کیسی اصلاح وترمیم کرے گا؟

(ردنیچر یہ مرتبہ مرزا محمد بیگ دہلوی بحوالہ توضیح الاحکام:ص۹۔۱۰)

سرسید کی تعلیم وتربیت کا قابل عبرت قدرتی نمونہ:

سرسید کی تعلیم وتربیت، جو مسلمانوں کے بچوں کے حق میں ابر رحمت کی طرح علی گڑھ کالج پر برستی ہے، میرے نزدیک مسلمانوں کی موجودہ حالت کے لئے کسی طرح مفید نہیں بلکہ سخت مضر وخطرناک ہے۔اس تعلیم کا نتیجہ جو سب سے اول سرسید کے دونوں صاحبزادوں کے حق میں ظاہر ہوا ہے، وہ ان کے قدرتی نمونہ اور زندہ دلوں کے لئے عبرت ہے۔سرسید نے اسلام قدیم کو گرا کر جو وسیع اسلام کے بنگلے میں صاحب زادوں کو بٹھایا،من جملہ اُور نعما کے ایک شراب خوری ہے کہ جس نے قرض دار ہی نہیں کردیا بلکہ سرکاری ملازمت کے قابل بھی نہیں رکھا، بلکہ زندگی سے مایوس کردیا۔ (ایضاً:ص۱۰)

محمد حسین بٹالوی

سرسید کی تکفیر سے احتراز کی دلیل سے دستبرداری:

آنریبل سید احمد خاں صاحب بہادر سی ایس آئی نے ایک اور گل کھلایا ہے۔اب لوگوں کو انبیا اور کتب آسمانی اور احکام مذہبی وایمانی کی قید سے بھی آزاد کردیا اور صاف صاف فرمادیا کہ جو شخص نہ کسی نبی کو مانتا ہے، نہ کسی الہامی کتاب کو جانتا ہے، نہ کسی حکم مذہبی (فرض

واجب) کو قبول کرتا ہے بلکہ صرف خدائے واحد پر یقین رکھتا ہے، وہ بلاشبہ مسلمان (محمدی وناجی (نجات پانے والا) ہے پھر آپ نے یہ غضب کیا ہے کہ جو لوگ وجود باری تعالیٰ سے منکر کہلاتے ہیں ان کو بھی اسلام ونجات کا سٹرفکیٹ دے دیا ہے اور ان کے وجود باری سے انکار کی یہ تاویل کی ہے کہ ان کو وجود باری سے انکار نہیں بلکہ اس وجود کی دلیل کے علم سے انکار ہے۔ اب اگر کوئی ہم سے سوال کرے کہ جناب ممدوح کے اس قول واعتقاد پر آپ کے اسلام کا کیا حال ہے اور ان کی نسبت اب بھی تمہارا وہی اعتقاد وخیال ہے (کہ سید احمد خاں کی بعض تحریروں پر حکم تکفیر سے احتراز کرنا چاہیے۔ ناقل) یا اب اس میں کچھ فرق آ گیا ہے؟ تو جواب اس کا یہ ہے کہ اب میرے اس خیال میں فرق آ گیا ہے اور جناب کے اس قول نے جس میں آپ نے ضروریات وقطعیات دین کا انکار کیا ہے اور کفر کو اسلام بنا دیا، مجھے آپ کی نسبت شک وتردد میں ڈال دیا ہے۔ اب میں آپ کے اسلام کا مدعی نہیں بن سکتا اور اس پر کوئی دلیل قائم نہیں کر سکتا اور لوگوں کو آپ کی تکفیر سے روک نہیں سکتا۔

(بحوالہ رحیق لاہور، فروری ۱۹۵۹ء: ص ۲۵)

محمد فاروق چریاکوٹی

علومِ عقلیہ سے بے بہرہ:

(سرسید) مغربی لامذہبوں کے خیالات پر جب واقف ہوا اور علومِ عقلیہ سے تو بے بہرہ ہی تھا، ان کا جواب نہ دے سکا بلکہ حدیثوں کی صحت سے انکار کرنے لگا اور قرآن کے منصوص اور صریحی مضامین کے مخالف عقیدے ظاہر کرنے میں اس کو تامّل نہ رہا۔

(بحوالہ ''سید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک کے ناقدین کا تحقیقی جائزہ'': ص ۳۸۸)

محمد قاسم نانوتوی

فسادِ عقائد سے رنجیدگی:

سید صاحب کی ہاں سے ہاں ملانا ہم سے جب ہی متصور ہے کہ سید صاحب اپنے

ان اقوال مشہورہ سے رجوع کریں جو ان کی نسبت ہر کوئی گاتا پھرتا ہے اور سید صاحب ان پر اصرار کئے جاتے ہیں اور رجوع نہیں فرماتے اس میں کچھ شک نہیں کہ سنی سنائی سید صاحب کی اولوالعزمی اور دردمندی اہل اسلام کا معتقد ہوں اور اس وجہ سے ان کی نسبت اظہار محبت کروں تو بجا ہے، مگر اتنا یا اس سے زیادہ ان کے فساد عقائد کو سن کر ان کا شاکی اور ان کی طرف سے رنجیدہ خاطر ہوں کوئی کچھ کہو وہ اپنی وہی کہے جائیں گے۔ اُن کے اندازِ تحریر سے یہ بات نمایاں ہے کہ وہ اپنے خیالات کو ایسا سمجھتے ہیں کہ کبھی غلط نہ کہیں گے۔

(تصفیۃ العقائد: ص ۸۔۹)

ترقی کا مینہ زینہ، مسلمانوں کے تنزل کا اصل سبب:

کام کرنے والوں کی دو تین قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک نیت اچھی مگر عقل اچھی نہیں، عقل اچھی ہے مگر نیت ٹھیک نہیں، تیسرے نہ عقل اچھی نہ نیت اچھی۔ سرسید کے متعلق ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ نیت اچھی نہیں ہے مگر یہ ضرور کہیں گے کہ عقل اچھی نہیں ہے کیونکہ جس زینے سے مسلمانوں کو معراج ترقی پر لے جانا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا سبب سمجھتے ہیں، یہی مسلمانوں کے تنزل کا سبب ہوگا۔

(مولانا اشرف علی تھانوی اور تحریک آزادی: ص ۱۵)

محمد کریم بخش

مضامین وحشت انگیز تہذیب الاخلاق:

(بنام سرسید)...... جب جناب نے اس مدرسۃ العلوم کا ذکر کر کے لوگوں کو اطلاع دی، اس وقت عموماً مسلمانوں کو ایک جوش اس کی مدد کا پیدا ہوا مگر تہذیب الاخلاق کے محض مضامین نے اس تدبیر میں بڑی رخنہ اندازی کی، مجھ کو چند لوگوں سے کام پڑا جو ابتدا میں نہایت شائق امداد مدرستہ العلوم کے تھے، اور قریب تھا کہ ایک سب کمیٹی مفید منعقد ہو جاتی کہ مضامین دحشت انگیز تہذیب الاخلاق چھپنے شروع ہوئے۔ اول اول اُن لوگوں سے لڑنا پڑا اور فہمائش میں سعی کی

گئی اور اوہام ان کے رفع کئے گئے لیکن مضامین کی تیزی نے ایسا اثر کیا کہ پھر زخموں کا اندمال دشوار ہو گیا ان مضامین نے ایسا بُرا اثر پیدا کیا ہے کہ اس کا اثر مدت دراز تک باقی رہے گا۔

(سلیکٹڈ : اکو منٹس فرام علی گڑھ آرکائیوز ص ۲۴۲-۲۴۳)

سید ناصر الدین ابوالمنصور

بہتوں کی گمراہی کا سبب تفسیر:

اصل مطلب اس تفسیر کا تمام تفاسیر و مفسرین اسلام کے بے اعتباری اور تمام معجزات انبیا علیہم السلام کی بے اصلی اور علت نمائی اسلام عین مطابقت نیچر اور دنیا حاصل کرنے کے لئے ہر عیب کو ہنر سمجھا ہے اس کی تاثیر خدانخواستہ بہتوں کی گمراہی کا باعث ہو گی۔

(تنقیح البیان: ص ۳ بحوالہ سرسید احمد خاں اور ان کا عہد: ص ۱۸۹)

واحد تفسیر القرآن نصرانی طرز پر:

تمام روئے زمین کی تفسیروں میں، جو مسلمانوں نے لکھیں، ایک یہی تفسیر القرآن مجید ہے جو نصرانی طرز پر ہے۔ (ایضاً: ص ۲۴۳)

جداگانہ خدا ہونے کی متوقع فرمائش:

یہ نئی شریعت خاں صاحب بہادر نے جاری کی کہ ہر ملک میں پیغمبر کا ہونا ضرور ہے۔ اب چند روز میں ہر ملک میں ایک جداگانہ خدا ہونے کی بھی فرمائش کی جائے گی۔

(تریاق: ص ۱۲ بحوالہ ایضاً: ص ۱۹۰)

ناصر الدین محمد

سرکارِ انگریزی کے بڑے مقرّب اور چہیتے:

...انہوں (انگریزوں) نے یہ تجویز کیا کہ جب تک ایک بدذات اور خسیس مسلمان کو ملایا نہ جائے اور اس کو دلاسا اور مال وزر اور عہدے کی طمع دے کر اپنی طرف نہ کیا جائے اس وقت تک مقصد کا حاصل کرنا دشوار ہے۔ اسی خیال سے انہوں نے سیڈ احمد (Syed

Ahmed) خاں کو، جو کہ ملا تھے اور سرکار انگریزی کے قدیم سے بڑے خیرخواہ اور حامی تھے اور ایام غدر میں بھی انہوں نے برخلاف اپنی قوم کے سرکار انگریزی کی حمایت کی تھی، اس مقصد کے پورا کرنے کے لئے تجویز کیا اور اُن سے کہا کہ کسی طرح ان دونوں وہموں کے اٹھانے کی تدبیریں کرو اور مسلمانوں کے دلوں سے اس تعصب کو، جو اُن کے حفظ کا سبب ہے، اُڑادو۔ پس سیڈ احمڈ خاں نے بہ طمع مال وزر اور عہدہ اور حب جاہ اور خوشامد حکام وقت کے خداترسی اور قومی ہمدردی کو بالکل دل سے نکال ڈالا اور ظاہر میں فریب دینے کے لئے قومی خیرخواہ اور محب وطن کے پیرائے میں ظہور کیا جب سے انہوں نے اس مدرسہ کی تجویز کی تو سرکار نے اس وجہ سے کہ اُن کے مصلحت سیاست کے موافق تھا، تائید کی۔ جب انہوں نے اس مدرسہ کی تجویز کی اور سرکار نے اور دنیادار لوگوں نے اُن کی خاطر اور خوشامد سے اور اس خیال سے کہ سرکار انگریزی کے یہ بڑے مقرب اور چہیتے ہیں، خوب دل کھول کر مدد کرنا شروع کی اور آخر کار وہ مدرسہ جاری ہو گیا جس میں قوم کی تباہی اور بربادی کا بیڑا اٹھایا گیا ہے۔

(ردنیچریہ: ص ۵۷۔۶۰ بحوالہ ''سرسید تحریک کا ردعمل''، ص ۲۴۰)

توریت اور انجیل میں عدمِ تحریف کی بحث پر تصنیف:

پادریوں پر اس امر کا استحقاق ہے کہ وہ سیڈ احمڈ خاں کا ایک بت تیار کر کے ہمیشہ اس کی ڈنڈوت کیا کریں، اس لئے کہ جو کتاب سیڈ احمڈ خاں نے توراۃ اور انجیل کی عدمِ تحریف کی بحث میں لکھی ہے اس کا مقدمہ یہی ہے کہ مسلمان پادریوں کی دعوت قبول کریں اور ان کے الزامات اور اعتراضات کا کوئی جواب نہ دے سکیں۔ اور مسلمانوں کا تو یہ کام ہے کہ وہ قیامت تک ہر نماز کے بعد ایسے شخص پر لعنت اور پھٹکار کرتے رہیں۔ (ایضاً، ص ۲۴۱)

میر ناصر علی دہلوی

تحقیقاتِ نیچریہ کا چرچا:

(انشائیوں سے اقتباسات) بعضے نیچریوں نے ایک قسم کا دہریہ پن مع ایک خدا کے نکالا مگر اہل مذہب نے کبھی اعتبار نہیں کیا، نہ خود اُن سے بن پڑا کہ تحقیقات نیچریہ کو کسی مذہب

میں ملا سکتے۔ ہمارے سید جو ولایت گئے، ذہین تو تھے ہی اس کا چرچا دیکھ کر سوجھا کہ اسلام میں لا ڈالئے۔ یورپ کے محققان نیچر تو ہر مذہب کو نیچر کے خلاف بتاتے ہیں، ہو سکے تو اسلام سے ملا دیجئے۔ ان پر سے تو یہ وہ بات ہوگی جو یورپ کے علمائے نیچریہ سے بھی نہیں ہو سکی۔ یہ تو تمام دنیا کے مذہبوں کو اصول نیچریہ کے خلاف ہی بتاتے رہے۔ سید کی ذہانت میں تو شک نہیں کہ وہاں والے اسلام کی حقیقت سے واقف تھے ہی نہیں، اُن کی اختراع کے قائل ہو گئے اور یہاں والے ان کی بات سمجھ کر مرید ہو گئے۔ مگر چونکہ ہمارے سید کو اس تحقیقات میں بھی، جو انگریزی میں ہے، معمولی آگہی سے زیادہ دستگاہ نہ تھی اور نہ مثل ٹینڈال اور اسپنسر وغیرہ، جو علوم حکمیہ کے پروفیسر ہیں، نیچر کی داد بھی اچھی طرح دے سکے۔ یہ ہوتا تو کبھی مذہب کو فلسفہ و نیچر کا پابند نہ کرتے۔

(مقامات ناصری ص ۱۳۶)

ہمارے سید احمد خاں صاحب بہادر نیچری ہونے کا تو دعویٰ کرتے ہیں مگر خبر سے جانتے نہیں کہ نیچر اور نیچری ہوتا کیا ہے؟ اور چونکہ جرأت اکثر واقفی سے زیادہ ہوتی ہے گھوڑے پر روز روز کرسی چڑھتے ہیں جو ابھی گرے نہیں۔ سواری کا شوق تب تک بہت رہتا ہے جب تک کہ آدمی نئی نئی سواری سیکھتا ہے۔ جہاں دو چار دفعہ کے [illegible] آئے اور آفات سواری کا تجربہ ہوا پھر اتنی نہیں چاہتا۔ سید احمد خاں صاحب کا شوق نیچر بھی اسی ناواقفی کے سبب سے دکھائی دیتا ہے۔ (ایضاً ص [illegible])

تحقیقات نیچریہ کی اسلام پر ایمان کہاں؟ یہ سید احمد خاں [illegible] نیچری مسلمان [illegible] تحقیقات نیچر و اسلام [illegible] سید احمد خاں صاحب [illegible] [illegible] اسلامی خوبیوں کے قائل ہوں [illegible] [illegible] معقول جواب [illegible] [illegible] مسلمان [illegible] نیچری [illegible] [illegible] مسلمان [illegible] (ایضاً ص [illegible])

ہم عصر علما کے فتوے

استفتا عقائد سرسید و قیامِ مدرسۃ العلوم پر

(مدرسۃ العلوم کے سب سے بڑے مخالف دو بزرگ تھے جو باوجود ذی وجاہت اور ذی رعب ہونے کے علوم دینیہ سے بھی آشنا تھے: ایک مولوی امداد العلی ڈپٹی کلکٹر کان پور اور دوسرے مولوی علی بخش خاں سب جج گورکھ پور۔ اگرچہ یہ دونوں صاحب مذہبی عقائد و خیال کے لحاظ سے ایک دوسرے کے ضد حقیقی تھے، یعنی پہلے سخت وہابی اور دوسرے سخت بدعتی، اور یہ ایسا اختلاف تھا کہ کسی بات پر دونوں کا اتفاق کرنا محال عادی معلوم ہوتا تھا: باوجود اس کے مدرسۃ العلوم کی مخالفت پر دونوں ہم زبان اور متفق الکلمہ تھے: یہاں تک کہ ہندوستان میں جس قدر مخالفتیں اطراف و جوانب سے ہوئیں، ان کا منبع ان دونوں صاحبوں کی تحریریں تھیں۔ (حالی. حیاتِ جاوید [۲] ص ۲۷۷)

مستفتی سید امداد العلی

کیا فرماتے ہیں علمائے اسلام اس میں کہ علی گڑھ، کانپور، سہارنپور، دیوبند، دہلی، لاہور وغیرہ بلاد میں مدارس اسلامیہ جن میں صرف نحو، فقہ، اصول حدیث، تفسیر، فرائض، منطق، حکمت پڑھی جاتی ہیں، مسلمانوں کے چندے سے مقرر ہیں، اب ایک شخص جس کے یہ اقوال ہیں کہ:

☆ ہم کو متعدد مسائل میں مسلمانوں سے اختلاف ہے۔

پس اس مدرسہ جدیدہ میں جس کو ایسا شخص بدعقیدہ اس منشا سے کہ اس میں تربیت اور تعلیم مذہبی اور غیر مذہبی اس طریقے سے ہو کہ جس سے وہ تہذیب، جو میری رائے میں ہے، حاصل ہو اور وہ بے تہذیبی اور قید، جو تعلیم مدارس اسلامیہ موجودہ سے حاصل ہے رفع ہو بنانا چاہتا ہے، مسلمانوں کو ابتدائیا بعد موقوف کرنے پر چندہ مدارس اسلامیہ موجودہ کے چندہ دینا باوجود خوف اعانت کے معصیت پر درست ہے یا نہیں؟

(امداد الآفاق ص ۵۸ بحوالہ ''سرسید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک کے ناقدین'' ص ۳۵۰-۳۵۱)

الجواب

جملہ مسالک علمائے ہند کی تحریروں سے الطاف حسین حالی کے
بقول سب سے بڑے دو عالموں کے فتووں کے اہم نکات:

عبدالحی لکھنوی (یکے از علمائے فرنگی محل)

وجود شیطان اور اجنہ کا، منصوص قطعی ہیں اور منکر اس کا شیطان ہے بلکہ اس بھی زائد کیونکہ خود شیطان کو بھی اپنے وجود سے انکار نہیں۔ اور وجود آسمان منصوص قرآنی ہے، منکر اس کا مبتلائے وسواس شیطانی ہے۔۔۔۔ جو شخص کہ اعتقادات اس کے فاسدہ ہیں، جو کہ سوال میں مسطور ہوئے ہیں، وہ شخص مخرب دین، ابلیس لعین کے وسوسہ سے صورت اسلام میں تخریب دین محمدی کی فکر میں ہے اور بنام تجدیدہ مدرسۂ جا۔ یہ افساد شریعت اس کی منظور نظر ہے۔ جو چیزیں کہ اس کے نزدیک موجب تہذیب ہیں، اہل سنت کے نزدیک باعثِ تخریب ہیں۔

(حیاتِ جاوید (۲) ص ۲۸۳-۲۸۴)

کریم اللہ دہلوی

۔۔ تعمیر کرنا اور کرانا بقول و فعل اس قائل کے ایسے مکان کا، اور [illegible] طلبہ کی، اور اپنے مال معصوم کو غیر معصوم کرنا اور ہم پایہ ہونا اُس خوش عقیدہ کے کہ [illegible] بد مآل اس سوال میں مذکور ہے بالکل باطل، اور ایسے مکان ناپاک کا نام مدرسہ [illegible] و تحصیل سمجھنا آدمیت سے نکلنا ہے اور زمرۂ حیوانات میں داخل ہونا ہے۔ (ایضاً: ص ۲۸۳)

☆ جو مذہب نیچر یعنی اصلی حالتِ فطرتِ انسانی کے خلاف ہے وہ صحیح نہیں اور جو نیچر کے مطابق ہے وہ صرف ایک مذہب ہے جس کو میں ٹھیٹ اسلام کہتا ہوں جو بدعاتِ محدثات اور غلط خیالِ اجماع سے اور خطائے اجتہادات سے اور ڈھکوسلا قیاسات اور شکنجہ اصولِ فقہ مخترعہ سے مبرا ہو۔

☆ اور میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص تقلید سے علیحدہ ہو کر غور کرے گا، یقینی جانے گا کہ اکثر عالموں نے قرآنِ مجید کی حالت کی نسبت غلط فہمی کی ہے۔

☆ تفسیریں یہودیوں کے قصوں سے بھری ہوئی ہیں اور رومن کیتھولک کے فرقے سے اخذ کی گئی ہیں۔

☆ اور احادیث کی کتابوں کی کوئی حدیث قابلِ یقین نہیں ہے۔

☆ سیر کی کتابیں مانند مہابھارت اور الف لیلہ کے قصے کے ہیں۔

☆ اور سوائے اس کے اس کو انکار ہے وجودِ شیطان اور وجودِ آسمان اور ملائکہ اور عموم طوفانِ نوح اور عموم بعثِ نوح سے۔

☆ پرندِ مخنقہ کو، جس کو نصاریٰ نے گلا گھونٹ کر مار ڈالا ہو، حلال کہتا ہے۔

☆ معراج کو ایک خواب قرار دیتا ہے۔

☆ تصویر کھینچنے پر اصرار کرتا ہے اور اس کو جائز سمجھتا ہے

☆ اور اسی قسم کے بہت سے امور اس شخص کی رائے میں موجب تہذیب ہیں، ایک نیا مدرسہ اس تمہید سے مقرر کرنا چاہتا ہے کہ:

☆ مدارس اسلامیہ موجودہ مانند مدرسہ علی گڑھ، کانپور، سہارنپور، دیوبند، دہلی، لاہور وغیرہ لغو اور بے فائدہ ہیں،

☆ کچھان سے فائدہ قومی اور تہذیب اور آزادگی حاصل نہیں ہوتی ہے بلکہ عمر ان میں ضائع ہوتی ہے اور ہمیشہ آدمی ان مدرسوں میں پڑھنے سے غلامی کی حالت میں رہتا ہے۔

☆ مدرسہ جدیدہ میں تعلیم علوم دینی وعلوم دنیاوی اس طریقے سے ہوگی جس سے تہذیب اور آزادگی حاصل ہو۔

پس اس مدرسہ جدیدہ میں جس کو ایسا شخص بدعقیدہ اس منشا سے کہ اس میں تربیت اور تعلیم مذہبی اور غیر مذہبی اس طریقے سے ہو کہ جس سے وہ تہذیب، جو میری رائے میں ہے، حاصل ہو اور وہ بے تہذیبی اور قید، جو تعلیم مدارس اسلامیہ موجودہ سے حاصل ہے رفع ہو بنانا چاہتا ہے، مسلمانوں کو ابتدا یا بعد موقوف کرنے پر چندہ مدارس اسلامیہ موجودہ کے چندہ دینا باوجود خوف اعانت کے معصیت پر درست ہے یا نہیں؟

(امداد الآفاق ص ۵۸، بحوالہ" سرسید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک کے ناقدین" ص ۳۵۰۔۳۵۱)

الجواب

جملہ مسالک علمائے ہند کی تحریروں سے الطاف حسین حالی کے بقول سب سے بڑے دو عالموں کے فتووں کے اہم نکات:

عبدالحی لکھنوی (یکے از علمائے فرنگی محل)

وجود شیطان اور اجنہ کا منصوص قطعی ہیں اور منکر اس کا شیطان ہے بلکہ اس بھی زائد کیونکہ خود شیطان کو بھی اپنے وجود سے انکار نہیں۔ اور وجود آسمان منصوص قرآنی ہے، منکر اس کا مبتلائے وسواس شیطانی ہے ..... جو شخص کہ اعتقادات اس کے فاسدہ ہیں، جو کہ سوال میں مسطور ہوئے ہیں، وہ شخص مخرب دین، ابلیس لعین کے وسوسہ سے صورت اسلام میں تخریب دین محمدی کی فکر میں ہے اور بنام تجدیدہ مدرسۂ جدیدہ افساد شریعت اس کی منظور نظر ہے۔ جو چیزیں کہ اس کے نزدیک موجب تہذیب ہیں، اہل سنت کے نزدیک باعث تخریب ہیں۔

(حیاتِ جاوید (۲) ص ۲۸۳۔۲۸۴)

کریم اللہ دہلوی

..... تعمیر کرنا اور کرانا بقول و فعل اس قائل کے ایسے مکان کا، اور معاونت کرنی ایسے طلبہ کی، اور اپنے مال معصوم کو غیر معصوم کرنا اور ہم پایہ ہونا اُس خوش عقیدہ کے کہ جس کا حال بدمآل اس سوال میں مذکور ہے بالکل باطل، اور ایسے مکان ناپاک کا نام مدرسہ رکھنا اور محل تعلیم وتحصیل سمجھنا آدمیت سے نکلنا ہے اور زمرۂ حیوانات میں داخل ہونا ہے۔ (ایضاً ص ۲۸۳)

استفتا کانگریس میں شرکت کے مسئلے پر

الجواب

غلام دستگیر قصوری

جس امر کے شمول میں اہلِ ہنود سے کوئی مضرت دینی و دنیوی نہ ہو، شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے: اور فقیر نے چند سال سے ایک رسالہ ''جواہر مضیہ رد نیچریہ'' جو تالیف کر کے مطبوع کرا دیا، اس میں نیچریوں کی محبت و شمول کا سخت گناہ ہونا درج کیا ہے جس پر مواہیر علما لاہور و اطراف لاہور درج ہیں۔

(نصرۃ الابرار ص ۲۸)

ایک اور استفتا

''کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص کے جواب میں مولوی عبدالعزیز صاحب لدھیانوی نے یہ فرمایا کہ ہندوؤں سے معاملہ کرنا درست ہے اور جو ایک جماعت ہندو اور مسلمانوں کے واسطے موقوف کرانے انکم ٹیکس وغیرہ قائم ہوئی ہے، بشرطِ عدم نقصان دین ان سے ملنا درست ہے؛ اور جو (جماعت) نیچری نے ہندو اور نیچریوں سے جمع کی ہے، ان سے ملنا درست نہیں کیونکہ یہ لوگ مرتد ہیں (اور) مرتد سے معاملہ کرنا ہرگز درست نہیں۔ آیا جواب مولوی صاحب کا شرع کے موافق ہے یا نہیں؟

الجواب (خاص نکات)

احمد رضا خاں بریلوی

حضرات نیچریہ شرع مطہر میں ان کے اور تمام مبتدعین کے احکام، جن کی بدعت درجہ کفر کو پہنچی ہو، احکام جمیع اقسام کفار سے اشد و اعظم ہیں ..... ہندو کی بات کھلی مخالف کی بات ہے کہ ہر جاہل سا جاہل اس کے کفر پر مطلع اور اُسے اپنے مذہب سے جدا جانتا ہے۔ یہ حضرات کہ بظاہر کلمہ پڑھتے اور زبانی دعویٰ اسلام رکھتے، بلکہ اپنے ہی آپ کو سچا پکا مسلمان و خیر خواہ مومنین و ایمان بتاتے ہیں، دام در سبزہ و مارِ آستین ہیں۔ ان کا زہر آلود افسوں سیفۂ بد بخت پر جلد چلتا اور انجام کار ہلاک کر دیتا ہے۔ (ایضاً: ص ۳۰-۳۲)

مفتیانِ حرمین شریفین

استفتا عقائدِ سرسید پر

مستفتی حاجی علی بخش خاں (ترجمہ عربی سے)

آپ کیا فرماتے ہیں اس شخص کے باب میں جو ابلیس کے وجود خارجی سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس سے مراد قوت بہیمیہ ہے جو نفسِ انسان میں ہے، اور ملائکہ کا سجدہ آدم کے واسطے حقیقی سجدہ نہ تھا بلکہ اس سے قویٰ کا مطیع ہونا مراد ہے، اور ابی واستکبر سے عدم اطاعت قوت بہیمیہ مراد ہے جو آدمی کو اغوا کرنے والی ہے نہ کہ حقیقی سجدے سے انکار کرنا، اور کہتا ہے کہ افلاک اجسام نہیں ہیں بلکہ ان سے فضائے بسیط یا سبع سیارات مراد ہیں، اور کہتا ہے کہ لونڈی غلام بنانا حرام ہو گیا ہے ......، اور کہتا ہے کہ معراج خواب میں ہوئی تھی اور جسم کے ساتھ آنحضرتؐ کے جانے سے انکار کرتا ہے، اور انکار کرتا ہے شق صدر آنحضرت کا، اور کہتا ہے کہ گلا گھونٹیے پرند حلال ہیں؛ پس ایسے شخص کے باب میں کیا حکم ہے؟

(حیات جاوید (۲): ص ۲۸۶)

الجواب (ملخص)

شیخ احمد بن زین دحلان (مفتی شافعیہ مکہ معظمہ)
حسین بن ابراہیم (مفتی مالکیہ مکہ معظمہ)
شیخ عبدالرحمٰن بن شیخ عبداللہ سراج (مفتی حنفیہ مکہ معظمہ)
محمد بن عبداللہ بن حمید (مفتی حنابلہ مکہ معظمہ)

یہ شخص ضال اور مضل ہے بلکہ وہ ابلیس لعین کا خلیفہ ہے کہ مسلمانوں کے اغوا کا ارادہ رکھتا ہے اور اس کا فتنہ یہود و نصاریٰ کے فتنے سے بھی بڑھ کر ہے، خدا اس کو سمجھے۔ واجب ہے اولوالامر پر اس شخص سے انتقام لینا۔ اس کو تنبیہ کرنی چاہیے اور اگر جاہل ہو تو سمجھانا چاہیے۔ پھر اگر باز آئے تو بہتر ہے ورنہ ضرب اور حبس سے اس کی تادیب کرنی چاہیے اگر ولاۃ اسلام میں کوئی صاحب غیرت ہو، نہیں تو خدا اس کو سمجھے گا اور اس کی ضلالتوں اور رسوائیوں کی سزا دے گا۔ (ایضاً ص ۲۸۷)

شیخ محمد امین بالی (مفتی احناف مدینہ منورہ)

یہ شخص یا تو ملحد ہے یا شرع سے کفر کی کسی جانب مائل ہو گیا ہے، یا زندیق ہے کہ کوئی دین نہیں رکھتا، یا اباحی ہے کیونکہ منخنقہ کا کھانا مباح بتلاتا ہے۔ اور اہلِ مذہب (حنفی) کے بیانات سے مفہوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کی توبہ گرفتاری کے بعد قبول نہیں ہوتی؛ پس اگر اس شخص نے گرفتاری سے پہلے توبہ کر لی اور ان گمراہیوں سے رجوع کی اور توبہ کی علامتیں اس سے ظاہر ہو گئیں تو قتل نہ کیا جائے ورنہ اس کا قتل واجب ہے دین کی حفاظت کے لئے، اور ولاۃ امر پر واجب ہے کہ ایسا کریں۔ (ایضاً)

یہ شخص ان عقائد کے باعث کافر ہے بلکہ اس کا پہلا عقیدہ اس کے کافر ہونے کے لئے کافی ہے اس لئے کہ وہ قرآن کا منکر ہے، تو اگر مسلمان تھا تو اب مرتد ہو گیا، اس نے ضروریات دین میں رسول اللہ کی تکذیب کی۔ (توضیح الاحکام: ص ۱۲)

استفتا مدرستہ العلوم کے قیام پر

مستفتی حاجی علی بخش خاں (ترجمہ عربی سے)

کیا ہے آپ کا قول جائز ہونے میں اس شخص کے مدرسے کے، جو اعتقاد رکھتا ہے کہ:

☆ حدیث قابلِ اعتماد نہیں اور فقہ اور اصولِ فقہ امورِ واہیہ ہیں، اور

☆ ابلیس اور آسمان کا وجود خارجی نہیں ہے، اور جو

☆ انکار کرتا ہے قصہ آدم کا اور فرشتوں کے ان کو سجدہ کرنے سے، اور جو کہتا ہے کہ یہ کنایہ ہے قولی سے، اور کہتا ہے کہ

☆ اہلِ اسلام کے اخلاق مہذب نہیں ہو سکتے بدوں اس کے کہ تقلید کریں اہلِ یورپ کی اپنی ضروریات میں جن کو بیان کیا ہے یورپ کے فلاسفہ جدید نے، اور تحقیق جمیع علومِ دینیہ قدیمہ جن کو تدوین کیا ہے مسلمانوں نے، وہ ان کو کچھ نفع نہیں دے سکتے؛

☆ پس لازم ہے قائم ہونا ایک مدرسے کا، جس میں درس دیے جائیں علومِ جدیدہ فلسفیہ، اور تعلیم کیے جائیں ضروریات ستہ اہلِ یورپ کے طریقے اور وضع پر، اور انتخاب کی جائیں کتب دینیہ اس طرح کہ نہ مخل ہوں ساتھ وضعِ جدیدہ کے؛

☆ اور جب انکار کیا مسلمانوں نے اور کہا کہ تیرا مدرسہ ہوگا ایک مدرسہ الحاد اور زندقہ کا، اور انکار کیا اس کی امداد سے اور اعانت سے تو اس نے لکھا ان کو کہ میں تو بہ نہیں کرتا ہوں اپنے اعتقادات سے، اور نہیں رجوع کرتا ہوں اپنے دعوے سے مگر یہ کہ گردانوں گا میں امورِ مدرسہ کو موافق ایوانِ کمیٹی کے؛

☆ اور حال یہ ہے کہ اکثر اہلِ کمیٹی اس کے گروہ اور جماعت میں سے ہیں اور ان کی رائیں بدلتی رہتی ہیں ہمیشہ، اور ان کا لاحق منسوخ کرتا ہے ان کے سابق کو۔

☆ پس اس حالت میں کیا یہ صحیح اور جائز ہے مسلمانوں کو کہ مدد دیں اس مدرسے کے لئے اور اعانت کریں اس کی یا نہیں؟ (سرسید تحریک کا ردِ عمل، ص ۳۰۱)

الجواب (ترجمہ عربی سے)

احمد بن زین دحلان (مفتی شافعیہ مکہ مکرمہ)

واجب ہے ہر مسلمان پر جس کو پہنچے ہیں اس کے یہ ذائقہ عقائد، انکار کرنا ان کے اعتقاد کرنے والوں پر، اور نہیں واجب ہے کسی اہلِ اسلام پر مدد دینا اس مدرسے کے بنانے میں، اور اگر بنا دیا گیا ہے تو واجب ہے اس کا ڈھانا اور بدلہ لینا اس کے بنانے والے سے، اور اس کے بنانے میں اس کو مدد دینے والے سے شدید قسم کا بدلہ

(سرسید تحریک کا ردِعمل: ص ۳۰۲)

حسین بن ابراہیم (مفتی مالکیہ مکہ معظمہ)

جائز نہیں ہے اس شخص کی اعانت اس مدرسے کے بنانے میں، اس لئے کہ اس کا اعتقاد فاسد ہے اور یہود و نصاریٰ آسان ہیں از روئے حال کے اس شخص سے .....

(سرسید تحریک کا ردِعمل: ص ۳۰۱)

عبدالرحمٰن بن عبداللہ السراج (مفتی حنفیہ مکہ مکرمہ)

صورتِ مذکورہ میں اس مدرسے کی اعانت جائز نہیں۔ اللہ ڈھائے اس مدرسے کو اور قتل کرے اس کے بنانے والے کو ..... (ایضاً: ص ۳۰۲)

محمد بن عبداللہ بن حمید (مفتی حنابلہ مکہ مکرمہ)

جائز نہیں ہے مدد کرنا بنانے پر اس مدرسے کے کہ جس میں درس دئے جائیں وہ علوم جو مخالف ہیں شریعتِ مطہرہ کے، اور اس مدرسے کا بنانے والا گنہگار ہے، اور واجب ہے منع کرنا ان گمراہیوں سے اور نہ منہ سے نکالنا ان گمراہیوں کا، اور واجب ہے اس پر جو صاحبِ غیرتِ اسلامی ہے اور حمیتِ ایمانی رکھتا ہے، اور انکار کرنا اس سے کہ پہنچتی ہے اس کو قدرت اس کی، اگرچہ دل سے انکار کرنا ضعیف تر ایمان ہے..... (ایضاً)

عربی میں نقد و نظر

احمد ابراہیم الشبیشی

انگریزوں سے تعاون کی تعلیمی پالیسی:

جہاں تک ان کی تعلیمی پالیسی کا تعلق ہے اس میں انہوں نے انگریزوں سے تعاون کیا اور اسی لئے مسلمانوں اور انگریز افسروں کے درمیان مکمل اتفاق پیدا کرنا چاہا۔ انگریزوں کے ساتھ اتفاق کی دعوت کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں کو ۱۸۸۵ء میں تشکیل پانے والی انڈین کانگرس کے خلاف ابھارتے رہے۔ اسی لئے انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی۔ لیکن یہ یونیورسٹی ہندوؤں کے خلاف قطعی نہیں تھی اور ان کی پالیسیوں میں ان کا مقصد کبھی یہ نہیں رہا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں مخالفت و دشمنی کی روح پیدا کی جائے بلکہ ان کا یقین تھا کہ ہندوستان مسلمانوں، ہندوؤں اور اس میں رہنے والے تمام دوسرے طبقوں کا مشترکہ وطن ہے لیکن سید احمد خاں کی پالیسی کی گونج علاوہ اعلیٰ طبقہ کے مسلمانوں کے کہیں نہیں سنائی دی''۔

(الہند خلال العصور: ص ۱۱۷ بحوالہ ''مقالات قومی سرسید سمنار'' ص ۱۳۵)

ڈاکٹراحمدامین

متحدہ قومیت پراعتقاد:

ان (سرسید) کا اعتقاد تھا کہ ہندوستانی ایک قوم ہیں اور ہر ایک فرد کو اپنے اپنے مذہب کا حلقہ بگوش رہنا چاہیے جس کا متحدہ وطنیت پر کوئی اثر نہ پڑے۔ ہر قوم اپنے اپنے مذہب پر قائم رہ کر وطنیت میں حصہ لے۔ ملکی آزادی تب ہی حاصل ہوگی جب دین کو عقیدہ میں منحصر کر دیا جائے اور ہر فرد اور فرقے میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کر دیا جائے۔

(مصلحین اُمت: ص۱۰۲)

سید جمال الدین افغانی

دینی اور نسلی حمیت کے آثار مٹانے کی جدوجہد

ہندوستان کا ایک آدمی احمد خاں انگریز سے کچھ فائدہ حاصل کرنے کی خاطر اُن کے محلوں کا طواف کرتا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو انگریزوں کے سامنے پیش کیا اور اپنے مذہب کو چھوڑنے اور انگریزی مذہب اختیار کرنے کے لئے چند قدم آگے بڑھائے۔ اس نے اپنے کام کی ابتدا ایک تصنیف سے کی جس میں یہ ثابت کیا کہ توریت اور انجیل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس طرح اس نے انگریزوں کی بارگاہ میں قرب حاصل کرنا چاہا۔ پھر انہیں اور خوش کرنے کے لئے اس نے صراحتاً نصرانی ہونے کا فیصلہ کرلیا لیکن اس معمولی خدمت پر جو تصنیف کی صورت میں اس نے ادا کی ہے کوئی قابل قدر معاوضہ ملنے کی توقع بہت کم ہے کیونکہ ایسی کتابیں بہت سے پادری اور مستشرق اس سے پہلے بھی لکھ چکے ہیں اور معدودے چند افراد کے سوا مسلمانوں کو دین سے ہٹانے میں ناکام رہے ہیں اس لئے اس نے اپنے انگریز حاکموں کی خوشنودی کی خاطر مسلمانوں کی آواز کمزور کرنے اور ان کے اتفاق کو برباد کرنے کا دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ چنانچہ وہ نیچریوں اور دہریوں کے روپ میں ظاہر ہوکر یہ ثابت کرنے لگا کہ دنیا میں اندھی فطرت اور نیچر کے علاوہ اور کسی چیز کا وجود نہیں۔ وہ اس کھلی گمراہی کا اعلان کرنے لگا کہ اس دنیا کا کوئی پیدا کرنے والا نہیں۔ اس کے خیال میں سارے انبیاء دہری ہی تھے اور اس

معبود کے بالکل قائل نہ تھے جس کا ذکر شرائع میں آیا ہے، نعوذ باللہ۔ اس نے اپنا لقب نیچری رکھ لیا۔ اس نے دولت مند طبقہ کے پرجوش لیکن سادہ لوح نوجوانوں کو ابھارنا شروع کیا اور بہت سے نوجوان شریعت کی پابندیوں سے نجات حاصل کرنے کی تمنا اور حیوانی شہوات سے لذت اٹھانے کے شوق میں اس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ انگریزی حکام کو مسلمانوں کے دلوں میں فساد کا بیج بونے کے لئے یہ طریقہ بہت پسند آیا۔ انہوں نے اس کی عزت و تکریم شروع کر دی اور علی گڑھ میں ایک مدرسہ قائم کرنے میں اس کی مدد کی جس کا نام محمڈن کالج رکھا گیا۔ یہ ایک جال تھا جو مسلمان بچوں کو شکار کر کے ''احمد خاں بہادر'' کے افکار کے مطابق پرورش کرنے کے لئے پھیلایا گیا.....

احمد خاں نے قرآن کریم کی ایک تفسیر بھی لکھی ہے جس میں قرآنی الفاظ کے معانی میں تحریف کر کے اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب کو بدلنے کی کوشش کی۔ اس نے ''تہذیب اخلاق'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس میں صرف وہی مضامین شائع ہوئے جو مسلمانوں کی عقلوں کو گمراہ کرتے اور ان میں تفرق اور دشمنی کے بیج بوتے تھے.....

ہندوستان کے دہری یورپ کے دہریوں سے بالکل مختلف ہیں۔ یورپ کے دہری مذہب چھوڑ کر بھی ملک اور وطن کی محبت میں سرشار ہیں اور اجنبی حملہ آوروں سے ملک کو بچانے، ملک کو ترقی دینے اور اس کے مخالفین کی دستبرد سے بچانے کی خاطر اپنے بیش قیمت مال و متاع اور اپنی جان تک قربان کر دیتے ہیں مگر احمد خاں اور اس کے ساتھی ایک طرف لوگوں کو دین چھوڑنے پر آمادہ کرتے ہیں اور دوسری طرف دینی اور نسلی حمیت کے آثار کو مٹانے اور اجنبی تسلط کا جواز پیدا کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔

(مضامین جمال الدین افغانی: ص ۲۹۸ تا ۳۰۱)

زندیقوں کی تاویلات سے مشابہ تاویلیں:

اپنی پوری ہمت مفسر نے اس امر پر صرف کی کہ اس آیت کی جس میں ملائکہ جن، روح الامین، وحی، جنت، دوزخ، معجزے وغیرہ کا ذکر ہے ظاہری معانی کے سوا ایسی تاویل کی جائے کہ گذشتہ زمانے کے زندیقوں کی تاویلات سے مشابہ ہو۔ اگر کچھ فرق ہے تو صرف اتنا

کہ گذشتہ زمانے کے زندیق بھی ملا تھے اور اس عہد کا یہ مفسر بے چارہ محض عامی ہے لہٰذا زندیقوں کے اقوال پر بھی بخوبی حاوی نہیں۔ فطرت کو موضوع بحث قرار دے کر اس نے عقلی دلائل کے بغیر چند مبہم اور مہمل کلمات اس سلسلے میں بیان کئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کو اتنا بھی احساس نہیں کہ انسان صرف تربیت کی بنا پر انسان ہے اور تمام فضائل و آداب کسبی ہیں۔ نیچر سے قریب تر وہ انسان ہے جو مدنیت سے دور تر ہو اور تربیت سے بعید تر اور فضائل و آداب کے قریب نہ پھٹکا ہو کیا یہ شخص نہیں سمجھتا کہ اس ضعف اور پریشانی کے عالم میں جب جنت، دوزخ اور معجزات پر اعتقاد نہ رکھیں گے اور جب پیغمبر کو گلیڈ سٹون جیسا سمجھیں گے تو پھر انہیں کیا تامل ہوگا کہ اسلام کو ترک کر دیں اور اس مذہب میں ضم ہو جائیں جس کے پیرو اس وقت سیاسی طور پر دنیا پر چھائے ہوئے ہیں۔ (ایضاً، ص ۱۵۴۔۱۵۵)

عبدالمنعم النمر

مخالفت کا پس منظر:

اُنہوں نے جنت و دوزخ کا انکار کیا، جن و ملائکہ کا انکار کیا، فقہا و ائمہ کو سب و شتم سے نوازنے اور محدثین اور اسلامی شعائر کے تئیں تمسخر آمیز رویہ اپنانے لگے سرسید کو اپنے افکار و نظریات کی وجہ سے انگریزوں میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کے خلاف مسلم عوام کی شدت میں اور بھی اضافہ ہوتا گیا، حتیٰ کہ ان کو قتل کرنے تک کی کوششیں ہوئیں کیونکہ مسلمان سمجھ رہے تھے کہ اس مدرسہ میں انگریزی ثقافت کے مطابق تعلیم دے کر مسلم بچوں کو بے دینی والحاد کی طرف راغب کیا جائے گا۔

(''کفاح المسلمین فی تحریر الہند'' ص ۴۲، بحوالہ ''مقالات قومی سرسید سمنار''، ص ۱۳۴)

ڈاکٹر محمد البہی

سرسید کی دعوت، قادیانیت کی تمہید:

سرسید نے اصلاح اور ترقی کی جو دعوت پیش کی وہ قادیانیت کی تمہید سمجھی جاتی ہے اور

پھر اسی عقیدہ سے ''احمدیت'' نام کا مذہب ظہور پذیر ہوا۔ سرسید کی دینی تجدیدی رجحان سے ساتھ ہم آہنگ سیاسی تربیتی نفوذ حاصل تھا جو بعد میں قادیانیت وو جود میں لانے کا سبب بنا۔

(الفکر الاسلامی الحدیث وصلتہ بالاستعمار الغربی'' ص ۴۴-۴۵، بحوالہ'' مقالات قومی سرسید سمنار'' ص ۱۳۱-۱۳۲)

مرزا غلام احمد قادیانی کی مشنری نے ''احمدی مذہب'' کو جنم دیا۔ یہ مذہب تب بنا جب اس کے لئے ثقافتی، روحی اور فکری فضا سازگار ہوئی اور سید احمد خاں کے ذریعے اسے فروغ ملا۔ سید احمد خاں علی گڑھ کالج کے بانی ہیں۔ ان کی اپنی ایک تفسیر قرآن بھی ہے۔ یہ انیسویں صدی میں عمر بھر انگریز کی بالادستی کے لئے تعاون کرنے اور ان سے دوستی جوڑنے کے داعی رہے۔ اس مذہب نے جہاد کے بارے میں یہ فکر دی کہ'' جہاد فی الاسلام تو اس وقت تک ایک وقتی حکم تھا جب تک اسلام ایک دین نہ بن گیا تھا ... '' جہاد جیسے رکن پر عمل اسلام کے صدر اول اور خیر القرون سے جو تا حال سمجھا جاتا رہا ہے، اس تفسیر احمد خانی سے وہ بالکل باطل ہو جاتا ہے۔

(الحق اکوڑہ خٹک، جون ۱۹۷۲ء، ص ۱۴)

مسعود عالم ندوی

اوامر شریعت کی من مانی تاویل اور باطل ولغو افکار و خیالات:

افسوس اس بات کا ہے کہ انہوں نے اپنی تعلیمی دعوت کے ساتھ انگریزی حضارت و معاشرت کو قبول کرنے کی دعوت کو بھی شامل کر دیا جو سرسید کی بڑی غلطی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے تفسیر قرآن میں اپنی فاسد رائے، تحریف و تاویل اور مغربی فلسفیوں کی اتباع کرتے ہوئے اوامر شریعت کی من مانی تاویل اور باطل ولغو افکار و خیالات کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ تفسیر و تحریف کا یہ طریقہ جو سرسید نے اپنایا تھا وہ بعد کے محرفین، معاندین اسلام، منکرین حدیث اور قادیانیوں وغیرہ نفسانیت پرستوں کے یہاں اپنایا گیا۔ انگریزی تہذیب یافتہ مسلمانوں کا ایک طبقہ سرسید کی تقدیس کرتا ہے اور اس ملک میں ان کو اسلام کا مجدد اکبر سمجھتا ہے۔

(نظرۃ اجمالیۃ فی تاریخ الدعوۃ الاسلامیہ فی الہند والباکستان بحوالہ'' مقالات قومی سرسید سمنار'' ص ۱۳۷)

عہدِ سرسید کے بعد

آزاد شیرازی

انگریزوں کے قائم کردہ سلسلے کی دو کڑیاں:

امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی نے اکثر اس خیال کا اظہار فرمایا ہے کہ بالاکوٹ کے حادثہ کے بعد مولانا محمد اسحٰق دہلوی نے گیارہ برس تک غور و فکر فرما کر امام ولی اللہ کی اجتماعی تحریک کا نیا پروگرام مکمل کیا اور ان کی جماعت ۱۸۵۷ء تک کام کرتی رہی لیکن ۱۸۵۷ء میں اس جماعت کی مرکزی قوت میں سلطان دہلی کی طرف داری اور غیر جانب داری کی بنا پر ایک اختلاف رونما ہوا اور یہ جماعت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی اور جماعت کی دہلوی اکثریت کی بجائے دیوبند اور علی گڑھ دو مرکز بن گئے۔ مولانا محمد قاسم دہلی کالج کے عربی حصہ کو دیوبند لے گئے اور سرسید احمد خاں نے دہلی کالج کے انگریزی حصہ کو علی گڑھ پہنچادیا۔ کالج پارٹی انگریزی حکومت کے ساتھ پورا اشتراک کئے بغیر اپنا کام شروع نہیں کرسکتی تھی اس لئے اس نے گورنمنٹ کی وفاداری کو اپنی سیاسی مصلحت کا جزو بنالیا۔ مولانا عبیداللہ سندھی کہتے ہیں کہ سرسید احمد خاں استاذالاساتذہ الہند مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے۔ مولانا مملوک علی نے شیخ رشیدالدین سے علم حاصل کیا تھا اور وہ شاہ عبدالعزیز کے شاگرد تھے۔ غرض سید احمد دہلوی، جو

علی گڑھ دارالعلوم کے بانی ہیں، ولی اللہی ہیں۔ لیکن تاریخی حقائق ہمیں مولانا عبید اللہ سندھی کے خیالات سے متفق نہیں ہونے دیتے سرسید کا سید احمد شہید یا مولانا محمد قاسم نانوتوی سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ مرزا غلام احمد اور سرسید انگریزوں کے قائم کردہ سلسلے کی دو کڑیاں تھیں اور علی گڑھ کا مذہبی رابطہ دیوبند سے نہیں بلکہ قادیاں سے تھا۔

(تذکرہ لاہور، مئی ۱۹۷۶ء، ص ۲۱-۲۵)

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں

ملکہ معظمہ سے غیر متزلزل دلی وفاداری:

(بنام سید محمود بعد از وفات سرسید)......اس امر کا اعلان کیا جائے کہ سرسید کے انتقال سے کالج کے مقصد و مطمح نظر، طریق انتظام اور اس کے معاملات کی نگرانی اور پالیسی کے اصول میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اور آپ کے سیکرٹری ہونے سے ہماری غیر متزلزل اور دلی وفاداری میں، جو حضور ملکہ معظمہ کے ساتھ ہے، کچھ فرق نہ آئے گا جن کی فرماں روائی میں ہندوستانی مسلمان رعایا کو امن کی نعمت، بہتر حکومت اور روشن دماغی حاصل ہوئی اور ان چیزوں سے ہمارے دلوں میں وفاداری کی بنیاد قائم ہوگئی جس کو آپ کے والد نے اپنے ہم مذہب اور اہل وطن لوگوں کی رائے سے نشوونما کیا اور اُن کی یہ پالیسی تقریباً تمام روشن خیال مسلمانوں نے منظور کر لی۔

(تذکرہ محسن ص ۱۰۲)

ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی

تہذیب الاخلاق کی پروردہ نسل:

سرسید سے واقعی اگر کوئی چوک ہوئی ہے تو وہ یہ کہ انہوں نے ہم پر بہر ہماری صلاحیتوں پر غیر معمولی اعتماد کیا لیکن نئی پود جسے مہدی الافادی نے "تہذیب الاخلاق کی پروردہ نسل" اور بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے "نقالوں کا طائفہ" کہا ہے، اس اعتماد کی اہل ثابت نہ ہو سکی اور اس پر ترقی کا بھوت کچھ اس طرح سوار ہو گیا کہ اسے اس بات کا احساس

تک نہ رہا کہ ''توازن اور اعتدال'' بھی کوئی چیز ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انگریزی سے زیادہ ''انگریزیت'' میں مبتلا ہوگئی اور اس بری طرح ہوئی کہ اپنی ہر چیز حقیر و ذلیل نظر آنے لگی مولوی سید مہدی علی خاں، جو بعد میں خاں بہادر، نواب محسن الدولہ، محسن الملک، میر نواز جنگ کے خطابات سے سرفراز ہوئے اور سرسید کے بعد علی گڑھ کالج کے سیکریٹری مقرر کئے گئے، سرسید کے ان ارادت مندوں میں سے تھے جن پر سرسید کو پورا اعتماد ہی نہیں ''ناز'' بھی تھا (ان کا شمار اُن حوصلہ مندوں میں ہوتا ہے جو اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرتے ہیں اور راستہ کی بڑی سے بڑی دشواری کو پسپا کرتے منزل مقصود پر پہنچ جاتے ہیں)۔ جب ایسا شخص بھی ''مغربیت'' کا یوں شکار ہوسکتا ہے تو پھر کمزوروں اور ناتوانوں کی کون کہے؟ محسن الملک کو اللہ نے سب کچھ دے رکھا تھا، اس لئے وہ انگلینڈ سے آرائش نشیمن کے لئے تنکوں کے ساتھ ''بجلی'' بھی بزور زر ساتھ لیتے آئے۔ لیکن وہ، جن کے پاس اللہ کے نام کے سوا اور کچھ نہ تھا، وہ بھی ''گیسوئے تابدارِ مغرب'' پر مٹے بغیر نہ رہ سکے۔ اور تو اور حالی جیسا معصوم، متین اور سنجیدہ انسان بھی، جسے اصولاً ان زلفوں کی دراز دستی کا رونا رونا چاہیے تھا، ان کے پیچ و خم سے نالاں نہیں بلکہ ان کی ''درازی'' کا آرزومند اور ''سیاہیوں'' کا مدح خواں ہے۔

(نگار کراچی، اکبر الہ آبادی نمبر ۱۹۶۹ء: ص ۱۰۸۔۱۰۹)

آل احمد سرور

انگریز پرستی اور ان کے اشاروں پر نقل و حرکت:

سرسید مشرق و مغرب کے ملاپ کی خاطر سرکار پرست بنے تھے، یہ ان کا نئی نسل پر بہت بڑا احسان ہے۔ وہ اس دور کے بانی اور راہنما ہیں۔ ان کی تحریک سے ہماری مردہ زندگی میں کتنی زندگی پیدا ہوئی، اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں لیکن ۱۸۵۷ء اور ۱۸۸۷ء میں کچھ فرق ہونا چاہیے تھا۔ سرسید کی سیاست اس فرق کو نمایاں کرنے کے خلاف تھی سرسید انگریزوں کے بڑے مداح اور انگریزی طریقہ حکومت کے بہت بڑے طرف دار تھے، شبلی انگریز پرستی سے چڑتے تھے۔ سرسید کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے بھی ان کی آخری عمر کی

سیاست سے، جب وہ بیک کے اشاروں پر حرکت کرتے تھے، اختلاف کیا جا سکتا ہے۔
(انتخاب آل احمد سرور: ص ۸۳)

علی گڑھ کی تحریک ایک انقلابی تحریک تھی، یہ ترقی پسند تحریک تھی، یہ بادشاہت کے نشے کو اُتار کر حقیقت کی تصویر دکھانا چاہتی تھی۔ مذہب میں عقلیت، سماجی زندگی میں رسم ورواج سے بے زاری، تعلیم وتربیت میں مغربیت اور اجتماعی زندگی کی تلقین کے ذریعے سے اس نے انقلابی خدمات انجام دیں مگر ۱۸۹۰ء کے قریب اس تحریک کی مغرب دوستی انگریز پرستی بننے لگی تھی اور اس لحاظ سے یہ ان علما کے مقابلے میں پیچھے تھی جو دیوبند کے ذریعے سے حریت پسندی اور سیاسی جدوجہد کے علم بردار تھے۔ اقبال نے لکھا ہے کہ ''جمال الدین افغانی نے سرسید کو جس طرح یاد کیا ہے، اس کے لئے عروۃ الوثقیٰ کے پرچے یا قاضی عبدالغفار کی آثار جمال الدین افغانی پڑھیئے''۔ اس سے سرسید کی تحقیر مقصود نہیں لیکن ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ سرسید کے کاموں کو بعض لوگ کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ انیسویں صدی کے اختتام تک علی گڑھ تحریک کی ترقی پسندی پر سیاسی مصلحتوں کے بند باندھے جانے لگے تھے۔ شبلی انہیں بندشوں سے اکتا کر ایک اور ادارہ بنانا چاہتے تھے مگر یہ انہوں نے بھی نہ دیکھا کہ دراصل قصور سرسید کے نقطہ نظر کا نہیں، ان کے عمل کا تھا، اُسے انگریزوں کے ہاتھوں میں دے دینے کا اور اُن کے اشاروں پہ چلنے کا تھا۔ (ایضاً: ص ۸۶۔۸۷)

سرسید کے جانشین مسلمانوں کو انگریز پرست بنا رہے تھے، شبلی نے اسے روکا۔ شبلی کے بعد محمد علی، ابوالکلام اور اقبال نے نظم ونثر کے ذریعے سے انگریز پرستی کا سد باب کیا اور آج چند ارباب غرض کے سوا مسلمانوں میں انگریز پرستی عام نہیں ہے۔ (ایضاً: ص ۸۹۔۹۰)

کارناموں میں تضاد:

سرسید کے تہذیبی اور ادبی کارنامے تقریباً نصف صدی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس عرصے میں انہوں نے قلابازیاں بھی کھائیں اور ان کی رائے بدلی بھی، اسی لئے بعض لوگوں کو ان کے کارناموں میں تضاد نظر آتا ہے...... شبلی اور مولانا طفیل احمد دونوں نے سرسید کی بعض غلطیوں کو مسٹر بیک اور بعض دوسرے انگریز حکام کے سر منڈھ کر سرسید کے گناہ کو ہلکا کرنا چاہا

ہے مگر دراصل سرسید ایک سوچی اور سمجھی ہوئی پالیسی رکھتے تھے، انہیں کوئی بہکا نہ سکتا تھا۔ ان کے کندھے پر رکھ کر انگریزی سامراج نے ۱۸۸۵ء کے بعد اپنی بندوق ضرور چھوڑی مگر جیسا کہ جواہر لال نہرو نے کہا ہے، قیصر باغ بارہ دری میں سرسید نے کانگرس کی مخالفت میں جو تقریر کی تھی اس کا مقصد انگریز پرستی یا ہندو دشمنی نہ تھا بلکہ ایک پس ماندہ طبقے کو نئے تعلیمی اور تہذیبی نظام سے فائدہ اٹھانے کا موقع دینا تھا۔ (ایضاً ص ۶٦)

خیال اور عملی نتائج میں فرق:

ان کا خیال یہ تھا کہ جب تک مسلمان نئی روشنی سے بہرہ مند ہو کر مغرب کے کمالات حاصل نہ کریں گے، اس وقت تک مہذب دنیا میں ان کا شمار نہ ہوگا۔ مگر سرسید کے خیال اور اس کے عملی نتائج میں فرق ہے۔ سرسید جو چاہتے تھے، وہ تو سمجھ میں آتا ہے مگر جو ہوا وہ اتنا واضح نہیں ہے۔ وہ اسلام اور سائنس کا ملاپ چاہتے تھے مگر سائنس مذہب پر غالب آ گئی۔ وہ عقائد کو اور مضبوط کرنا چاہتے تھے تا کہ نئی ایجادات کی روشنی سے نگاہیں خیرہ نہ ہوں، مگر عقائد ضعیف ہو گئے۔ وہ نئی تعلیم کو سرکاری ملازمت کا وسیلہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس سے قوم میں بیداری اور روشنی پھیلانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ نئی نسل انگریزی تعلیم سے مالا مال ہو کر قوم کو فائدہ پہنچائے گی۔ یہ نئی نسل پچھلی نسل سے زیادہ خود غرض، تنگ نظر اور سطحی ذہنیت کی شکار نکلی۔ وہ سید محمود کی ملازمت سے خوش نہ تھے مگر آخر راضی ہو ہی گئے۔ وہ عورتوں کی آزادی کے خلاف تھے، عورتیں آزاد ہونے لگی۔

(نئے اور پرانے چراغ: ص ۲۳۲)

سرسید نئی نسل کو ہندوستان کی قیادت سپرد کرنا چاہتے تھے۔ یہ خیال غلط نہ تھا لیکن انہوں نے نئی نسل کی صحیح تربیت پر توجہ نہ کی اور انہیں سرکاری ملازمت کی طرف دھکیل دیا۔

(انتخاب آل احمد سرور: ص ۸۵)

دیسی زبانوں میں تعلیم کی مذمت:

مذہب کے معاملے میں سرسید کی دانشوری اور روشن خیالی مسلّم ہے۔ علوم جدیدہ کی

تعلیم انگریزی کے ذریعہ سے دینا بھی غلط نہیں کہا جا سکتا لیکن دیسی زبانوں میں تعلیم کی مذمت کرنا، جس کے ایک زمانے میں سرسید اتنے حامی تھے کہ انہوں نے ورنیکلر یونیورسٹی کی ایک سکیم پارلیمنٹ کو بھیجی تھی، میرے نزدیک صحیح نہ تھا۔ دیسی زبانوں میں تعلیم، علوم شرقیہ کے لئے ایک کالج کا لاہور میں قیام جو جدید طرز تحقیق اور تدریس کو اپنائے، طلبا میں اپنی تہذیب، ادب اور تاریخ کا مشق کرنا بھی ضروری تھا۔ ایم اے او کالج ان کے اعصاب پر اس طرح سوار ہو گیا تھا کہ ہر نئے ادارے میں انہیں اس کے لئے خطرہ نظر آتا تھا۔

(فکر روشن ص ۱۵)

اپنی زبان میں تعلیمی منصوبے کا خود ہی ردّ:

سرسید نے اپنی زبان میں تعلیم کا جو منصوبہ بنایا تھا، اسے بعد میں انہوں نے خود رد کر دیا۔

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ اپریل ۱۹۹۸ء ص ۴۰)

لفظ ''قوم'' کے استعمال سے اصل مراد:

سرسید مذہب کی بنا پر قومیت کا تصور نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے قوم کا لفظ کسی برادری یا مذہبی برادری کے لئے بھی استعمال کیا ہے مگر اس سے غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کیونکہ بھارتیندو ہریش چندر نے بھی قوم کا لفظ مذہبی برادری کے لئے استعمال کیا ہے۔ جہاں ''نیشن'' کا لفظ سرسید استعمال کرتے ہیں وہاں ساری ہندوستانی قوم مراد ہے اس لئے ان کی مسلمانوں کی تہذیبی، تعلیمی، معاشرتی اور سیاسی ترقی کی جدوجہد قومی پس منظر کے اندر آ جاتی ہے۔ جواہر لال نہرو، ڈاکٹر تاراچند اور دوسرے روشن خیال حضرات نے اسی لئے سرسید کی تہذیبی اور تعلیمی کوششوں کو اس زمانے کی ضرورت کے مطابق اور قومی نقطہ نظر سے حق بجانب قرار دیا ہے۔

(فکر روشن ص ۶۵)

پان اسلامزم کی مخالفت:

سرسید پان اسلامزم کے مخالف تھے، جبھی تو جمال الدین افغانی نے ان پر طنز کے تیر

برسائے۔ ان کی بساط ہندوستانی تھی اور ان کا افق بھی ہندوستانی۔ وہ ایک سیکولر ذہن رکھتے تھے۔ ان کا یہ کہنا کہ ''دین چھوڑنے سے دنیا نہیں جاتی مگر دنیا چھوڑنے سے دین جاتا ہے''، نہایت معنی خیز ہے۔

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، مارچ اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۹۰)

سید ابوالاعلیٰ مودودی:

مذہبی مسائل میں مخلص گمراہ:

سر سید کے کام کو ''اصلاح'' اور تنقید عالی'' کے الفاظ سے تعبیر کرنا اور یہ کہنا کہ ''مسلمانوں میں ان کے بعد جتنی اہم مذہبی، سیاسی، اجتماعی، ادبی و تعلیمی تحریکیں اٹھیں، ان سب کا سررشتہ کسی نہ کسی طرح ان سے ملتا ہے'' دراصل مغالطہ کی حد سے بھی بہت متجاوز ہے۔ سچ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے اب تک جس قدر گمراہیاں مسلمانوں میں پیدا ہوئی ہیں، ان سب کا شجرہ نسب بالواسطہ یا بلاواسطہ سر سید احمد صاحب کی ذات تک پہنچتا ہے۔ وہ اس سرزمین میں تجدد کے امام اول تھے اور پوری قوم کا مزاج بگاڑ کر دنیا سے رخصت ہوئے۔

(ترجمان القرآن لاہور، جنوری ۱۹۴۱ء، بحوالہ ادبیات مودودی ص ۲۵۷۔۲۵۸)

مذہبی لحاظ سے انہوں نے بہت سی ٹھوکریں کھائیں اور کئی مسائل میں ان کی تحقیق ناقص تھی ...... مذہبی مسائل میں وہ گمراہ ہوئے لیکن ان کی نیت اخلاص پر مبنی تھی۔ وہ بدنیت گمراہ نہیں بلکہ مخلص گمراہ تھے...... سابقہ مفسرین میں سے اگر بعض نے ایک ایک غلطی کی ہے تو سر سید نے چن چن کر ان تمام غلطیوں کو جمع کر کے ایک مجموعہ مرتب کر دیا۔ انہیں یہ شوق تھا کہ مسائل کو عقل کے مطابق بنانے کے لئے ان کی ایسی تفسیر لکھی جائے جسے سب مان لیں۔ اس کے لئے سر سید نے نئے طرز کی Interpretation (ترجمانی ...... ناقل) طریقہ معتزلہ سے سیکھا۔ فرق یہ ہے کہ معتزلہ فقط یونان و روم کی علمی دھاک سے مغلوب تھے، سر سید علمی اور سیاسی دونوں لحاظ سے مغلوب تھے چنانچہ اس دہرے دباؤ میں آکر انہوں نے اپنی تفسیر لکھی جس کا نتیجہ ظاہر ہے۔

(۵۔اے ذیلدار پارک، جلد دوم ص ۲۱۹۔۲۲۰)

اسلام کے نام سے اسلام کی قید سے آزاد سوچ:

بعض لوگ لفظ مسلمان سے دھوکا کھا کر اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ اصل سوال اسلام کے احیا (Revival) کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے احیا کا ہے، یعنی یہ قوم جو مسلمان کے نام سے پائی جاتی ہے، اس کو ایک زندہ اور طاقتور قوم بنانا اور برسر عروج لانا اصل مقصود ہے اور اسی کا نام اسلام کا احیا ہے..... جب یہ ان کا مقصد قرار پایا تو انہوں نے معاملات کو اس نظر سے دیکھنا شروع کیا کہ کون سی تدابیر اس مقصد تک پہنچنے میں مددگار ہو سکتی ہیں، اور جو تدبیریں بھی ان کو دنیا میں قومی عروج کے لئے مفید و کارگر نظر آئیں، ان کو بے تکلف انہوں نے استعمال کرنا شروع کر دیا خواہ وہ اسلام سے ان کو کتنی ہی دور لے جانے والی ہوں۔ یہ ذہنیت سرسید احمد خاں کے وقت سے آج تک مسلمانوں کے اکثر و بیشتر رہنماؤں، کارکنوں اور اداروں پر مسلط ہے۔ اسلام کے نام سے جو کچھ سوچا جا رہا ہے، مسلمانوں کے لئے سوچا جا رہا ہے اور اسلام کی قید سے آزاد ہو کر سوچا جا رہا ہے۔

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، حصہ سوم: ص ۱۲۰)

علما اور انگریزی تعلیم:

ہمیں..... اس خیال سے اتفاق نہیں ہے کہ علما نفسِ علوم جدیدہ کے مخالف ہیں اور ان علوم کو دہریت و الحاد پیدا کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں..... علمائے ہند کے سرخیل حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے اُس زمانہ میں مسلمانوں کو علوم جدیدہ کی طرف توجہ دلائی تھی جب سرسید احمد خاں شاید پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اور ہندوستان میں کسی شخص کو اس ضرورت کا احساس نہ تھا۔ شاہ صاحب کی دوررس نگاہوں نے اُسی وقت دیکھ لیا تھا کہ ہندوستان پر ایک حکیم قوم مسلط ہو رہی ہے اور اس حکیم کا مقابلہ حکمت ہی سے کیا جا سکتا ہے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کے غدر سے پہلے دہلی کالج میں جب علوم جدیدہ کی ابتدائی تعلیم شروع ہوئی تھی تو علما میں سے کسی نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کو علما کو حکمت کی تعلیم سے کبھی اختلاف نہ تھا، نہ آج ہے۔ اصل چیز جس کے وہ مخالف تھے اور آج بھی مخالفت پر مجبور ہیں، وہ

طرز تعلیم ہے جو انگریزی حکومت نے اپنی اغراض کے لئے رائج کیا ہے۔

(ترجمان القرآن حیدرآباد دکن رجب ۱۳۵۶ھ بحوالہ ادبیات مودودی ص ۲۰۰۔۲۰۱)

انیسویں صدی کے آخر میں جدید تعلیم کی اشاعت کے لئے جو تحریک خود مسلمانوں کی طرف سے اٹھی، اُس کے دنیوی اور مادی فوائد سے کسی کو انکار نہیں مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو طرز تعلیم علی گڑھ اور دوسری درسگاہوں میں اختیار کیا گیا، وہ ایک خفیف سی ترمیم کے ساتھ اُسی طرز تعلیم کا چربہ تھا جو انگریزی حکومت نے رائج کیا تھا۔ اس کی مخالفت علما نے اس بنا پر نہیں کی کہ انگریزی زبان کیوں پڑھائی جاتی ہے یا علوم جدیدہ کی تعلیم کیوں دی جاتی ہے مگر مخالفت کا اصلی سبب یہ تھا کہ اس میں انگریزی زبان کے ساتھ فرنگی ذہنیت بھی بطور جزو لازم کے شریک کی گئی، اور علوم جدیدہ کی تعلیم میں وہی نقطہ نظر اختیار کیا گیا جو انگریزی حکومت کی رائج کردہ تعلیم میں اساس و اصل کی حیثیت رکھتا تھا۔ (ایضاً ص ۲۰۲)

سید ابوالحسن علی ندوی

یورپ سے مرعوبیت اور مادی رجحان کا فکری انتشار:

وہ ایک ذہین، نہایت ذکی الحس، سریع الانفعال اور دردمند قسم کے آدمی تھے۔ انہوں نے متوسط درجہ کی دینی تعلیم پائی تھی اور دینی علوم اور کتاب و سنت پر ان کی نظر گہری اور وسیع نہ تھی، جلد رائے قائم کر لینے اور جرأت کے ساتھ اس کا اظہار کرنے کے عادی تھے۔ وہ انگریزوں سے اس طرح متاثر ہوئے جس طرح کوئی مغلوب غالب سے یا کوئی کمزور طاقت ور سے متاثر ہوتا ہے ...... سرسید نے فرانس اور انگلستان کو اس وقت دیکھا جس وقت وہ اپنے تمدن و ترقی کے شباب پر تھے، جدید علوم اور جدید صنعت اپنے عروج پر تھی، اس وقت مغربی معاشرہ اور سوسائٹی میں زوال و انحطاط کے وہ آثار نمودار نہیں ہوئے تھے جو جنگ عظیم اول کے بعد اہل نظر کو صاف نظر آنے لگے تھے...... وہ اس تہذیب اور معاشرہ سے اس طرح متاثر ہوئے کہ ان کے دل و دماغ، اعصاب اور ساری فکری صلاحیتیں اس سے وابستہ ہو گئیں ...... ان کا نقطۂ نظر خالص مادی ہو گیا۔ وہ مادی طاقتوں اور کائناتی قوتوں کے سامنے بالکل سرنگوں نظر آنے لگے۔

وہ اپنے عقیدہ اور قرآن مجید کی تفسیر بھی اسی بنیاد پر کرنے لگے۔ انہوں نے اس میں اس قدر
سے کام لیا کہ عربی زبان ولغت کے مسلمہ اصول وقواعد اور اجماع وتواتر کے خلاف کہنے میں بھی
ان کو باک نہ رہا، چنانچہ ان کی تفسیر نے دینی وعلمی حلقوں میں سخت برہمی پیدا کر دی یہ انتہا
پسندانہ مادی رجحان، عقلِ انسانی کی تقدیس اور اس کے حدود اور دائرہ عمل کی ضرورت سے
زائد توسیع، خدا کی قدرت ومشیت کو قوانین فطرت اور اسباب ظاہری کی پابند سمجھنا، قرآن کی
جسارت کے ساتھ تاویل وتشریح وہ چیزیں تھیں جنہوں نے ایک نئے فکری انتشار اور بے راہ
روی اور بے باکی کا دروازہ کھول دیا اور آگے چل کر لوگوں نے اس کے ایسا غلط فائدہ اٹھایا کہ
دین کی تشریح اور قرآن کی تفسیر بازیچۂ اطفال بن گئی۔

(مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش ص۹۶تا۱۰۰)

نظام تعلیم ''جوں کا توں درآمد:

انہوں نے اس نظامِ تعلیم کو (جس کو مغرب میں آخری شکل دی گئی تھی) ہندوستان
کے مسلم معاشرہ کے حالات اور تقاضوں کا پابند وماتحت نہیں بنایا، جہاں اس کو نافذ کرنا تھا۔
انہوں نے اس کو نئے سرے سے ڈھالنے اور اسلامی شکل دینے پر غور نہیں کیا، نہ اس کو مغربی
تمدن اور اس کی اس مادی روح سے پاک کرنے کی طرف کوئی توجہ کی جس کی ایک مشرقی
اسلامی ملک کو ضرورت نہ تھی۔ انہوں نے اس نظام کو مغرب سے اس کی ساری تفصیلات،
خصوصیات، اس کی روح ومزاج اور اس ماحول وروایات کے ساتھ، جو اس سے وابستہ تھیں،
جوں کا توں ''درآمد'' کیا۔ انہوں نے صرف مغرب کے تعلیمی نظام ہی پر اصرار نہیں کیا بلکہ مغربی
تمدن اور روح کے قبول کرنے پر بھی شدید اصرار کیا۔ (ایضاً: ص۱۰۱)

دینی حلقوں کی طرف سے مخالفت کا اصل پس منظر:

سر سید کی دعوت اور تعلیمی نظریہ مغربی تہذیب کی دعوت کے ساتھ لازم وملزوم سا
ہو گیا اور اس وجہ سے اس کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں بہت سے شبہات پیدا ہو گئے،
دینی حلقوں میں اس کے خلاف نفرت وبیزاری کی ایک لہر دوڑ گئی اور اس تحریک کے ساتھ اس

کے مقاطعہ اور بائیکاٹ کی تحریک بھی شروع ہوئی، اور اس نے اس کے راستہ میں بہت سی غیر ضروری مشکلات پیدا کردیں۔ علمائے دین نے جو انگریزی تعلیم اور مفید علوم کے حصول کے ابتدا میں مخالف نہ تھے، یہ دیکھ کر کہ یہ تحریک ابتدا ہی سے غلط رخ پر پڑگئی ہے اور اس میں بہت سے غیر ضروری اور غلط عناصر شامل ہوگئے ہیں۔ انہوں نے اس کی مخالفت میں پوری سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ دوسری طرف ان اثرات اور مغربی ماحول کی وجہ سے، جو کالج پر چھایا ہوا تھا، ایک ایسی اسلامی نسل پیدا ہوئی جو نام کے لحاظ سے مسلمان اور ذہن و دماغ کے لحاظ سے خالص مغربی تھی، معاشرت وتمدن میں انگریزی طور وطریق کی پابند اور حامی، عقائد میں بعض اوقات کمزور اور متزلزل۔ (ایضاً ص۱۰۱۔۱۰۲)

علما پر انگریزی زبان کی مخالفت کا غلط الزام

جہاں تک انگریزی زبان اور جدید علوم کی ضرورت کا تعلق ہے، اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے اور اس کو بہت سے اہل قلم لکھ چکے ہیں کہ علمانے اس کی یکسر مخالفت نہیں کی اور نہ اس بنا پر کسی نے سرسید مرحوم کی تکفیر وتفسیق کی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب انگریزی زبان کے سیکھنے کے جواز کا فتویٰ دے چکے تھے۔ سرسید کے شدید ترین مخالفین نے بھی کبھی اس کی حرمت کا اعلان نہیں کیا تھا، لیکن سرسید مرحوم کی تحریک خالص تعلیمی تحریک مغربی زبانوں اور جدید علوم کے حصول کی دعوت نہیں تھی... اس میں چند ایسے اجزا وعناصر شامل ہوگئے جو نہ صرف یہ کہ اس تحریک کو کامیاب اور مقبول بنانے کے لئے ضروری نہ تھے بلکہ اس کے لئے مضر اور اس کی کامیابی کی راہ میں حائل ہوگئے تھے اور انہوں نے مسئلہ کو ایسا پیچیدہ بنادیا کہ اچھے اچھے وسیع الخیال اور انصاف پسند علما کو بھی اس کے بارے میں اپنا رویہ اور پالیسی متعین کرنے کی راہ میں مشکلات پیدا ہوگئیں اور لسان العصر میر سید اکبر حسین الہ آبادی اور مولوی امداد علی کو بھی کلی یا جزوی مخالفت پر مجبور ہونا پڑا اور عقائد وتحقیقات میں ان کے مخلص ترین رفیق ومؤید نواب وقار الملک مرحوم بھی ان کے ہم نوا نہ تھے۔

(بحوالہ القاسم نوشہرہ، اگست ۱۹۹۹ء ص۸۔۹)

ابوالکلام آزاد

نیچریت سے الحاد تک:

والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ گمراہی کی موجودہ ترتیب یوں ہے کہ پہلے وہابیت، [illegible] نیچریت۔ نیچریت کے بعد تیسری قدرتی منزل، جو الحاد قطعی ہے، اُس کا وہ ذکر نہیں کرتے [illegible] اس لیے کہ وہ نیچریت ہی کو الحاد قطعی سمجھتے تھے۔ لیکن میں تسلیم کرتے ہوئے اتنا اضافہ کرتا ہوں کہ تیسری منزل الحاد ہے اور ٹھیک ٹھیک مجھے یہی پیش آیا۔ سرسید مرحوم کو بھی پہلی منزل وہابیت ہی کی پیش آئی تھی۔ اصل یہ ہے کہ عقائد و فکر کی توسیع و تطور کے لیے پہلی چیز یہ ہے کہ تقلید [illegible] بندشوں سے پاؤں آزاد ہوں۔ وہابیت اس زنجیر کو توڑتی ہے۔ اب اگر اس کے بعد آزادی [illegible] بے قیدی و مطلق العنانی کی صورت اختیار کرلے تو بلاشبہ یہ نہایت مضر صورتیں بھی اختیار کر [illegible] ہے۔ سرسید کی تصنیفات جب نظر سے گزریں تو بالکل ایک نئی دنیا نظر کے سامنے آگئی۔ طبیعت چونکہ موجودہ و سابقہ حالات سے بالکل متوحش ہو چکی تھی اور ماحول میں کوئی غالب مؤ[illegible] موجود نہ تھا اس لیے قدرتی طور پر اس نئے عالم کی دلفریبیوں نے مسحور کر لیا۔ جوں جوں بڑھتا گیا، مسحوریت بھی بڑھتی گئی حتیٰ کہ اب ایک مسمریزم کے معمول کی طرح میری دماغی فعالیت بالکل عامل کے قبضہ میں تھی۔ تقریباً چھ مہینے کے اندر میں نے سرسید کی تمام کتابیں دیکھ ڈالیں اور اچانک ایسا معلوم ہوا کہ ایک بے حد عجیب و دلکش اور بلند تر پُر عظمت عالم میں آگئے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بالکل ایک مخمور دماغ کی سی حالت رہنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک عجیب و غریب مخزن قبضے میں آگیا ہے۔ اس پر فخر تھا، غرور تھا اور اس کے سامنے فکر و نظر کی تمام پچھلی باتیں ہیچ نظر آتی تھیں۔ میں نے "ہیچ" کہا لیکن یہ ابتدائی احساس تھا۔ بعد [illegible] یوں ہوا کہ حقارت کی جگہ ان کی ذلت کا احساس ہونے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی [illegible] اسلام کی اصل حقیقت یا سرسید کی اصطلاح میں "نیچرل" اسلام سے آشنا نہیں۔ قرآن کے [illegible] حقائق و معارف اور مذہب کی اصلی تعلیمات تو وہ ہیں جن کے [illegible] [illegible]

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ انسان تقلید سے کبھی باز نہیں آتا۔ ترکِ تقلید ہی کے نام پر وہ جن شخصوں کی عزت کرتا ہے، ان ہی کی تقلید شروع کر دیتا ہے۔ میں نے سرسید سے سب سے بڑی چیز، جو اس وقت پائی تھی، وہ یہی ترکِ تقلید تھی۔ مفسرین کی، فقہا کی، محدثین کی، متکلمین کی، تمام علما کی، تیرہ سو برس کے تمام اجماعی عقائد و مسلمات کی، اور ان کروڑوں اور ان گنت مسلمانوں کی جو تیرہ صدیوں میں گزر چکے۔ تاہم میں خود سرسید کا نہ صرف مقتدا ہی تھا بلکہ تقلید کے نام سے پرستش کرتا تھا!

(آزادی کی کہانی، خود آزادی کی زبانی ص ۳۶۸۔ ۳۷۱)

یہ نشہ سال بھر تک خوب زوروں پر رہا لیکن اس کے بعد ہی خمار شروع ہو گیا۔ اچانک وہ منزل نمودار ہو گئی جو اس منزل کے بعد قدرتی طور پر پیش آنے والی تھی۔ مسلک سرسید کی جدت و غرابت کا اثر دھیما پڑا اور جو کیفیت ایک نئے نئے جوش کی سی پیدا ہو گئی تھی، جو نہی وہ طبعی سکون کی حالت میں آ گئی، دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا اور اپنی صحیح حالت محسوس کرنے لگا۔ سرسید کے مسلک نے پوری طرح تمام پچھلی خوش اعتقادیاں اور تقلیدی عقائد بیخ و بن سے اکھاڑ دیئے تھے اور ذہن کو وادیِ مذہب میں ہر طرح کی آزادی و جولانی کا خوگر بنا دیا تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ شکوک و کاوش نے اور مزید وسعت اختیار کی اور سرسید کی ابتدائی بلند پروازیاں بھی وہاں ساتھ دینے سے درماندہ رہ گئیں۔ سرسید کی رہنمائی نے اس منزل تک پہنچا دیا تھا کہ اہل مذاہب کے دعاوی و عقائد اس رنگ و شکل میں، جو عام طور پر تسلیم کئے جاتے ہیں، محض وہم و خیال ہیں اور اصلیت کچھ دوسری ہے۔ لیکن اب یہ منزل سامنے آئی کہ عقائد کے جتنے حصے کو سرسید بھی منوانا چاہتے ہیں، وہ بھی وہم و خیال کیوں نہ ہو؟ وجود باری، ذات و صفات، بقائے روح، وحی و الہام، نبوت، شرائع و ادیان، کیوں نہ یہ سب بھی ناقابلِ تسلیم و اعتراف ہوں؟

(ایضاً: ص ۳۹۰۔ ۳۹۱)

سرسید کے مذہبی مسلک سے طبیعت اچاٹ ہو گئی اور جو دروازہ انہوں نے کھول دیا تھا، اُس نے بالآخر شک و اضطراب کی ایک نئی راہ میں پہنچا کر الحاد و انکار تک پہنچا دیا۔ ابتدا میں شکوک، پھر مذہبی تاویلات کا استغراق اور ایک فلسفیانہ مذہب کا ادعا، پھر مزید اضطراب و جستجو

اور اس سے الحاد و انکار کا ظہور اور بالآخر ایک سخت اضطراب و یاس کا جماؤ۔ (ایضاً ص…)

تاویل الجاہلین کا فتنہ:

ابھی نہ تو مسلمانوں میں نئے علوم کی بنا پر کوئی نیا چرچا پھیلا تھا، نہ شک و شبہات ہوئے تھے۔ محض چند لوگ تھے جنہوں نے نہ تو یورپ کی کوئی زبان پڑھی تھی، نہ علوم مادیہ واقفیت حاصل کی تھی۔ صرف سنی سنائی باتوں اور مقلدانہ جوش عقیدت و حسن ظن بہ (وجمیع ماینسب الیہ) سے اپنے جی میں شکوک و شبہات پیدا کئے اور پھر خود ہی شروع کر دیا کہ علوم جدیدہ نے اسلام کا خاتمہ کر دیا، اس کے سیلاب نے مسلمانوں کے صد سالہ عقائد زیر و زبر کر دئے، اب بجز اس کے چارہ نہیں کہ اسلامی عقائد میں از سر نو تنسیخ کی جائے، پچھلے کیل پرزے نکال کر ایک نیا کارخانہ ڈھالا جائے: ع

خواہم کہ دگر بت کدہ سازند حرم را!

نتیجہ یہ نکلا کہ شکوک و شبہات خود تو ابھی نہیں آئے تھے مگر ان لوگوں نے بلا وے بھیج کر بلا لئے اور یہ کہہ کہہ کر کہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان مذہب کو خیر باد کہہ دیتے ہیں، سچ مچ پوری نئی نسل کو شکوک و شبہات غرق کر دیا۔ کیا کوئی شخص آج ثابت کر سکتا ہے کہ جس زمانے میں سرسید خاں مرحوم نے پہلے پہل یہ صدائیں بلند کی ہیں اور اول اول "تہذیب الاخلاق" نکالا۔ اس وقت واقعی کتنے مسلمان تھے جو انگریزی پڑھ کر دہریئے ہو گئے تھے، اور ان کی گمراہی نے مرحوم کو مجبور کیا تھا کہ جدید اجتہاد شروع کر دیں؟ یا انہوں نے ہاتھ جوڑ کر منتیں کی تھیں کہ خاطر "تاویل الجاہلین و تحریف الغالین و انتحال المبطلین" کا فتنہ تازہ کر دیجئے؟

(تذکرہ ص…)

سرسید کی سیاسی رہنمائی، ان کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی:

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے مسلمان بحیثیت جماعت کے ملک کی تمام سرگرمیوں سے الگ تھے۔ صرف الگ ہی نہیں تھے بلکہ سیاسی بیداری کے ہر مطالبہ کے مخالف تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس اپنی زندگی کی تمام ابتدائی منزلوں سے گزر چکی تھی مگر خالص

افراد کے سوا مسلمانوں کا اس میں کوئی حصہ نہ تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے مسلمانوں کا ایک سیاسی نظام قائم ہو چکا تھا لیکن وہ بھی اس لئے قائم نہیں ہوا تھا کہ مسلمانوں میں سیاسی سرگرمی پیدا کرے، بلکہ اس لئے کہ سیاسی سرگرمیوں سے انہیں باز رکھے۔ اُس دور کے مسلمانوں کی سیاست محض ایک منفی سیاست تھی جو ہر مثبت اثر سے اپنے آپ کو بچانا چاہتی تھی، اور جس کی صحیح تعبیر سیاست کے عدم یا سیاست کے تعطل ہی سے کی جاسکتی ہے۔ یہی سیاسی تعطل تھا جسے اسی وقت کی بول چال میں ''مسلمانوں کی مسلمہ قومی پالیسی'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے اس سیاسی تعطل کے لئے اگر چہ مختلف اسباب جمع ہو گئے تھے لیکن اس کی سب سے بڑی ذمہ داری مرحوم سر سید احمد خاں کی سیاسی رہنمائی پر تھی ..... انہوں نے ۱۸۸۶ء میں مسلمانانِ ہند کو نہ صرف کانگرس سے علیحدہ رہنے کا مشورہ دیا بلکہ سیاسی حقوق کے تمام مطالبوں کی مخالفت پر آمادہ کر دیا..... میرے لئے ناگزیر ہو گیا تھا کہ سر سید مرحوم کی اس سیاسی رہنمائی پر بلا رو و رعایت نکتہ چینی کروں ..... میں نے اگر اختلاف کیا تھا تو اُن کے ایک خاص طرزِ عمل سے کیا تھا اور بلاشبہ میں اسے ان کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی تصور کرتا تھا۔ اس طرزِ عمل پر اُنہیں کس طرح آمادہ کیا گیا؟ کون سی قوتیں تھیں جو پس پردہ کام کرنے لگی تھیں؟ اس کا حال ہم سب کو معلوم ہو چکا ہے۔ یہ کالج کا انگلش سٹاف تھا جو مسٹر بیک کی سرکردگی میں سر سید مرحوم پر چھا گیا تھا، اور وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن اور صوبے کے لفٹنٹ گورنر سر آک لینڈ کالوِن کی پشت گری اسے حاصل تھی..... میں سر سید مرحوم کی سیاسی رہنمائی کو ان کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی یقین کرتا ہوں۔

(بحوالہ مولانا آزاد، سر سید اور علی گڑھ: ص ۳۰۰ تا ۳۰۲)

لفظ ''ہندو'' کا اصل مفہوم:

اگر چہ سر سید مرحوم نے ملک کی سیاسی تحریک کی مخالفت کی تھی لیکن ان کی مخالفت میں ہندو مسلم سوال کا کوئی رنگ نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی مخالفت کی سرگرمیوں میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو یکساں طور پر شریک کیا تھا..... ہندوستانی قومیت کے متعلق ان کا جو خیال تھا اس کا اندازہ ہم اس سے لگا سکتے ہیں کہ ''ہندو'' لفظ کا مفہوم ان کے ذہن میں کیا تھا؟ لاہور کی

[illegible]

[illegible]

۱۱ ڈاکٹر ابو سفیان اصلاحی

[illegible]

ایک ہندو انجمن کے ممبروں کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا:

''مجھے افسوس ہے کہ آپ نے ہندو کے معنی بہت محدود کردئے۔ آپ نے اس کا اطلاق ایک خاص گروہ پر کیا ہے، مگر میری رائے میں یہ اطلاق صحیح نہیں ہے۔ میں ان تمام لوگوں کو، جو ہندوستان کے باشندے ہیں، ہندو تصور کرتا ہوں خواہ وہ کسی نسل اور کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نہایت خوشی اور فخر کے ساتھ اپنے آپ کو ہندو سمجھتا ہوں۔'' (ایضاً ص ۳۰۳۔۳۰۴)

ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی

سرسید کی تفسیر طاقِ نسیاں کی زینت:

قرآن حکیم کی تفسیر میں عقائد واحکام کی عقلی تعبیرات کرکے سرسید احمد خاں نے ایک بڑے تسامح کا ارتکاب کیا۔ اس تسامح کا عملی جواب اُمت مسلمہ کی طرف سے ان کو یہ ملا کہ ان کی تفسیر کو اس حد تک ناقابل اعتنا گردانا گیا کہ وہ طاقِ نسیاں کی زینت بن کر رہ گئی۔

(فکر ونظر علی گڑھ، سرسید نمبر ۱۹۹۲ء: ص ۴)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

مجاہدین کو غدار اور باغی قرار دینے والے:

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی.....کو ہماری تاریخوں میں غدر، سرکشی اور بغاوت کے ناموں سے پکارا گیا اور مجاہدین کو باغی، غدار اور سرکش قرار دیا گیا۔ جنگ آزادی کی تاریخ یا تو ان بددیانت اور متعصب انگریز مؤرخین نے لکھی تھی جو ۱۸۵۷ء سے پہلے کی اپنی بے عنوانیوں اور ۱۸۵۷ء کے بعد اپنے انتقام کی بھیانک داستانوں کو اس آڑ میں چھپانا چاہتے تھے، یا پھر ایسی تاریخیں اُن غلامانِ ازلی سے لکھوائی گئیں جنہوں نے اپنی ''پلاؤ کی رکابی'' کے لئے اپنے ملک سے غداری کی، جنہوں نے دربار میں کرسی کے لئے خود اپنوں کا گلا کٹوایا یا جنہوں نے چند نقرئی سکوں کے لئے اپنے آقاؤں سے بڑھ کر مجاہدین کو غدار اور باغی ثابت کرنے کی کوشش کی۔

(اسباب بغاوت ہند مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ: ص ۱۱)

جہاد کے بارے میں خیالات:

جہاد کے بارے میں سرسید احمد خاں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ہمیں اتفاق نہیں۔ یہ سچ ہے کہ بعض علما نے ۱۸۵۷ء کی تحریک کو درست ماننے سے انکار کردیا تھا لیکن بعض علما ایسے تھے جو اسے صحیح سمجھتے تھے۔ انہوں نے فتووں پر دستخط کئے اور آخر تک اس پر قائم رہے۔ (ایضاً ص ۴۷)

ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی

اسلام کی بنیادیں ہلا دینے والے ''بے مثال سچے اسلامی جذبات''!

سرسید نے اپنی پوری زندگی اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے میں بسر کردی۔ گو کہ اُن سے بہت سی اجتہادی غلطیاں بھی واقع ہوئی ہیں اور یہ غلطیاں ایسی ہیں کہ بظاہر اُن سے اسلام کی بنیادیں ہل جاتی ہیں لیکن سرسید کو پڑھنے والے جانتے ہیں کہ اسلام کے تئیں ان کے دل میں جو سچے جذبات تھے، اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

(فکر و نظر علی گڑھ، سرسید نمبر ۱۹۹۲ء: ص ۱۸۷)

تفسیرِ سرسید کے خیالات غیر اسلامی بھی اور بے شمار خوبیوں کے حامل بھی:

تفسیر سرسید کا معروضی انداز سے مطالعہ کیا جائے تو یہ ضرور کہا جائے گا کہ جنت و جہنم، ملائکہ، اجنہ اور شیاطین وغیرہ کے متعلق جس قدر خیالات تفسیرِ سرسید میں ہیں، وہ قدما کے یہاں موجود ہیں۔ اسی طرح یہ بھی برملا کہا جائے گا کہ معجزات اور اس طرح کے تمام خیالات غیر اسلامی ہیں۔ لیکن ان ''چند'' اختلافی مسائل کو لے کر تفسیرِ سرسید کی بے شمار خوبیوں سے آنکھیں بند کر لینا صداقت و دیانت کے برخلاف ہے...... اس تفسیر کے اور بھی بہت سے خصائص ہیں لیکن افسوس کہ نیچریت اور قانونِ فطرت کے طواف میں لعل و گہر سے آنکھیں بند کر لی گئیں۔

(تہذیب کراچی، مارچ ۲۰۰۵ء: ص ۱۱-۱۲)

تفسیرِ سرسید کے بہت سے گوشے غیر معمولی حد تک خطرناک ہیں، وہیں بہت سے

نکات قابلِ ستائش بھی ہیں۔ (ایضاً، اپریل ۲۰۰۵ء، ص ۳۹)

تفسیرِ سرسید کا عربی ترجمہ کرنے سے مولانا فراہی کا صاف انکار:

آپ کی عربی زبان میں مہارت تامہ اور قرآنیات میں کامل دستگاہ کو دیکھتے ہوئے سرسید کو خواہش ہوئی کہ مولانا فراہی سے اپنی تفسیر کو عربی میں منتقل کرنے کو کہا جائے۔ چنانچہ جب کچھ اساتذہ نے سرسید کی اس خواہش کا اظہار مولانا فراہی کے سامنے کیا تو انہوں نے بڑے صاف لفظوں میں یہ کہہ دیا کہ میں اسے عربی میں منتقل کر کے معصیت میں حصہ نہیں لینا چاہتا۔ (ایضاً ستمبر ۲۰۰۴ء، ص ۲۵)

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری

دینی فکر کی تضحیک و تمسخر:

یہ بات دو اور دو چار کی طرح واضح ہے کہ اس صدی کی بے دینی، مذہبی بے راہ روی اور بدعقیدگی کے تمام ڈانڈے سرسید سے ملتے ہیں۔ دور جانے کی ضرورت نہیں، پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام اور اسلامی شعائر کے احیا میں سے بڑی رکاوٹ وہ حضرات ہیں جو سرسید کے مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ سرسید کے دو دشمن تھے، ایک انگریز کے مخالف اور برصغیر کی آزادی کے خواہاں، دوسرے علمائے دین۔ اور تاریخ مسلمانان ہند کا یہ عجیب اتفاق ہے کہ علمائے دین ہی انگریزوں کے سب سے پہلے مخالف تھے۔ سرسید نے دونوں حیثیتوں سے علمائے دین کو کبھی معاف نہیں کیا۔ تفسیر کے دینی مباحث میں، ادب کے سنجیدہ مضامین میں، تمثیلوں اور تجزیوں میں انہوں نے انگریز کے ان دشمنوں کو اپنی مخالفت، طنز و تعریض اور تضحیک و تمسخر کا نشانہ بنایا۔ انگریز سے دوستی اور اس کے مخالفوں کی دشمنی سرسید کا مذہب تھا۔ کوئی شخص انگریز سے دشمنی کر کے سرسید کا دوست نہیں بن سکتا تھا، گویا یہ دو تلواریں تھیں جو سرسید کے میان قلب میں جگہ نہ پا سکیں۔ اسی طرح مذہبی حیثیت میں انگریز کے ان دشمنوں کی مخالفت اور طنز و تعریض ان کا دین بن گیا تھا۔ دینی معتقدات پر ایمان رکھنے والے اور انہیں بیان کرنے

والے ان کے نزدیک ''کوڑ مغز مُلاّ'' اور ''قل اعوذ یئے'' تھے اور زہد و ورع کی زندگی اختیار کرنے والے کے لئے انہوں نے ''شہوت پرست زاہد'' کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

(سر سید کی کہانی، ان کی اپنی زبانی ص ۴۳)

انہوں نے اسلامی معتقدات کی ایسی تاویل کی کہ پورا نظام عقائد درہم برہم ہو گیا۔ ان کے لئے ایسا اسلوب اختیار کیا کہ پھر انہیں مانتے ہوئے شرم محسوس ہونے لگی اور مخالفین اسلام کے حملوں کے دفاع کے لئے ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں رہا۔ دینی علم و سیرت رکھنے والوں کے خلاف انہوں نے طنز و تعریض اور تضحیک و تمسخر کے اتنے تیر برسائے اور ان کے پاکیزہ چہروں کو ایسا مسخ کر کے پیش کیا کہ لوگوں کے قلوب ان کی عقیدت و محبت کے جذبات سے خالی ہو گئے۔ (ایضاً: ص ۴۴)

بانیانِ آزادی میں شمار کرنے والوں سے چند سوال:

جو لوگ سر سید کو بانیان آزادی میں شمار کرتے ہیں، انہیں سر سید کے ان بیانات و ملفوظات پر غور کرنا چاہیے اور اس پہلو پر بھی نظر ڈال لینی چاہیے کہ حقیقی بانیان آزادی اور سرفروشان قوم اور جاں نثاران وطن سلطان ٹیپو، سراج الدولہ، بہادر شاہ ظفر وغیرہ کے بارے میں ان کے خیالات کیا تھے؟ اور اس کے برعکس غداران وطن جعفر و صادق وغیرہ کی سیرت اور عقل و فراست اور ان کی ملی بہی خواہی کو انہوں نے جو خراج تحسین پیش کیا ہے، کس سے چھپا ہوا ہے؟ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے مجاہدین کو وہ کون سی گالی ہے جسے سن کر دلی کے شرفا نگاہیں نیچی نہ کر لیں اور سر سید نے تحریر نہ کر دی ہو؟ انگریزوں کی حکومت کو استحکام بخشنے کے لئے انہوں نے تحریر و تقریر کی کسی صلاحیت کو نہیں آزمایا؟ ''لائل محمڈنز'' ان کے نزدیک ملک و قوم کی علمی، تعلیمی، سماجی خدمات انجام دینے والے تھے یا ۱۸۵۷ء میں اور بعد میں ملک و قوم کے جذبات کے خلاف انگریزوں کی حکومت کی جڑیں مضبوط کرنے والے ملک و قوم کے غدار تھے؟ ۱۸۹۸ء میں اپنی وفات تک علی گڑھ کالج کے طلبہ میں حریت پسندی کے جذبہ کو دبا دینے کی کوشش میں انہوں نے کون سی کسر اٹھا رکھی تھی؟...... ان عظیم الشان خدمات اور بلند خیالات کے بعد بھی سر سید کو بانیانِ آزادی میں شمار اور آزادی کی تاریخ میں سب سے اونچا مقام دیا جا سکتا ہے؟ (ایضاً: ص ۴۲-۴۳)

حسن خدمات کے نام پر ''غداریٔ وطن'' کا صلہ:

زمانہ سازی اور وقت شناسی سرسید کو ان کے نانا سے وراثت میں ہی ملی تھی۔ ان کے نانا نے سلطنت مغلیہ کی بہی خواہی کے پردے میں انگریزوں کی خدمات سرانجام دی تھیں۔ سرسید نے اپنے عہد میں ٹھیک ٹھیک وہی کردار مسلمانوں کی بہی خواہی کے نام پر ادا کیا۔ (ایضاً: ص ۳۱)

انگریزوں کا ساتھ انہوں نے وقت کی کسی مجبوری کی بنا پر نہ دیا تھا، اس کا تعلق وقت شناسی کے اس جوہر سے تھا جو اُن کا خاندانی ورثہ تھا۔ سرسید نے مغلیہ حکومت کی زوال پذیری، ملک کی عام حالت، مجاہدین آزادی کی بے نظمی، تحریک کی لامرکزیت کو محسوس کر کے اور مغلیہ حکومت کے انگریز ٹھیکے داروں (ایسٹ انڈیا کمپنی) کے نظم و جمعیت اور ان کی منظم اور بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ پھر اس راہ کے جو تقاضے تھے، وہ انہوں نے پورے کئے اور رسم وفا کو نباہا۔ اور جب غدارانِ وطن کو ان کی کارگزاریوں کا صلہ دینے کا وقت آیا تو ایک جاں نثار وطن کی جائیداد سرسید کو بھی پیش کی گئی لیکن انہوں نے جاگیر قبول کرنے کی بجائے وظیفہ کی شکل میں اپنی ''خدمات'' کا صلہ وصول کرنا چاہا۔ یہ سرسید کی بڑی دور اندیشی تھی۔ انگریز کے لئے یہ ایک قابل قبول صورت تھی، اس نے قبول کر لی اور سرسید ''حسن خدمات'' کے نام پر ''غداریٔ وطن'' کا صلہ پاتے رہے۔ (ایضاً: ص ۳۴)

افکارِ سرسید کے منفی اثرات:

تعلیم اور مذہب و سیاسیات میں ان کے خیالات، افکار اور اقدامات نے مسلمانوں میں پستی، بے اعتمادی اور بے دینی پیدا کی۔ تعلیم میں ان کے سامنے کوئی بلند نصب العین نہ تھا اور نہ اس کا کوئی متوقع نتیجہ نکلا۔ شبلی و ابوالکلام تو دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے تھے، اس کے نتائج سے حالی بھی مطمئن نہ تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت کا شاہکار، اُن کا بیٹا، وقت کا سب سے بڑا شرابی تھا جس نے اپنے باپ کو بڑھاپے میں گھر سے نکال باہر کیا تھا۔ پھر کبھی اپنے گھر میں آنا انہیں نصیب نہ ہوا۔ پرانی تعلیم کے پروردہ ایک دوست نے اپنے گھر کا دروازہ اُن پر کھولا

اور پھر اس کے صحن سے سرسید کا جنازہ ہی نکلا۔ مذہب میں آزاد خیالی اور ذوق تجدد و توسع کو اتنا دخیل کیا کہ پورا نظام عقائد و عبادات تہ و بالا ہو گیا۔ سیاست میں ان مرحوم نے وہ سبق دیا کہ مسلمان ملکی اور قومی دھارے سے کٹ کر الگ ہو گئے۔ انگریزی حکومت پر اس قدر اعتماد کی تعلیم دی کہ تحریک آزادی کے انتہائی عروج کے دور میں بھی مسلمانوں کے لئے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا دشوار ہو گیا تھا۔ ان مرحوم کو زور و شور کے ساتھ پاکستان کے مفکروں میں شمار کیا جاتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر برصغیر کی سیاسی تحریک کو انہیں کے افکار کی روشنی میں چلایا جاتا تو نہ ہندوستان آزاد ہوتا، نہ پاکستان ہی کا وجود نقش پذیر ہو سکتا تھا۔ جو دِل کی گہرائیوں سے انگریزوں کی حکومت کے دائمی و ابدی ہونے کی دعا کرتا ہو اور مسلمانوں کے لئے اسے خدا کی سب سے بڑی رحمت گردانتا ہو اس میں ہندوستان کی آزادی یا پاکستان کے تصور کی بھی کہاں گنجائش نکل سکتی تھی!

(نقش سرسید ص ۷۔۸)

اگر ان کے سیاسی افکار کو بیسویں صدی میں مسلمان اپنا نصب العین قرار دے لیتے تو آزادی کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکتا تھا۔ اگر ان کی دعائیں شرف قبولیت حاصل کر لیتیں تو آج بھی اہل وطن کے سروں پر برٹش استعمار کا سورج چمک رہا ہوتا، اور اگر ان کے تعلیمی افکار کو مطمح نظر قرار دے لیا جاتا تو برطانوی اقتدار کے دفتری نظام کو چلانے اور اسے مستحکم کرنے والی مسلمان نام کی ایک غلام قوم محکومانہ زندگی گزار رہی ہوتی۔

(خود نوشت افکار سرسید ص ۱۵)

سرسید کے مسلک سے بغاوت:

سرسید کانگرس کے مخالف تھے۔ اس کی مخالفت میں انہوں نے ہندوؤں سے اتحاد کیا، مسلمانوں کو جمع کیا، لیکن ان کے سپوتوں نے سرسید سے بغاوت کی اور بکثرت کانگرس میں شامل ہو گئے اور بہت سوں نے کانگرس کی صف اول میں جگہ پائی۔ مولانا محمد علی، حسرت موہانی، تصدق احمد خاں شروانی، رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر ذاکر حسین، شیخ عبداللہ کانگرس کے صف اول کے لیڈر تھے۔ دوسرے رہنماؤں میں مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی

[illegible]، عبدالمجید خواجہ، جلیل احمد سنگوری، قاضی عبدالغفار، مہدی افادی، مولانا حمید اللہ [illegible]
اقبال سہیل وغیرہ سب کے سب کانگریسی اور نیشنلسٹ تھے اور یہ سب علی گیرین تھے۔ انہوں نے سر
سید کے مسلک سے بغاوت کی تھی اور بہت دور جا پڑے تھے، اور ایسے دور ہو گئے کہ پھر
اس طرف نہیں گئے۔ ان کا اپنا مسلک رہا، غلط ہو یا صحیح، یہ بالکل الگ بات ہے لیکن وہ
ان کا مسلک تھا سر سید کا مسلک نہیں تھا۔۔۔ شور یہ مچایا جاتا ہے کہ سر سید پاکستان کے بانی
اور نظریۂ پاکستان کے بانیوں میں سے تھے، لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ جب تک علی گڑھ سے علیحدگی
کی تحریک نہیں دکھائی گئی، آزادی کا تصور مقصود نظر نہیں آیا۔ تحریک پاکستان کا دور تو تحریک [illegible]
کے آغاز، عہد عروج کی بات نہیں، دور آخر کی بات ہے۔

([illegible])

سید احتشام حسین

مذہب کے سہارے علاحدگی کی حمایت

سر سید معاشی اور عالمی سیاست کے اس دور میں راہنمائی کے لیے اٹھے [illegible]
[illegible] کے باوجود ان کے خیالات نے انگریزی حکومت کے دست و بازو
بنے اور اگر مسلمانوں کو ترقی کی راہ پر چند قدم آگے بڑھایا تو چند قدم پیچھے بھی دھکیل دیا [illegible]

[illegible]

([illegible])

تضاد کا شکار علی گڑھ تحریک:

اس میں شک نہیں کہ سرسید انگریزی حکمت عملی کا شکار ہو گئے۔ اُن کی نگاہ محدود ہوتی گئی، یہاں تک کہ آہستہ آہستہ صرف مسلمانوں اور وہ بھی ہندوستانی مسلمانوں کے ایک چھوٹے سے طبقے کے مفاد کو اپنے تمام اعلیٰ خیالات کا مرکز بنالیا اور انگریزوں کی حمایت میں یہ بھی بھلا دیا کہ یہی انگریز مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کا خون بھی چوس لینا چاہتے ہیں۔ علی گڑھ تحریک اس طرح آہستہ آہستہ تضاد کا شکار ہوتی گئی اور سرسید کے غیر معمولی ذہن نے اپنی کمان سے ترقی کے تیر نکال کر رجعت پسندی کے تیر لگا لئے جس سے خود ان کی تحریک زخمی ہو گئی۔ (ایضاً ص ۱۶۱)

اگر علی گڑھ تحریک کے وجود میں آنے کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جن عناصر نے اس کی تکمیل میں مدد کی تھی، اُن میں سے بعض دور تک اس کے ساتھ نہیں چلے۔ بعض صورتوں میں یہ تحریک مغرب کی محض سطحی اور سستی نقالی بن کر رہ گئی اور بعض صورتوں میں دیرپا اور دوررس نتائج کی محرک اول ثابت ہوئی۔ ایسی ہر تحریک تاریخی جبر اور محدودیت کا شکار ہوتی ہے، یہ بھی اس سے بچ نہ سکی لیکن اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ جس عقلیت اور صنعتیت، جس اصلاحی جوش اور ترقی کے ولولہ کو لے کر اس نے اپنی ابتدا کی تھی وہ آہستہ آہستہ ظاہری چمک دمک، ملازمتوں کے لئے جدوجہد، انگریزوں کی رضا جوئی کے جذبے کے نیچے دبتے چلے گئے ...... سرسید نے جدیدیت کی طرف متوجہ کرنے کے ساتھ انگریزوں سے دوستی، تعاون یا وفاداری کا جو سبق پڑھایا وہ اس حالت میں بھی جاری رہا، بلکہ زیادہ شدت اختیار کر گیا، جب حالات بدل دیئے تھے اور ہندوستان کا سیاسی مزاج کسی اور سانچے میں ڈھلنے اور سیاست کا کارواں کسی اور منزل کی جانب بڑھنے پر آمادہ تھا۔ اسی تضاد کی حالت میں علی گڑھ تحریک سرسید کے آخری زمانے میں پھر ایک دوراہے پر پہنچ گئی جہاں راستہ سمجھانے والوں نے اسے تضاد سے باہر نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے نتائج بیسویں صدی میں ظاہر ہوئے اور علی گڑھ تحریک کے پروردہ راہوں کے انتخاب میں تقسیم ہو گئے۔ (ایضاً ص ۱۶۳۔۱۶۴)

قاضی احسان احمد شجاع آبادی

انگریز دوستی کی مساعی میں عجیب وغریب تاویلوں کا سہارا:

سید احمد خاں نے جنگ آزادی میں ہند کی تمام حریت پسند قوتوں سے ہٹ کر انگریزوں کے لئے کام کیا، اُن کو پناہ گاہیں مہیا کیں، ان کی جان و مال کو محفوظ کیا اور ایک وفادار رعایا کی طرح ان کی ہر طرح سے خدمت کی جس کے بدلہ میں سید احمد خاں کی انہی خدمات کی بدولت اُنہیں ''سر'' کا خطاب بخشا گیا۔ سرسید نے بعض ایسی کتابیں لکھیں جن کے ذریعہ مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان صدیوں کی دشمنی اور پرانی مغائرت اور مذہبی اختلافات کو ختم کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ سرسید کا قلم یہاں تک آگے نکل گیا کہ دونوں قوموں کے مابین بنیادی اختلافات تک کو ختم کرنے کے لئے عجیب وغریب تاویلوں کا سہارا لیا گیا، چنانچہ انہوں نے توریت اور انجیل کی ایک تفسیر ''تبیین الکلام'' کے نام سے لکھی جس کا مقصد یہ تھا کہ اسلام اور عیسائیت کے درمیان جن باتوں پر شدید اختلاف ہے ان کی ایسی تشریح کی جائے کہ دونوں طرف کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں اور انگریزی حکومت، جو مذہباً عیسائی تھی، مسلمانوں کو اسلام کی نسبت سے اپنا دشمن تصور کرنا چھوڑ دے۔ اس طرح سرسید نے ۱۸۶۸ء میں ایک رسالہ بعنوان ''احکام طعام اہلِ کتاب'' لکھا جس میں ثابت کیا کہ انگریزوں کا ذبیحہ جائز ہے اور ان کا کھانا حلال ہے بشرطیکہ وہ حرام چیزوں سے پاک ہو۔ سرسید احمد خاں نے اس پر بس نہیں کی بلکہ کئی ایسی کتابیں لکھیں جو بظاہر عیسائیوں کی طرف سے قرآن اور اسلام پر کئے جانے والے اعتراضات کے جواب میں ہیں مگر درحقیقت انہوں نے ان تمام باتوں کا سرے سے اسلامی ہونا محلِ نظر بنا دیا ہے اور انہیں اسلامی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے جن پر انگریز عیسائی معترض تھے۔ علاوہ ازیں سرسید نے قرآن کریم کی ایسی ہی جدید تفسیر ''تفسیر احمدیہ'' کے نام سے لکھی جس میں اسلام وایمان کی ایسی تشریحات وتاویلات کی گئی ہیں جن سے آج تک متقدمین شاید ''صرف نظر'' کرتے رہے ہیں۔

(قاضی احسان احمد شجاع آبادی: ص۲۱۶)

احمد بشیر

فکرِ سرسید کا تحریکِ پاکستان سے کیا ناطہ!

.... پاکستان کی تاریخ پر لکھنے والوں نے جو لکھنا تھا، لکھ چکے تھے اور محققوں اور مؤرخوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی جدوجہد کو ایک ایسی شکل میں ڈھال دیا تھا جو پاکستان کے نئے حکمران طبقے کی ضروریات کو پورا کرسکے حالانکہ پاکستان کے نئے حکمران طبقے کا مسلمان عوام کی طویل جدوجہد میں کوئی حصہ نہ ہوا۔ ان میں سامراجی غلام زادے بھی تھے، مگر زیادہ تر ہند اسلامی تہذیب کے علم بردار تھے۔ ہند اسلامی تہذیب سے ان کی مراد ہندوستان کے ہندو مسلم حکمران طبقوں کی محلاتی تہذیب تھی جس کا ہندو اور مسلمان عوام سے کوئی لاحقہ نہ ہوا۔ انہوں نے سرسید کو پاکستان کا مفکر و موجد قرار دے دیا۔ تعلیم جدید کے میدان میں سرسید کی عنایات کا شکریہ، مگر جناب جاگیرداری نظام کے زبردست علم بردار اور برطانوی سامراج کے انتہائی تابع دار تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلم جاگیردار خاندانوں میں سے ایک جدید تعلیم سے آراستہ طبقہ پیدا کیا جائے جو تاج برطانیہ کی ہندوستان پر گرفت میں اس کی اعانت کرے اور مادی ترقی کے میدان میں ہندو درمیانہ طبقے اور سرمایہ داروں اور جاگیرداروں سے اپنا حصہ بٹائے۔ ان کے زمانے میں ان کی تحریک سیاسی طور پر درست ہوگی مگر یہ کہنا کہ انہوں نے پاکستان کی بنیاد رکھی ان کے زمانے کے تقاضوں کی تائید کے مترادف ہوگا۔ پھر یہ تحریک پاکستان کی حقیقت کی نفی ہوگی کیونکہ تحریک پاکستان کسی مرحلے پر بھی تاج برطانیہ کی وفاداری کی حلیف نہ ہوئی۔ پاکستان تو تھا ہی ہندوستان کی آزادی کا نسخہ مگر نئے حکمران طبقے نے سب کچھ علی گڑھ کی جھولی میں ڈال دیا تاکہ اس کے فارغ التحصیل پاکستان پر اجارہ دار ہوجائیں اور کوئی یہ نہ پوچھ سکے کہ بھیا کیسی!

(جنگ لاہور، ۸/اپریل ۱۹۸۲ء، ص ۳)

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی

بعض علمی و مذہبی آراء میں تناقص:

سرسید کی ذاتی اور نجی تحریروں سے اس نفسیاتی کیفیت کا پتہ چلتا ہے جو علمی اور مذہبی تحقیقات کے دوران میں ان سے ظہور میں آتی رہی حالانکہ دوسرے نجی معاملات میں جو کسر نفسی اور عالی ظرفی ان میں پائی جاتی ہے وہ بالکل اس احساس کے منافی ہے ... اس نے سرسید کی علمی زندگی اور مذہبی خدمات کو ایک حد تک نقصان پہنچا ہے۔ اسی احساس برتری کی بنا پر انہوں نے اپنی غلطیوں کو تسلیم نہیں کیا اور اپنے مذہبی خیالات میں کوئی ترمیم نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ وسطی اور آخری دور کی بعض علمی اور مذہبی آرا میں تناقص پایا جاتا ہے۔ اگر وہ اپنی معلومات اور علمی تحقیقات پر اس قدر مصر نہ ہوتے تو ممکن تھا کہ وہ اپنی مزید تحقیق سے خود اپنے آپ کو اور دوسروں کو زیادہ فائدہ پہنچا سکتے۔ ان کی اس روش نے نہ صرف ان کے مخالفین اور معترضین کو اُبھارا اور مخالف کے لئے زیادہ مواقع بہم پہنچائے بلکہ خود ان کے بعض ہوا خواہوں اور دوستوں کو بھی مخالف بنا دیا۔

(سرسید کا علمی کارنامہ: ص ۶۶۔۶۷)

پروفیسر اختر الواسع

دو قومی نظریے کا بانی ہونے کا الزام:

سرسید کے اس خیال کا کہ "ہندو علیحدہ، مسلمان علیحدہ ہو جائیں گے" سہارا لے کر کچھ لوگ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس کی وجہ سے مسلمان فرقہ وارانہ سیاست کا شکار ہو گئے، یا یہ سب کچھ خداوندان حکومت (یعنی حکومت برطانیہ) کی رضا اور خوشی کے لئے کیا گیا تھا، بالکل غلط ہے۔ سرسید کے وقتی یا عارضی ردعمل کو کسی معاملے میں بنیاد بنا کر اُن کی شخصیت کو قوم پرستی اور فرقہ پرستی کے خانوں میں بانٹنا سراسر زیادتی ہے۔ سرسید دو نہیں تھے بلکہ حالات دو تھے۔ ایک سرسید کی مستقل فکر ہے جو آج تک ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ افسوس تو یہ ہے

کہ ہندوستانی قومیت کا تصور آج تک سرسید کے نظریۂ قومیت کے سرحد کو چھو بھی نہیں سکا ہے۔
یاد رکھیئے کہ سرسید کی فکر کا دوسرا پہلو عارضی اور وقتی تھا۔ ممتاز مورخ تاراچند نے اپنی کتاب
''ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ'' میں لکھا ہے کہ ''سرسید احمد خاں ہندو مسلم تعاون میں یقین
رکھتے تھے۔ اگر انہیں اس نظریے کا بانی کہا جائے کہ ہندو اور مسلمان دو مختلف قومیں تھیں تو یہ
حقیقت کو جھٹلانے کے مترادف ہوگا۔ دراصل وہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے۔ ان کی نظر میں
اس اتحاد کی راہ میں مذہب مزاحم نہ تھا اور نہ ہی وہ کسی عقیدے کے مخالف تھے۔''

(جامعہ نئی دہلی، جولائی تا دسمبر ۱۹۹۸ء، ص ۳۳۱۔۳۳۲)

اختر وقار عظیم

تحقیق کی بجائے تاویلیں گھڑنے کا عمل:

تاریخ اور تحقیق و تدقیق کا چولی دامن کا ساتھ ہے، سرسید پر یہ بات خوب واضح تھی
جس کا اظہار ان کے ایک بیان سے بھی ہوتا ہے۔ ''تاریخ سرکشی ضلع بجنور'' میں ایک جگہ لکھتے
ہیں: ''اس تاریخ میں جو کچھ لکھا ہے، بہت سا اس میں میری آنکھوں کا دیکھا اور بہت سا اپنے
ہاتھ کا کیا ہوا ہے اور اس کے سوا جو کچھ لکھا ہے، وہ نہایت تحقیقات سے اور بہت صحیح اور نہایت
ہی سچ لکھا ہے''۔ تحقیق و تدقیق کی اہمیت کے اس اندازے کے باوجود سرسید نے اپنی تصانیف
میں تحقیق پر زیادہ زور نہیں دیا، اور یہ بات ''مؤرخ سرسید'' کے ہاں ضرور کھٹکتی اور کھلتی ہے۔
تحقیق کر کے کسی بات کو ثابت کرنے کی بجائے وہ تاویلیں گھڑ کر کام لینے کی کوشش کرتے
ہیں۔ یہ بات یقیناً ایک مؤرخ کو زیب نہیں دیتی۔ سرسید کے سلسلے میں یہ چیز اس لئے زیادہ ہی
کھٹکتی ہے کہ انہوں نے تاریخ اور تحقیق کے رشتے کو سمجھتے ہوئے بھی اپنی تحریروں میں دونوں کو
قریب لانے کی زیادہ کوشش نہیں کی حالانکہ یہ ہمیشہ سرسید کے دل میں چبھن کا باعث رہی کہ غیر
مسلم مؤرخین مسلمانوں سے غیر منصفانہ برتاؤ کرتے ہوئے ان کی تاریخ کو نیا رنگ دے کر
بگاڑنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

(برگِ گل کراچی، سرسید نمبر / نقش ثانی / ص ۱۸۰۔۱۸۱)

ڈاکٹر اخلاق احمد

دو قومی نظریہ کانگرس کی مخالفت نہ تھا:

سرسید ہندو مسلم اتحاد میں یقین رکھتے تھے۔ ایک سیاسی جماعت کانگرس سے انحراف نہ کرنے سے یہ مطلب کہاں نکلتا ہے کہ وہ دو قومی نظریے کے حامی تھے، جیسا کہ کچھ لوگ زبردستی دو قومی نظریے کے لباس کو سرسید کا پیراہن کہتے ہیں سرسید کا تو وقتی طور پر ایک مصلحتی قدم تھا، نہ کہ عقیدہ تھا۔

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، مارچ اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۶)

ادریس ناز

نصابی سرسید کی مبینہ تعلیمی اور قومی خدمات:

(بنام قارئین) اپنی تمام تر نالائقیوں کے باوجود میں ایک اچھا طالب علم رہا ہوں، لہٰذا میں نے ہمیشہ ہی سرسید احمد خاں کی تعلیمی اور قومی خدمات پر مفصل مضامین لکھے ہیں۔ ہر چند ماضی میں ان مضامین کا ماخذ ہمیشہ نصابی کتب ہی رہیں۔ پھر جب میں نے مقالاتِ سرسید خطباتِ سرسید اور جانشینوں کی کتب کا مطالعہ کیا اور اس سلسلہ میں اپنے محترم استاد سے بار ہا تبادلہ خیال کیا تو میں نے سوچا، کیوں نہ آپ کو بھی اپنی سٹڈیز میں شامل کر لوں۔

سرسید احمد خاں کا بہت بڑا تعلیمی کارنامہ علی گڑھ یونیورسٹی کو سمجھا جاتا ہے۔

ثابت ہوتا ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی قائم کرنے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ ایک ایسا پڑھا لکھا طبقہ پیدا کیا جائے جو بہر طور انگریز حکومت کا وفادار ہو اور کسی بھی آزادی کی تحریک کے خلاف بروقت استعمال کیا جا سکے۔

سرسید نہ صرف آزادی کے خلاف تھے بلکہ وہ اس غلامی کو عین اسلام سمجھنے اور سمجھانے پر تلے ہوئے تھے۔

یہ سرسید کی صحبت کا فیضان تھا کہ مولانا حالی ''مدّ و جزرِ اسلام'' لکھنے کے بعد اپنا

تمام زورِ قلم انگریز حکومت کی پائیداری میں صرف کرتے۔ میرے نزدیک یہ بہت بھاری ذمہ داری تھی۔ ایک طرف تو مسلمانوں کو ان کا تابناک ماضی یاد دلانا اور بتانا کہ ان کے اسلاف نے آزادی اور خودداری کے لئے کیا کیا قربانیاں دی ہیں اور دوسری طرف انگریز حکومت کی غلامی کا درس دیتے رہنا، خاصا مشکل کام تھا۔ اگر مولانا حالی کا مطمحِ نظر یہی تھا تو پھر مسدس حالی لکھ کر مسلمانوں کو جھنجوڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ شاید وہ یہ مسدس لکھ کر ادب کی دنیا میں امر ہونا چاہتے تھے۔ اگر ان کا مقصد صرف اتنا تھا تو کچھ زیادہ بری بات نہیں۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ قائدِ اعظم علی گڑھ کے فارغ التحصیل نہ تھے ورنہ پاکستان بن چکا تھا! دراصل سرسید ایک مخصوص گروہ کے نمائندہ تھے۔ ہندوستان کا عام اور غریب مسلمان ان کے نزدیک محض ایک فالتو پرزہ تھا۔ ان کی کوشش تھی کہ امرا کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں اور اعلیٰ عہدے بھی۔ باقی رہے عام طبقے کے لوگ تو انہیں غلامی کا درس دیا جائے۔

.....اب جب کہ اللہ کے فضل و کرم، آباؤ اجداد کی ان گنت قربانیوں، قائدین بالخصوص حضرت قائدِ اعظم کی ان تھک محنت سے ہم آزاد اور خود مختار سلطنت میں آزادی کے ساتھ سانس لے رہے ہیں تو ایسی صورت میں بھی اگر آپ اپنے نصاب میں سرسید احمد خاں کی تعلیمی اور قومی خدمات کا ذکر نمایاں انداز میں کرنا چاہیں تو آپ جانیں اور آپ کا سرسید!!

(قومی ڈائجسٹ لاہور، جون ۲۰۰۰ء، ص ۴۶ تا ۴۸)

ارشاد اللہ کمال

سرسید تحریک کی کاوشیں، قوم و وطن کا ایک مستقل روگ:

سرسید احمد خاں حالات کی بے رحمی سے گھبرا گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر یہ روش زیادہ دیر تک برقرار رہی تو ہندوستان میں مسلمان کا مستقبل مخدوش ہو جائے گا، لہٰذا انہوں نے حصول علم جدید کا علم بلند کیا۔ بدقسمتی سے ان کا پروگرام زبان و ادب کی دہلیز سے آگے نہ بڑھ سکا اور قوم آج تک لسانی پیچ و خم میں الجھی ہوئی ہے۔ اگر بنظرِ عمیق دیکھا جائے تو یہ تاثر واضح

ہوتا ہے کہ جیسے وہ مغربی تہذیب اور اس کی مادی بنیادوں کی تقلید اور اس کے عیوب و نقائص بغیر کسی تنقید و ترمیم کے اختیار کر لینے کے داعی تھے، انہوں نے شخصی طور پر انگریزی تہذیب اور طرز معاشرت کو اختیار کر لیا اور گرم جوشی کے ساتھ اس کے محرک و مؤید بھی ٹھہرے۔ ان کا خیال تھا کہ اس ہم رنگی و ہم آہنگی سے احساسِ مرعوبیت، احساسِ کمتری اور احساسِ غلامی بڑی حد تک ختم ہو جائے گا اور گویا کہ وہ ایک معزز مساوی درجہ کی قوم کے افراد معلوم ہونے لگیں گے۔ سرسید احمد خاں کی نگاہ صرف مغربی تہذیب و تمدن کے روشن پہلوؤں پر جا ٹھہری تھی۔ ان کی معاشرت و ثقافت کے کمزور، تاریک اور تخریبی گوشے ان کی آنکھ سے پوشیدہ رہے۔

...... یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ سرسید احمد خاں کی طاقتور شخصیت اور تحریک نے مسلمانوں کی نئی نسل کو اتنا متاثر کیا جتنا کسی دوسری تحریک نے آج تک نہیں کیا۔ بلاشبہ اس عظیم تعلیمی تحریک کے صلہ میں بعض قد آور سیاسی رہنما بھی ہندوستانی مسلمانوں کو میسر آئے۔ تعلیمی اور اقتصادی خلا بھی بڑی حد تک پر ہوا اور علیحدہ ملک کے لئے آزادی کا قافلہ بھی بہیں کہیں تشکیل پایا مگر یہ ساری مخلصانہ کاوشیں قوم و وطن کو ایک مستقل روگ بھی عطا کر گئی ہیں۔ سرسید کی تحریک کے نتیجے میں انگریزی زبان و ادب میں نام کمانے والوں کی تو اب بھی ایک وافر تعداد پیدا ہو رہی ہے اور نستعلیق انگریزی میں مہارت ہی پوری قوم کا جنون ہے۔ ہم ایک مدت سے نقلی و تنقیدی دنیا کے سرابوں میں بھٹکتے رہے ہیں۔ اے کاش! وہ اپنے عصری تقاضوں کے مطابق عملی اور فنی تعلیم کو فروغ دیتے۔ پاکستانی قوم جس حالت کو پہنچی ہوئی ہے، اس میں سب سے زیادہ حصہ سرسید احمد خاں ہی کا ہے۔ ان کے دکھائے ہوئے راستہ پر قوم اسی قدر آگے بڑھ چکی ہے کہ اب واپسی کی کوئی صورت بھائی اور دکھائی نہیں دے رہی۔

(روزنامہ انصاف لاہور، ۲۵ جولائی ۲۰۰۰ء)

ارشاد حسین نقوی

مذہب سے بیزاری کا سبق:

مذہبی امور میں بھی سرسید نے کھلا اجتہاد کیا غلط ... غلط ... کی بدولت

انہوں نے پوری قوم کو روحانی اقدار اور مذہبی تقاضوں سے ہٹا کر پیٹ پوجا اور فراہمی روزگار کی پٹری پر لگا دیا اور اپنے اس اجتہاد کو بہ بانگ دہل بلند کیا۔ اس سے پورا برصغیر چونک اٹھا۔ سرسید نے مذہب کی آڑ لے کر برصغیر کے مسلمانوں کو ان کے مذہب سے بے بہرہ کر دیا اور ان میں مذہب کے بارے میں عجیب بے تعلقی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔۔۔ سرسید کے ایسے تصورات اپنی عملی شکل میں بجائے افادے کے ایک حد تک قوم کی ذہنی پریشانی کا موجب بن رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم نے مذہب کے دامن کو چھوڑا اور مادی انداز سے سوچنا شروع کر دیا۔ مذہب کی ان کے نزدیک زیادہ اہمیت نہ رہی۔ مذہب امت مسلم کا محور تھا، اب اس کی ضرورت اور اس کا احساس مٹنے لگا۔

(اکبر الہ آبادی کا سیاسی شعور: ص ۱۹ تا ۲۱)

سرسید تحریک کا اصلی روپ!

تحریک آزادی وطن کی تگ ودو میں بھی سرسید احمد خاں کا کردار بڑا دلچسپ ہے۔ وہ اس سے الگ تھلگ رہے۔ نہ انہوں نے خود عملی سیاسیات میں حصہ لیا اور نہ ہی قوم کے لئے کبھی کوئی لائحہ تجویز کیا، نہ ہی وہ نظری طور پر اس تحریک اور جدوجہد مسلسل کے حامی تھے۔ ان کی تحریروں میں کہیں بھی آزادی پسند تحریکوں کی حمایت کا عنصر نمایاں نہیں ہے۔۔۔۔۔ یہ انگریزوں کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں یہ سارا ڈرامہ کھیلنے کے لئے ایک باوقار اور پُر امن سٹیج اور چاک و چوبند کردار میسر آئے تھے جو اپنے ڈائرکٹر کے ہر تقاضے کے مطابق اپنے کو بہ طریق احسن ڈھالنے کو تیار تھے۔ بعض لوگوں نے سرسید کی پالیسی کو کبھی تو اس مجبوری کا تابع بتایا کہ وہ اپنے تعلیمی منصوبے کو عملی جامہ پہنانا چاہتے تھے اور کبھی اس تحریک کا یہ اثر دکھلایا کہ انگریزوں کے رویہ میں کچھ تبدیلی اور مسلمانوں کے لئے رواداری محض سرسید کی تحریک کی رہین منت ہے حالانکہ یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ بہت کم وزن رکھتی ہیں۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ انگریزوں کی مسلمانوں کے بارے میں پالیسی میں تبدیلی ہوئی، یہ محض سطحیت پر مبنی ہے۔ انگریز شروع سے لے کر آخر تک مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھتے رہے اور ظاہری طور پر جو کچھ رواداری انہوں نے دکھائی، وہ خود انگریزی اقتدار اور تسلط کی بقا کے لئے تھی۔ اگر انگریز ایسا قدم نہ اٹھاتے تو اس

سے انگریزی استعمار کو ہی نقصان تھا۔ اسی لئے بنیادی طور پر ان کی یہ رواداری کسی تحریک یا
کی مرہون منت ہرگز نہ تھی اور نہ ہی انگریز نے سرسید تحریک سے متاثر ہو کر مسلمانوں کے
میں کچھ شفقت برتی سرسید کا تعلیمی پروگرام جسے وہ مسلمانوں کی ترقی سے تعبیر کرتے
انگریزوں ہی کا متعارف کروایا ہوا تھا اور یہ غلامی کے درس سے لبریز تھا حقیقت یہ ہے
اس تحریک کا اصلی روپ آج بھی ہمارے سامنے نہیں آتا اور ہمارے بعض اہل قلم غلطی کو غلط
ماننے سے کیوں گھبراتے ہیں؟ روایتی طور پر دور غلامی کا یہ تصور کہ ''سرسید ہی ملت اسلامیہ
کشتی کے ناخدا تھے'' آج بھی ورثے میں چلا آتا ہے حالانکہ تھوڑے سے غور و فکر کی ضرورت
ہے۔ (ایضاً ص ۲۱تا ۲۶)

ارشد علی

''آثار الصنادید'' کا تحقیقی معیار:

سرسید کی بیان کردہ متعدد روایات ایسی ہیں جن پر شک کرنے کے لئے کسی علمی اور
بحث کی ضرورت نہیں۔ مذہبی عقیدت کے تحت بیان کی گئی یہ باتیں سائنسی نقطہ نگاہ رکھنے والے
شخص کو سرے سے اپیل نہیں کرتیں۔ بزرگوں کے بیان میں خوش اعتقادی کا پہلو اپنی جگہ لیکن
ایک تحقیقی کتاب میں اس کی ہرگز گنجائش نہیں ... مذہبی اعتقادات محض خلاف عقل روایات
قبولیت کی حد تک ہی سرسید کی تحقیقی کاوشوں کی راہ میں حائل نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے معتقدات
سے دامن چھڑا کر خالص تحقیق کی راہ کی جانب پلٹنے والے محقق سرسید احمد خاں کو بھی کسی نہ کسی
بہانے سے بھٹکانے کی کوشش کی ہے...... سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہندوؤں کے عقائد عقل
سے باہر ہیں تو کیا مسلمانوں اور عیسائیوں کے مذہب یا مذہبی شخصیات سے متعلق وہ ضعیف
روایات عقل سے باہر نہیں جن کا ذکر سرسید نے بڑے عقیدت مندانہ انداز میں کیا ہے؟ الغرض
حقیقت یہ ہے کہ سرسید تحقیق کے دوران اپنے تعصبات سے دامن نہیں چھڑا سکے۔

سرسید کی بے نیازی کا ایک ثبوت یہ ہے کہ وہ ایک مقام پر ایک بیان نقل کرتے ہیں
اور دو تین صفحات بعد اس کی تردید کرتے نظر آتے ہیں کہ میں نے پچھلے صفحے پر جو لکھا ہے''

غلط ہے اور اصل بات یوں ہے عمارتوں کے کوائف کے بارے میں سرسید کے ہاں متعدد ایسے بیانات ملتے ہیں جو پایۂ تحقیق سے ساقط ہیں سرسید کی ایک خامی یہ ہے کہ وہ ایک ہی عمارت کا ذکر اس کے مختلف حصوں کے حوالے سے مختلف مقامات پر منتشر انداز میں کرتے ہیں سرسید کے ہاں افراد اور مقامات کے ناموں کے سلسلے میں بھی متعدد اغلاط پائی جاتی ہیں جس طرح سرسید سے سن ہجری کو سن عیسوی میں تبدیل کرتے وقت لغزش ہوئی ہے اسی طرح وہ بیشتر مقامات پر تاریخی قطعات اور اشعار سے واقعے کی صحیح تاریخ اخذ کرنے میں بھی ناکام رہے ہیں علاوہ ازیں سرسید کے دئے گئے متعدد حوالہ جات مستند نہیں ہیں تحقیق میں کہیں کہیں سرسید کی انا بھی ان کے راستے کی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ انہیں اپنی غلطی کا واضح احساس ہو جاتا ہے، وہ جزوی طور پر اس کا اقرار بھی کر لیتے ہیں لیکن ساتھ ہی اپنے پچھلے بیان کا بھرم رکھنے کے لئے تاویلیں بھی پیش کرنے لگتے ہیں اپنی متعدد خامیوں کے باوجود ''آثار الصنادید'' اپنے زمانے کا ایک اہم تاریخی ریکارڈ ہے۔

(آثار الصنادید کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ ص ۱۰۵ تا ۱۱۸)

ڈاکٹر اسرار احمد

تفسیر میں گمراہ کن تاویلات:

۱۸۵۷ء کے بعد جب مسلمانوں کی نام نہاد حکومت بالکل ختم ہوگئی اور برصغیر پاک و ہند پر سیاسی اعتبار سے حکومت برطانیہ کا تسلط و استیلا کامل طور پر ہو گیا تو غلامی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ۱۹۴۷ء تک یہ نوے سال کا دور ہے۔ اس دور میں قرآن کے حوالے سے جو سب سے پہلی زوردار آواز اٹھی ہے، وہ سرسید احمد خاں کی ہے۔ پندرہ پاروں کی انہوں نے تفسیر بھی لکھی۔ انہوں نے ایسے ایسے فتنے اٹھا دئے کہ حد و بس ہے۔ جنات کا انکار، فرشتوں کا انکار، وحی کا قریباً انکار -- ان سب کی ایسی توجیہہ و تاویل، جو سراسر قرآن کے خلاف تھی۔ ظاہر بات ہے کہ کھلم کھلا انکار تو کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ انہوں نے جنات کا برملا انکار نہیں کیا لیکن یہ کہا کہ قرآن نے مشتعل مزاج اور اجڈ قسم کے لوگوں کو ''جن'' سے تعبیر کیا ہے، وہ کوئی علیحدہ مخلوق نہیں

ہے۔ فرشتوں کو بھی برملا انکار نہیں کیا۔ کہا تو یہ کہا کہ یہ جو Forces of the Nature ہیں، قوائے طبعیہ ہیں، ان کو فرشتے کہا گیا ہے۔ ان کا کوئی علیحدہ وجود نہیں، وہ کوئی علیحدہ مخلوق نہیں، ان کا علیحدہ کوئی تشخص نہیں۔ معجزات کا انکار، ان کی یہ تاویل کی گئی کہ یہ بھی Physical Phenomena تھے، طبیعیات کے عجیب وغریب اور غیر معمولی مظاہر تھے، ان کو خواہ مخواہ معجزات سمجھ لیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ اپنی قوم کو لے کر سمندر سے نکل گئے اور فرعون کا لشکر غرق ہوگیا تو یہ مدّ وجزر کا کرشمہ تھا۔ سمندر مدّ پر آگیا جب کہ فرعون اپنے لشکر کو لے کر سمندر میں اُترا تھا اور جزر کی کیفیت میں حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کے ساتھ نکل گئے۔ گویا اپنے دور کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ مصری قوم مدوجزر سے ناواقف تھی، ایسی گمراہ کن تاویلات ہیں جو سرسید احمد خاں نے کیں، کھلم کھلا انکار کسی چیز کا نہیں کیا۔ ان کی پیدا کردہ گمراہیوں کی فہرست بڑی طویل ہے۔

(جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی: ص ۳۵۱۔۳۵۲)

فکرِ سرسید کے جدید متبعین کی کیفیت:

آج کی تمام نام نہاد مذہبی عقلیت، خواہ وہ پرویزیت کی صورت میں ظاہر ہوئی خواہ فضل الرحمانیت کی شکل میں، درحقیقت فکر سرسید ہی کی خوشہ چینی اور نہایت کورانہ تقلید ہے۔ سرسید بے چارے تو پھر بھی معذور تھے، اس لئے کہ ان کا واسطہ ایک ابھرتی ہوئی فکر کے ساتھ تھا جس کی پشت پر ایک عظیم سیاسی وعسکری قوت بھی بڑی شان وشوکت اور آب وتاب کے ساتھ ابھر رہی تھی۔ رحم تو آتا ہے ان کے ان جدید متبعین پر جو آج ان نظریات کو بڑے فخر کے ساتھ پیش فرما رہے ہیں درآں حالیکہ مغربی تہذیب کبھی کی خود اپنے آپ خنجر سے آپ ہی خودکشی کر چکی، سائنس کی مادہ پرستی کب کی فضا میں تحلیل ہو چکی اور مغرب کی سیاسی وعسکری بالادستی کی بساط کب کی تہہ ہو چکی: ع

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست!

بہرحال اصل اہمیت سرسید کی نہیں فکر سرسید کی ہے۔ شخص سرسید تو بہت جلد اپنے رب سے جاملا لیکن فکر سرسید دراصل تاریخ اسلامی کا ایک دور ہے جو تاحال جاری ہے۔ سرسید مرحوم نے جو

پودا علی گڑھ کی صورت میں لگایا تھا وہ ان کے بعد ایک تناور درخت بنا اور خوب برگ و بار لایا۔ برصغیر میں قائم ہونے والے تمام اسلامیہ کالجوں اور اسلامیہ ہائی سکولوں کا تعلق علی گڑھ سے وہی ہے جو روئے زمین کی تمام مساجد کا خانہ کعبہ کے ساتھ۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ملت اسلامیہ پاک و ہند کے تمام جدید تعلیم یافتہ عناصر شعوری طور پر اسی مکتبہ فکر سے متعلق و منسلک ہیں جس کی ابتدا سرسید مرحوم نے کی تھی۔

(اسلام اور پاکستان ص ۵۸۔۵۹)

پروفیسر اسرار احمد سہاوری

احیائے فکرِ سرسید کی تحریک کا پس منظر:

کچھ عرصہ سے لوگوں نے سرسید کے معتقدات کی طرف پھر توجہ فرمائی ہے اور اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان حضرات کو سرسید کی ذات یا ان کے مذہبی خیالات سے کچھ دلچسپی پیدا ہو گئی ہے یا سرسید کی ذات کو وہ لوگوں کے نسیان اور فراموش کاری سے بچانا چاہتے ہیں، بلکہ اصل وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ سرسید کے اعتقادات آج کل ان حضرات کے لئے بڑی حد تک مفید ثابت ہو سکتے ہیں اور ان کے اعتقادات کی نئی عمارت میں سرسید کے عقائد اور تصورات اینٹ گارے کا کام دے سکتے ہیں۔ اس طرح سے کچھ رخصتیں حاصل ہو جاتی ہیں، کچھ مغربی اعتقادات اور تصورات کے قریب ہو جاتے ہیں، کچھ تجدید و احیاء دین کا طرہ امتیاز حاصل کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر یہ حضرات بڑے جوش خروش سے سرسید کی زندگی اور ان کے مذہبی عقائد، معاشرتی تصورات اور اصلاحی خیالات کی طرف متوجہ نظر آتے ہیں۔

(نمود فن ص ۷۴)

حضرت عیسیٰ کے بن باپ پیدا ہونے سے انکار کی غیر معقول توجیہہ:

اسلام کو فطرت کے عین مطابق ثابت کرنے کے چکر میں انہوں نے خوارق اور

معجزات سے بھی سرے سے انکار کردیا ہے۔ کسی نبی کے معجزے کو وہ تسلیم نہیں کرتے، حضرت عیسیٰ کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کے منکر ہیں۔ کہتے ہیں کہ یوسف نجار اُن کا باپ تھا۔ حضرت مریم کے اس قول کی کہ مجھے کس مرد نے نہیں چھوا، میرے بچہ کس طرح پیدا ہوسکتا ہے۔ وہ اس طرح توجیہہ کردیتے ہیں کہ یہ شادی سے پہلے کی بات ہے، بعد میں انہوں نے یوسف سے شادی کرلی تھی۔ لیکن اس کا ان کے پاس کیا جواب ہوگا کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے بعد لوگوں نے حضرت مریم کو طعنے دئے کہ تیری ماں بدکار نہ تھی، تیرا بھائی اور باپ نیک آدمی تھے؟ پھر حضرت مریم نے خود معصوم بچے کی گواہی اپنی عصمت کے بارے میں پیش کی۔ ان تمام باتوں کا ان کے پاس کوئی معقول جواب نہیں۔ اس قسم کے اعتراضات ان کی دوسری توجیہات پر، جو انہوں نے معجزات کے متعلق پیش کی ہیں، وارد ہوتے ہیں۔ (ایضاً ص ۸۲۔۸۳)

اسرارِ عالم

اُمت میں کمیونزم، دہریت، سوشلزم، سیکولرزم پیدا کرنے کی تحریک:

غیر منقسم ہندوستان کے پیٹرن (Pattern) کا آغاز سرسید احمد خاں سے ہوتا ہے۔ ان کے مزاج کی تبدیلی ۱۸۴۰ء کے بعد ہوئی۔ سرسید نے سیکولرائزیشن کی طرف پہلا قدم ۱۸۶۴ء میں بڑھایا۔ بہت ممکن ہے کہ وہ اپنی ذات کے اعتبار سے اسلام اور مسلمانوں کے لئے مخلص ہوں لیکن ایسا لگتا ہے کہ وہ ایسے لوگوں میں گھر گئے جو فری میسن ہو چکے تھے۔ ان میں مراد آباد کے راجہ جے کشن اور سلطنت آصفیہ کے سرسالار جنگ قابلِ ذکر ہیں۔ سرسید کی ان کوششوں کے پیچھے کون سی قوت کارفرما تھی اور ان کے کیا کیا مقاصد تھے اور ان کا نصب العین کیا تھا، اس کے لئے ایک اقتباس کافی ہوگا۔ یہ ایک ڈسپیچ (Dispatch) ہے جو لندن ٹائمز کے نمائندے نے کلکتے سے بھیجا تھا اور جو لندن ٹائمز کی ۲۲ جنوری ۱۸۷۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اقتباس درج ذیل ہے:

"گزشتہ دوشنبہ کو ہمارے کلکتہ آفس سے جو خبر موصول ہوئی ہے اس میں ایک مختصر اطلاع دی گئی ہے کہ لارڈ لٹن نے علی گڑھ میں محمڈن کالج کا سنگ بنیاد رکھا......"

''ہمارے لئے مسلمانوں کی سخت تر طبیعت پر قابو پانا زیادہ مشکل تھا اور اس کو قابو میں لانا قدر و قیمت کے اعتبار سے بھی بہتر تھا لیکن یہ کام بے انتہا دشوار تھا۔ اپنے مسلک اور اپنی تاریخ کے پیش نظر وہ ہم کو اپنا حریف سمجھتا ہے۔ طاقت سے محروم ہو جانے کے سبب سے وہ افسردہ رہا ہے کہ پہلے کی طرح وہ اپنا اثر و اقتدار منوا نہیں سکتا تھا لیکن وہ برابر اس کا متوقع اور منتظر رہا ہے کہ اس کی غلامی کا عہد ختم ہو جائے گا اور وہ اس زنجیر سے آزاد ہو جائے گا جس سے اس کے نئے آقا تدبیر و تزویر سے اس کو جکڑتے جاتے تھے ''

''علی گڑھ کا یہ کالج اس امر کا مستقل ثبوت ہے کہ بالآخر ہماری مساعی کتنی سنگلاخ شے پر اثر انداز ہوئیں جن کا ہم کو سابقہ تھا، اور اسی بنا پر اس تحریک کو شکل دینا اور اس کی ترقی میں معاون ہونا جتنا زیادہ مشکل ہے اتنا ہی حق بجانب ہے ''

''علاوہ بریں ایک امید افزا علامت غیر متوقع لامذہبی (Secular) رواداری کی روح کی کارفرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ مسلک اسلامی ہوگا لیکن مسلمانوں کے ساتھ ساتھ بے دین (Giaour) کو بھی اس کا حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنی قابلیت سے یہاں کے فوائد حاصل کرے اپنے کو مستحق ثابت کریں۔ آزادیٔ خیال کے راستے میں یقیناً یہ ایک پیش قدمی ہے جس کو تقریباً حال ہی میں لیکن نامکمل طور پر ہم نے حاصل کیا ہے اور جس کے بارے میں ہم کو بہت کم توقع تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کی مستحکم صف میں اسی طرح تمام و کمال راہ پا سکے گی''۔

اس طویل اقتباس سے اس کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ سر سید خواہ کچھ بھی سوچ رہے ہوں لیکن جو قوت ان کے پیچھے کارفرما تھی، اس کا مقصد کیا تھا۔ چنانچہ یہ ایک المیہ ہے کہ گزشتہ ایک سو سالوں میں جہاں ہندوستان کی دیگر قومیں علم و فن میں خوب ترقی کرتی گئیں اور ان میں ایسی قیادت بھی پیدا ہوئی جو اُن کی ایسی امنگوں کی عکاس اور آئینہ دار تھی جن کا تعلق براہ راست ان کے عقائد کے سرچشموں سے تھا، وہیں علی گڑھ تحریک اور اس کی بنائی ہوئی فضا اپنے قیام سے لے کر اب تک مجموعی اعتبار سے امت کے لئے ہمیشہ مسئلہ بنی رہی۔ بظاہر وہ امت کی امنگوں کی نمائندگی بھی کرتی رہی اور فی الاصل وہاں امت اور دین کی بیخ کنی بھی ہوتی رہی، چنانچہ گزشتہ ستر سالوں میں وہاں کی مایہ ناز نسلیں امت میں کمیونزم، دہریت، سوشلزم، ترقی پسندانہ

...ستان ...

رجحانات اور مغرب پسندی پیدا کرنے کا باعث ہوئیں۔ علی گڑھ کی تحریک مسلمانوں کو اسلام سے لاتعلق کر کے مغربی بنانے کی کوشش نہیں تھی بلکہ اسلام اور مسلمان رکھتے ہوئے ان کو سیکولرائز کرنے کی کوشش تھی۔ اس امنڈتے ہوئے سیلاب کے سامنے سب سے بڑا بند باندھنے کی کوشش علامہ اقبال نے کی اور جو کچھ تبدیلی نظر آتی ہے وہ انہی کی دین ہے۔ آج امت میں قیادت کا جو خلا یا عدم توازن ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ امت کا فکری، علمی، روحانی سرمایہ علی گڑھ تحریک کی بنائی ہوئی فضا میں، جو برصغیر کے ہر خطے میں پھیل چکی تھی، گزشتہ سو سالوں سے ضائع ہوتا رہا ہے۔

(بین الاقوامی ایجنسیوں کا تعارف اور اُن کا طریقہ کار، ص۲۲ تا ۲۵)

سرسید نے بالآخر وہی کرنے کا فیصلہ کرلیا جو یہودی امت مسلمہ کے لئے چاہتے تھے۔ پوری دنیا میں سرسید پہلے شخص ہیں جنہوں نے عالم اسلام میں اسلام کے تناظر میں سیکولرازم کی نظریہ سازی (Conceptualize) کی اور سیکولرائزیشن کی عملی کوششوں کو علمی اور فکری اظہار بیان دیا۔ اُن کا قول "ہمارے داہنے ہاتھ میں قرآن ہوگا اور بائیں ہاتھ میں سائنس اور سر پہ کلمہ طیبہ کا تاج" سیکولرائزیشن کی اپنے دور میں عدیم النظیر نظریہ سازی تھی۔

(ساحل کراچی، اپریل ۱۹۹۸ء، ص۸۵)

پروفیسر اسلوب احمد انصاری

ہر بحث کی تان کا توڑ نیچر کے اپنے تصور پر:

چونکہ ہم یورپ کی ہر ذہنی تحریک اور زاویہ نظر کی باقیات سے چمٹے رہنے کے عادی ہیں اس لئے سرسید نے بھی انیسویں صدی میں اٹھارہویں صدی انگلستان میں مروج نظریات و آرا کا اعادہ ضروری خیال کیا، اور اس طرح گویا مسلمہ اصول تعبیر و تفسیر میں تبدیلی پیدا کرکے ایک نئے باب کا اضافہ کرنا چاہا۔ سرسید نے مذہبی مسائل کے بارے میں چند صحیح باتیں ضرور کہیں اور علمائے دین کی مخالفت سے نڈر ہوکر بلا جھجک اور پس و پیش کے کہیں، جس سے ان کی جسارتِ فکر اور طباعی کا پتہ چلتا ہے لیکن وہ ان معاملات کا ایک بہت ہی سادہ تصور رکھتے تھے

اور موجودہ مسئلے کا رشتہ اور بحث کی تان نتیجے کے اپنے تصور پر لاکر توڑتے تھے۔ سرسید نے جس طرح مذہب کو دوسرے علمی اور معاشرتی حقائق اور اصول سے الگ رکھنے کی سفارش کی ہے، وہ بھی محل نظر ہے۔ اسلام چونکہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اس لئے وہ روحانی اور سیکولر معاملات میں دوئی کو تسلیم نہیں کرتا، کہ اس میں یہ شیر وشکر کی طرح ملے ہوئے ہیں۔ سیاست دین سے کسی طور پر الگ نہیں ہے۔

(فکر ونظر علی گڑھ، سرسید نمبر ۱۹۹۲ء ص ۱۵۔۱۶)

پروفیسر اصغر عباس

سرسید کے افکار کی کتر بیونت:

کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے سرسید اپنے فرزندانِ معنوی، اور ان لوگوں سے جنھوں نے بالواسطہ سرسید اور ان کے ارادے سے کسب فیض کیا ہے، پوچھ رہے ہوں کہ قومی تعمیر کے لئے جو میرے منصوبے تھے اُن کے نفاذ کے سلسلے میں تم لوگوں نے کیا کیا؟ ہندوستان اور بیرون ملک یوم سرسید ..... یا سرسید کی برسی ..... بڑے زور شور سے مناتے ہیں، جلسے جلوس ہوتے ہیں اور ان جلسوں میں سرسید سے وہ باتیں بھی منسوب کردیتے ہیں جو اُن کی تقریر وتحریر میں کہیں دکھائی نہیں دیتیں۔ اکثر اس موقع پر بے معنی سیمینار ہوتے ہیں اور ان میں بھی سرسید کے افکار واعمال کی خوب کتر بیونت کی جاتی ہے۔ سرسید کے مزار پر پھولوں کی چادر بھی چڑھاتے ہیں اور قرآن خوانی بھی ہوتی ہے، احباب ڈنر کھاتے ہیں اور اس بہانے حکام بالا سے دید وشنید ہو جاتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ کیا یہی ظاہری نمود ونمائش سرسید جیسی قائم و دائم شخصیت کے خواب اور اس کے سوال کا جواب ہے؟ سرسید کی دلکشی کا راز ان کے افکار و اعمال کے علاوہ بہت کچھ ان کی قوی اور دانا ذات میں مضمر ہے۔ انہوں نے انتہائی پُر آشوب دور میں رہنمائی کا اور اصلاح کا مشکل کام انجام دیا تھا، فرسودہ خیالات اور باطل عقائد کی اصلاح کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے مذہب اور کٹر پن کے فرق کو بتایا تھا اور مذہب اور عقل کی دوئی کو مٹایا تھا۔ مذہب کے روایتی اور رسمی عناصر کو دور کرنے اور انسان دوستی اور رواداری کو

فروغ دینے کی نہ صرف کوشش کی تھی بلکہ اپنے اداروں میں اسے عملی جامہ پہنایا تھا۔ ان کا ذہن وسعت نظر کا اور ان کا قلب انسانی دردمندی کا بے مثال نمونہ تھا۔ ان کی تحریروں میں ہندوستان کے باسیوں ہندوؤں اور مسلمانوں سے بے پناہ پیار اور اپنے دیس سے والہانہ محبت ملتی ہے۔

(تہذیب کراچی، سرسید نمبر ۱۹۹۸ء ص ۸۰)

اصغر علی روحی

نیک نیتی سے مسلمانوں کی مذہبی مخالفت کا ملزم بننا:

سید صاحب نے جہاں اپنی دور بینی سے مسلمانوں کی معاشرت اور تمدن پر نظر ڈال کر انہیں ایک مغربی حکومت کی معاشرت اور تمدن کے رنگ میں رنگنا چاہا، ان کے مذہبی مسائل میں بھی ایک نئی تحقیق کی بنیاد قائم کرنی چاہی مگر افسوس کہ سید صاحب اس معاملہ میں کامیاب نہ ہو سکے اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ خود علوم جدیدہ کی تعلیم سے بالکل بے بہرہ تھے اور جو کچھ تھا وہ محض اسی سنی سنائی باتوں کا ذخیرہ تھا۔ آپ نے کچھ علمی انگریزی کتابوں کا ترجمہ سنا اور کچھ مغربی مصنفین کے ان خیالات کو بہم پہنچایا جنہوں نے گاہ بے گاہ مذہب اسلام پر نکتہ چینیاں کی ہیں اور کچھ مشرقی متکلمین بالخصوص معتزلہ فرقہ کے استدلالات کو جو عقلیات میں زیادہ زور مارتے ہیں، حاصل کیا۔ اس طرح ان کے پاس ایسا ذخیرہ موجود ہو گیا جس پر انہوں نے موجودہ نئی پیدا ہونے والی امت کے خیالات کو جانچنا شروع کیا کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ مغربی علوم کی رو سے ایک دن ایسی تند ہوا چلے گی کہ مذہب کی بنیاد کو بالکل بہا لے جائے گی۔ کوئی ایسی صورت ہو جس سے نوتعلیم یافتگان ملک کو مذہب اور علوم جدیدہ میں کسی قسم کا تخالف نہ معلوم ہو کیونکہ علمائے اسلام نے بھی فلسفہ یونان کے عام شائع ہو جانے پر ایسا ہی کیا تھا۔ چنانچہ ان کا خود یہ قول مشہور ہے کہ میں نے جو کچھ کیا نئی امت کے لوگوں کی خاطر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس خیال سے سید صاحب کی نیک نیتی کا ثبوت ملتا ہے مگر افسوس کہ جو کچھ آپ نے کیا وہ بقول:

جو چال ہم چلے سو نہایت بُری چلے

"مدرکنا و بدتر از گناہ" کا مصداق تھا۔ علمائے اسلام نے تو اصول فلسفہ یونان کو کہیں غلط ثابت کیا اور کہیں ان کو صحیح تسلیم کرکے مسائل کو پایۂ ثبوت تک پہنچایا۔ الغرض معتقدات قرآن وسنت سے قرون اولی کے بزرگان میں صحیح تسلیم کئے گئے تھے ان کو ان کی اصلی صورت سے بال بھر بھی ہٹنے نہ دیا مگر سید صاحب نے یہ کوشش کی کہ سب پر پانی پھیر دکھایا اور خم ٹھونک کر علمائے اسلام کے مقابلہ میں نئے کلام کے موجد ہونے کا دعوی کیا۔ مگر کوئی حقیقت بین اگر بنظر انصاف دیکھے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ محض انکار ہی انکار تو کوئی نئی ایجاد نہیں ہو سکتی۔ بات تو تب تھی کہ انہی معتقدات کو علوم جدیدہ کے اصول پر پایۂ ثبوت تک پہنچا کر یورپ کے دہریوں کا منہ توڑ دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک یورپین معترض نے یہ کہا تھا کہ سید صاحب کی تحریریں اسلام کے ان معتقدات کو ثابت نہیں کرتیں جو عرصہ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال سے روئے زمین کے مسلمانوں میں تسلیم کئے گئے ہیں مگر سید صاحب ایسا کرنے پر مجبور بھی تھے کیونکہ علوم جدیدہ کے نئے نئے دلربا کرشموں کے مقابلہ میں ایسے لوگوں کو جو تعلیم مذہب سے نا آشنا ہوں اور سائنس و فلسفہ کی عجیب وغریب تحقیقات میں شب و روز منہمک ہوں ملائکہ، جن، معجزات، جنت و نار وغیرہ پر ایمان کے لئے مجبور کرنا آسان کام نہیں تھا، گویا سید صاحب نے نہایت نیک نیتی سے مسلمانوں کی مذہبی مخالفت کا الزام اپنے سر لیا۔

(مانی الاسلام، جلد اول، ص ۳۵۲-۳۵۳)

کم لیاقتی یا جان بوجھ کر اخفائے حق:

سچ پوچھو تو سید صاحب کو ایک خبط سا ہو گیا تھا، بس اسی میں آپ کی عمر صرف ہوگئی اور فہم معانی قرآن مجید میں اپنی کم لیاقتی سے یا جان بوجھ کر اخفائے حق کرتے رہے سید صاحب علم اصول سے ناواقف تھے۔ ان کے ہاں ملحدان یورپ کی چند باتیں معیار سمجھی گئی ہیں، انہی پر آیات قرآنیہ کو پرکھنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جابجا ٹھوکریں کھاتے چلے گئے۔

(ایضاً ص ۳۷۱-۳۷۲)

افتخار احمد بلخی

انکار حدیث کی سب سے پہلی آواز:

انگریزوں کے لائے ہوئے ملحدانہ فلسفہ ونظریات کے دور میں انکار حدیث کی سب سے پہلی آواز دبستان علی گڑھ کی جانب سے بلند ہوئی اور اس لئے بلند ہوئی کہ ایک طرف اسلامی درک وبصیرت کے ساتھ خیرسا واجبی سا تعلق تھا اور دوسری طرف اپنے زمانہ کی تحقیقات اور ان کے قیاسی نتائج کو یقینی وقطعی تسلیم کرلیا گیا، اس لئے ضروری ہوا کہ اسلامی تعلیمات اور مسائل شرعیہ کو ان کے مطابق ڈھالا جائے، اور یہ کام نہیں ہوسکتا تھا تاوقتیکہ آیات کی تعبیر وتاویل کے لئے کھلی چھٹی حاصل نہ کرلی جائے۔ قرآن کے الفاظ اور مفہوم مثلاً اس وقت تک نہ ہوسکتا تھا جب تک کہ درمیان سے ان تشریحات وتفاسیر کو ہٹانہ دیا جائے جو قرآن کے منشا کو متعین کرنے والی ہیں، اور وہ تشریحات وتوضیحات رسول کی ہیں اس لئے حدیث کی حجیت سے قطعی انکار کردیا گیا تاکہ قرآنی آیات کو توڑ مروڑ کر حسب خواہش ہر انداز میں ڈھالا جاسکے۔

(فتنہ انکار حدیث کا منظر وپس منظر، جلد ا، ص ۱۲)

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی

قوم کو انگریز بنادینے کے درپے:

سرسید فطرتاً انتہا پسند تھے۔ انگریزیت کی طرف مائل ہوئے تو حد سے گزر گئے۔ سفر انگلستان کے بعد ان کی مرعوبیت کا یہ عالم ہوا کہ وہ اہل مغرب کی ''اخلاقی اور تعلیمی اور نفسانی اور صفائی اور خوش سلیقگی اور ہنر وکمال'' کی تعریف کرتے ہوئے اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں:

''تمام خوبیاں دینی اور دنیوی، جو انسان میں ہونی چاہییں، وہ خدا تعالیٰ نے یورپ کو اور بالتخصیص انگلینڈ کو مرحمت فرمائی ہیں۔''

یورپ سے واپسی کے بعد انہوں نے پوری قوم کو مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگنے کی کوشش شروع کردی۔ بہت جلد سرسید کے اور بھی "رازداں" پیدا ہوگئے۔ نواب محسن الملک "پیروی مغربی" میں ان سے بھی آگے نکل گئے ان بزرگوں کے زیر اثر نئی نسل مغرب کی اندھی تقلید کی رو میں بہہ نکلی ۱۸۸۸ء تک جو نتائج رونما ہوئے وہ کچھ کم تشویش ناک نہ تھے۔ سرسید کے صاحب زادے جسٹس محمود کی ذہنی صلاحیتیں غرق مئے ناب ہورہی تھیں۔ وقارالملک کے بڑے بیٹے محمد احمد نے "مواکلت ومناکحت" کی رخصت سے پورا فائدہ اٹھایا اور انگلستان سے میم اور شراب ساتھ لے کر لوٹے۔ ۱۸۸۳ء میں مسٹر بیک کی پرنسپلی کا دور شروع ہو چکا تھا اور یورپین سٹاف کالج کا لازمی جزو بن چکا تھا۔ علی گڑھ کے نونہالوں کے سامنے زندگی کا صرف ایک نصب العین باقی رہ گیا: "حقیقی معنوں میں جنٹلمین بننا"۔ وہ اپنے انگریز پرنسپل اور اساتذہ کی رہنمائی میں اس نصب العین کی خاطر اپنی تہذیبی روایات سے بیگانہ ہوتے جارہے تھے سرسید قوم کی قلب ماہیت کے خواہاں تھے اور اسے انگریز بنادینے کے درپے رہے سرسید کی انتہا پسندی سے مولانا حالی کو بھی اختلاف تھا لیکن وہ اپنی مرعوبیت اور مروت کی وجہ سے سرسید کی تردید کی جرأت نہ کرسکے، حتیٰ کہ سرسید کے بعد بھی وہ نثر میں "مدلل مداحی" سے آگے نہیں بڑھے۔

(مولوی نذیر احمد دہلوی، احوال وآثار: ص ۳۸۷ تا ۳۹۰)

قرآن کو "مشرف بہ سائنس" کرنے کی کوشش:

قرآن کی جو تفسیر وتشریح مفسرین کرام اور علمائے امت نے کی ہے اس سے بھی وہ متفق نہیں، چنانچہ قوانین فطرت اور تجرباتی عقل کو حکم بنا کر انہوں نے قرآن کو "مشرف بہ سائنس" کرنے کی کوشش کی۔ وحی، معجزہ، کرامات، فرشتہ، شیطان، غرض تمام ماورائی حقائق کی دوراز کار عقلی تاویلیں پیش کیں۔ جنت، دوزخ، سزا وجزا کی آیات کو استعارہ وتمثیل قرار دیا۔ غرض عقائد وایمانیات میں جو بات تجرباتی عقل کی کسوٹی پر پوری نہ اُتری اس کے وجود سے انکار کردیا ممکن ہے، بعض متشککین کسی مسئلے میں سرسید کی تاویلوں سے مطمئن ہوگئے ہوں لیکن "باب تاویل کھل جانے سے" مذہب کے ساتھ تمسخر واستہزا کا رجحان پیدا ہوگیا اور نئے

نئے فتنوں کی راہ کھل گئی۔ (ایضاً ص۳۹۴۔۳۹۵)

طبقہ شرفا کی بحالی کا مشن:

تعلیم کے معاملے میں سرسید کے پیش نظر صرف طبقہ شرفا کی بحالی تھی جو انگریزی راج میں اعلیٰ عہدوں اور جاگیروں سے محروم ہوگئے تھے۔ (ایضاً ص۱۷۹)

اقبال احمد سہیل

تفسیری جدت طرازیوں کا اصل ماخذ:

سرسید نے اپنی تفسیر میں جو جدت طرازیاں کی ہیں، وہ خود ان کے دل ودماغ کی پیداوار نہ تھیں بلکہ ان کا بڑا حصہ مولانا فاروق کے بڑے بھائی مولانا عنایت رسول چریاکوٹی مرحوم کے خرمنِ کمال سے مستعار تھا۔

(بحوالہ ''یادگارِ شبلی''، ص۴۵)

پروفیسر اقتدار حسین خاں

دو قومی نظریے کا حامی ہونے کے الزام سے بریت:

سرسید کے اردو سے عشق اور اس کے لئے جدوجہد کو دیکھتے ہوئے بعض تنگ نظر حضرات نے سرسید کو متعصب اور دو قومی نظریے کا حامی بتایا ہے اور ان کے بعض وقتی اور جذباتی بیانات کو مسخ کرکے پیش کیا ہے اور کئی طرح سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انہوں نے اس سلسلے میں جو اپنی عوامی زندگی کے آغاز میں موقف اختیار کیا تھا۔ وہ بات بعد میں نہ رہی۔ سرسید نے آخری وقت تک اپنی عوامی زندگی میں ایک قومی نظریہ اپنایا کیونکہ وہ نہ صرف یہ جانتے تھے کہ کوئی بھی تعمیری اور مثبت کام بغیر ہندو مسلم اتحاد کے ممکن نہیں بلکہ یہ ان کی پالیسی نہیں، ایک عقیدہ تھا۔

(تہذیب کراچی، اکتوبر ۲۰۰۰ء، ص۱۴۔۱۵)

پروفیسر اقتدار عالم خاں

نا قابلِ توجیہہ اور قابلِ نظر اندازی پہلو:

سرسید احمد خاں کے بارے میں آج کے زمانے میں کوئی ایک بات نہیں کہہ سکتے ہیں۔ ان کا ایک پہلو ایسا ہے جسے ہمیں نظر انداز کرنا پڑے گا لیکن دوسرا پہلو ایسا ہے جس کا ہم بار بار ذکر کر سکتے ہیں، اس سے ایک اچھی فضا بنا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر جس حد تک انہوں نے کانگرس کی مخالفت کی، اس کی تشریح کرنا بہت مشکل ہے۔ اس وقت بھی جب بہت سے روشن خیال لوگ ایک ایسی تحریک کی ضرورت محسوس کر رہے تھے، سرسید نے جس شدت سے اس کی مخالفت کی اس کا بہت زیادہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے لوگوں نے غلط طور پر استعمال بھی کیا ہے۔ ہندوؤں کے نمائندے جب باتیں کرتے ہیں تو وہ اس کا غلط مطلب نکالتے ہیں۔ پاکستان کی تحریک کے لوگوں نے بھی اس کا غلط استعمال کیا۔ ہمیں اس کی اب بہت ضرورت نہیں ہے۔ بعض سماجی معاملات میں وہ جس طرح بہت صاف صاف الفاظ میں عورتوں کی تعلیم اور خاص طور سے اسکولوں اور کالجوں میں ان کی تعلیم کے مخالف تھے، اس کی ہم کوئی توجیہہ نہیں کر سکتے۔ شاید وہ سمجھتے تھے کہ اس سے پردہ ختم ہو جائے گا جو اچھی بات نہیں ہے۔ اس طرح وہ پردہ کے بھی شدید حامی کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، مارچ اپریل ۱۹۹۸ء: ص ۴۵)

علی گڑھ تحریک اور اس کا بنیادی رجحان:

علی گڑھ تحریک اردو بولنے والے مسلم اشراف کی تحریک تھی۔ یہ اس بات کی ایک کوشش تھی کہ مسلم اشراف کو مغربی تعلیم سے روشناس کرایا جائے۔ (ایضاً: ص ۸۴)

سرسید ... کی کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' کو دیکھیں جو صحیح معنوں میں تاریخ کی کتاب نہیں ہے، یعنی یہ کہ صرف مسلمانوں کے رول (Rule) کو پیش کرتی ہے تو اس میں بھی برٹش پیریڈ سے پہلے کا جو ذکر ہے اس میں ہندوؤں کے ساتھ اورنگ زیب کے سختی کے رویے

کی وہ تنقید کرتے ہیں اور اکبر نے جس طرح مختلف طبقوں کے لوگوں کو اپنانے کی کوشش کی اس کی پس پردہ تعریف کی ہے۔ یہی مخصوص رجحان علی گڑھ تحریک کا رجحان ہے جو ایک اور مصنف محمد حسین آزاد کے یہاں بھی ملتا ہے وہ سب سے زیادہ جس بادشاہ کی تعریف کرتے ہیں وہ اکبر ہے اور اس بات کی تعریف کرتے ہیں کہ اس نے مختلف فرقوں اور مذاہب کے لوگوں کو اپنی حکومت میں جگہ دی۔ اس کے برخلاف وہ اورنگ زیب کا مضحکہ اڑاتے ہیں ہندوستان کی تاریخ کے تئیں یہ رویہ، جو مذہبی منافرت کے رویے کو ترک کرکے تہذیبی لین دین کے رویے کو اہمیت دیتا تھا، علی گڑھ تحریک کا بنیادی رجحان تھا اور سرسید کے نقطۂ نظر کو پیش کرتا تھا۔ (ایضاً ص ۸۵-۸۶)

امیر افضل خاں

سرسید کا کردار:

سرسید کا کردار ''غلام کذاب'' (غلام احمد قادیانی) سے بھی گیا گزرا ہوا ہے، اور جتنا نقصان سرسید نے کیا یا سرسید کے نام سے جتنا فساد پھیل رہا ہے، اتنا نقصان غلام کذاب سے بھی نہیں ہو رہا۔ ہماری موجودہ تعلیم بے مقصد ہے اور سرسید کو جتنا جلدی ''دفن'' کردیں اتنا ہی بہتر ہوگا۔ ہم اس کے نام سے اور یونیورسٹیاں قائم کرنا چاہتے ہیں کہ بالکل اندھے ہوگئے ہیں سرسید کی تعلیم مادیت کی تعلیم ہے کہ نوکری کیسے حاصل کی جائے، بابو کیسے بنا جائے، تجارت میں سود در سود کی حرام کمائی کیسے کھائی جائے، سٹہ اور دلالی کیسے کی جائے یعنی سارا تجارت، مالیات، معاشرت اور مدنیت باطل فلسفوں پر مبنی ہے بلکہ تاریخ کی کتابیں بھی وہ پڑھائی جاتی ہیں جو انگریز مسٹر جی ایس ایلیٹ نے لکھیں یا جادوناتھ سرکار نے...... ہاں: صرف دو غیر جانب دار مضامین ہیں وہ سائنس اور ٹیکنالوجی ہیں۔ لیکن جب سرسید نے علی گڑھ میں کام شروع کیا تو وہاں سائنس پڑھائی ہی نہیں جاتی تھی۔ وہ سائنس کے ساتھ اپنی ثقافت کی یلغار بھی کردیتے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تحقیق بھی ہمیں خود کرنا ہوگی اور اسلام کے لحاظ

زندگی بسر کرتا ہے کہ غیرت اور عقیدہ کی حفاظت، اس کے سب کام اللہ اور رسولؐ کے لئے ہوں، نہ کہ غلام کذاب اور سرسید کی نقل کہ وہ سب کچھ اپنے حاکم وقت کی خوشنودی کے لئے کرتے تھے۔

(الحق اکوڑہ خٹک، نومبر ۸۴ ص ۴۹۔۵۰)

خدائی میں شرکت:

ہم نے سرسید کو اپنا ایک رہنما بنالیا ہے کہ وہ دوقوم کے نظریے کا بانی ہے تو ہم اس کو خدائی میں شرکت دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن پاک کی سورۃ المجادلہ میں حزب اللہ اور حزب الشیطٰن دو قوموں میں ہمیں بانٹ دیا اور جگہ جگہ کافر اور مسلمان دو الگ قوموں کا ذکر ہے۔ علاوہ ازیں سرسید اپنے آپ کو نیچری کہتا تھا، حیات بعد الموت کا قائل نہ تھا، دوزخ اور جنت کے الفاظ کو استعارے قرار دیتا تھا۔ سرسید اور غلام کذاب دونوں کو کسی ایک جگہ سے ایک جیسی ہدایات ملتی تھیں کہ دونوں نے جہاد کو ترک کرنے اور ملکہ معظمہ وکٹوریہ کی وفاداری کے لئے اپنی تحریروں میں الفاظ بھی ایک جیسے استعمال کئے ہیں، اور ادھر ہم لوگ جمال الدین افغانی کے پین اسلام ازم کی تحریک سے بھی متاثر ہیں تو اگر ان کی تحریریں پڑھی جائیں تو وہ سرسید کو انگریزوں کا پٹھو کہتے تھے اس کے علاوہ سرسید جو تعلیم کا سلسلہ جاری کرگیا اس کو ہم لارڈ میکالے کی تعلیم کہتے ہیں کہ ایسی تعلیم نے ہمارا بیڑہ غرق کردیا ہے۔

(نوائے وقت لاہور، ۲۷ جولائی ۲۰۰۳ء میگزین ص ۹)

سید انصار ناصری

مخالفین کی فہرست میں زبردستی شمار:

ایک عام سا اصول گھڑ لیا گیا ہے کہ سرسید علیہ رحمتہ کے معاصرین میں سے جو بھی ذی قدر شخصیت اُن کی کلی طور پر ہمنوا اور شریک کار نہ ہوئی، اُسے آنکھ بند کرکے اُن کے ''مخالفین'' کی فہرست میں شمار کیا جائے حالانکہ ارباب نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اُن کے

قریب تر شرکائے کار میں بھی بعض اصحاب کئی معاملوں میں اُن کے صد فی صد ہمنوا اور ہم خیال نہ تھے۔ اور بعض ایسے مقتدر حضرات سے جو عملاً اُن کے ساتھ نہ تھے، سرسید علیہ رحمتہ خود بعض اہم معاملوں میں صلاح مشورے کرتے رہتے تھے۔ مثلاً مولوی امداد العلی صاحب، جنہوں نے اپنے اخبار ''نورالآفاق'' کے ذریعے اُن کے نیچری معتقدات کی سختی کے ساتھ مخالفت کی لیکن تعلیمی اور اصلاحی کوششوں کی ہمیشہ حمایت کی۔ سرسید مرحوم انہیں اپنا ''شفیق دوست'' کہتے تھے۔ اسی گروہ میں میر ناصر علی صاحب کا بھی شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے بھی مولوی امداد العلی صاحب اور حاجی علی بخش وغیرہم کی تائید سے سرسید علیہ رحمتہ کے نیچری خیالات پر تنقیدیں کیں لیکن اُن کے اصل مشن سے کبھی تعرض نہ کیا۔

(مقامات ناصری: ص ۱۵۶)

انعام الرحمٰن

عقل پسندی -- انگریزوں سے مرعوبیت کی وجہ:

علی گڑھ کے بانی سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۸ء) تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ان کے ہاں عقل، مادیت اور معاش پر زور دینے کے باوجود ''مارکسسٹ اپروچ'' نظر نہیں آتی حالانکہ ۱۸۷۶ء میں ''سرمایہ'' شائع ہو چکی تھی۔ اگر سرسید نے مارکسزم کا بغور مطالعہ کیا ہوتا تو سرمایہ دارانہ فکر کی ''منفیت'' ان پر ضرور عیاں ہوتی اور وہ انگریزوں سے مصالحت کی پالیسی کے باوجود سرمایہ دارانہ فکر پر چند تحفظات کا اظہار ضرور کرتے۔ لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی عقل پسندی، ذہنی خود کفالت کا نتیجہ نہیں بلکہ انگریزوں سے مرعوبیت کے باعث تھی۔

(الشریعہ گوجرانوالہ، مارچ ۲۰۰۴ء: ص ۲۶)

پروفیسر انور معظم

قدیم و جدید علوم سے ادھوری واقفیت:

سرسید تفسیر لکھنے کے مقصد کے بارے میں الجھے نظر آتے ہیں۔ وہ اعتقاد کی بنا پر

مسلمانوں میں دو گروہ فرض کرتے ہیں۔ ایک وہ جو قدیم اعتقادات پر پکا ایمان رکھتا ہے اور ''قطب از جائی جنبد'' کے مصداق کسی تاویل کو سننے کو تیار نہیں، دوسرا وہ جو روشن خیال ہے اور اس کے اعتقادات میں ڈگمگا جانے کی صلاحیت موجود ہے ایک طرف وہ رائج اعتقادات کو مہمل تصور کرتے ہیں اور ان کی درستی کے لئے جدید علم کلام تشکیل دینا چاہتے ہیں کہ جو مسلمان اس علم کلام سے لیس رہیں گے وہ سچے مسلمان ہوں گے، دوسری طرف انہی رائج اعتقادات پر ایمان راسخ رکھنے والوں کو یقین کا ستارہ اور سچا مسلمان بھی تسلیم کرتے ہیں اور تیسری طرف یہ امر بھی قابل غور ہے کہ نئے سچے مسلمان کو بنانے کے لئے وہ اعتقادات کو جس شکل میں ڈھالنا چاہتے ہیں، وہ اس شکل سے بے حد مختلف ہے جو پہلے سے راسخ الایمان مسلمانوں کے دلوں میں موجود ہے۔ اس طرح مسلمانوں میں ایسے دو مکاتیب خیال کو سرسید کی تائید حاصل تھی جو عقیدتاً باہم متضاد اور متصادم تھے۔ سرسید کی نیک نیتی میں کلام نہیں، وہ خلوصِ دل سے نئے ذہن کو ان ہتھیاروں سے لیس کرنا چاہتے تھے جو اُن کے خیال میں اسلام کو تجرباتی عقلیت کے مہلک حملوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ضروری تھے لیکن انہیں یا تو قدیم وجدید میں مفاہمت کی ایسی غیر ماہرانہ کوشش سے دامن بچانا چاہیے تھا جو اُلجھنوں کو حل کرنے کے بجائے بڑھا دیتی ہے، یا پھر قدیم وجدید علوم پر کامل دسترس کے بعد وہ ایسا نظام فکر پیش کرتے جو کمزور مفاہمت کے بجائے طاقتور انقلابی تجدیدیت کے پیروں پر چل کر اسلام کو قدامت کے دلدل سے باہر لا کھڑا کرتی۔ یہ کام سرسید کے بس کا نہیں تھا۔ سرسید کی استعداد علمی، خواہ قدیم ہو یا جدید، ایسی نہیں تھی کہ وہ اس فرض کو انجام دے سکتے سرسید نے تفسیر لکھی۔ اس سے ان کی انتہائی ذہانت کا پتہ چلتا ہے مگر یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ وہ اپنی ذہانت کے سوا کسی دوسرے علمی ماخذ یا مفکر سے استفادہ کرنا پسند نہیں کرتے، اور اگر انہوں نے ایسا کیا بھی تو اس سے صرف اپنے نقطہ نظر کی اجنبیت دور کرنا مقصود تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ ایسی شخصی فکر یا ذاتی اُپج ادبی میدان میں ضرور خراج تحسین حاصل کر سکتی ہے لیکن کسی ایسے نظام فکر کی تشکیل میں اس کا مؤثر ہونا مشکوک ہو جاتا ہے جس کا مزاج کئی صدیوں پر پھیلے ہوئے ان تمام تصورات سے عبارت ہے جن سے وہ کما حقہ آشنا نہ ہو۔ یہ امر لائق توجہ ہے کہ سرسید میں اس کمی کو ان کی مذہبی فکر کی صلابت کا ذمے دار بھی بتلایا گیا ہے،

چنانچہ پروفیسر محمد عمر الدین نے سرسید کی فکر کی تعمیر کا سہرا سرسید کی قدیم و جدید علوم سے ''ادھوری واقفیت'' کے سر باندھا ہے اگر اس خیال کو عمومیت دی جائے تو یہ اصول بنتا ہے کہ کسی موضوع پر موافق یا مخالف پہلوؤں سے ادھوری واقفیت ہی ایک بسیط فکر کی تعمیر کر سکتی ہے جو محل نظر ہے۔

(جامعہ نئی دہلی جولائی تا دسمبر ۱۹۹۸ء، ص ۱۵۷ تا ۱۲۲)

پروفیسر اولاد احمد صدیقی

بعد میں پیدا ہونے والے حالات کی پیداوار دو قومی نظریہ:

انہوں (سرسید) نے کانگرس کی اس وجہ سے مخالفت نہیں کی کہ وہ ایک ہندو جماعت تھی بلکہ اس لئے کہ وہ ایک نمائندہ حکومت کی حامی تھی۔ جمہوری خیالات کا تصور اس وقت ہمارے ملک میں ناپید تھا اس لئے مذہبی بنا پر تسلیم شدہ اکثریت اقلیت کے حقوق کی ضامن نہیں سمجھی گئی۔ دو قومی نظریہ کی نشو و نما ملک میں بعد میں رونما ہونے والے حالات اور واقعات کی پیداوار ہے۔ جو لوگ اس خیال کے حامی ہیں کہ صرف جداگانہ نمائندگی کے اصول کو تسلیم کرنا دو قومی نظریہ کا سنگ بنیاد ہے وہ تاریخ کو بعد کو پیش آنے والے مسائل اور واقعات کے پس منظر میں دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔

(مقالات قومی سرسید سیمنار: ص ۱۰۱)

تلاش و تحقیق کی جستجو کا فقدان:

سرسید کی معاشرتی اصلاح ہندوستانی مسلمانوں کی ترقی کی اشد ضرورت تھی افسوس صرف یہ ہے کہ کالج، جس کی خاطر انہوں نے اپنی معاشرتی اصلاح کو پس پشت ڈالا، اپنے رسالہ تہذیب الاخلاق کو بند کیا، انگریزوں سے وفاداری کی روایت قائم کی تا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم کا ایک جدید ادارہ وجود میں آ جائے، اس نے ہندوستانی مسلمانوں کو صرف معمولی تعلیم بہم پہنچائی تا کہ وہ سرکاری ملازمتوں کے اہل ہو سکیں۔ تلاش و

تحقیق کی جستجو، نئی راہوں کی نشاندہی، تشکیک، جو جدید ذہن کی نشانیاں ہیں، آج عام تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اتنی ہی مفقود ہیں جتنی سید احمد کے زمانے میں تھیں۔ (ایضاً ص ۱۰۰۔۱۰۲)

ڈاکٹر اے۔ ایچ۔ کوثر

کلامِ الٰہی کی عظمت کے خلاف نامناسب کوششیں:

ان کی عظمت و بلندی کی دلیل ان کا جدید مذہبی نظریہ فکر ہے۔ انہوں نے اسلام کی تعلیمات کے پیچیدہ مسائل کو جس عقل و فہم اور شرح و بصر کے ساتھ واضح کیا اور غیر ضروری جزئیات کو عقائد مذہبی سے خارج کیا، اس نازک دینی مسئلہ کی تصحیح کا کام سرسید جیسے باحوصلہ، باہمت اور عقل و فہم رکھنے والے انسان سے ہی ممکن تھا... ان کے جدید اسلامی نظریہ کی بنیاد جن اصولوں پر مرتب ہے وہ تقریباً تمام تر اسلامی تعلیمات کے مطابق ہیں لیکن جہاں انہوں نے ان اصولوں کی مدد سے آیات قرآنی کے مفہوم کو کھینچ تان کر علومِ جدیدہ کے مسائل کے مطابق کر دکھانے کی کوشش کی ہے، اس سے نہ صرف علومِ جدیدہ کے مقابلے میں قرآن شریف کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے بلکہ ایسے دنیاوی علوم و نظریات سے مطابقت دکھانا جو نئے نئے تجربوں، زمانہ و حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں، کلام الٰہی کی عظمت کے خلاف ہے اور کسی اعتبار سے بھی مناسب نہیں۔ یہ سرسید کی غلطی اور کمزوری تھی۔ اسی طرح بعض مذہبی مسائل کی وضاحت میں انہوں نے حد سے زیادہ عقل سے کام لے کر اجتہادی غلطیاں بھی کی ہیں۔ لیکن انسان خطا کا پتلا ہے۔ سرسید کوئی مذہبی مفکر، کوئی عالم دین نہ تھے۔ گو وہ مذہبی ماحول کے پروردہ تھے اور ان کی طبیعت کا رجحان بھی ابتدا سے مذہب کی طرف رہا لیکن وہ کوئی تبحر عالم عربی نہ تھے۔ دینی علوم و ماخذ پر ان کی نظر اتنی گہری اور ان کا مطالعہ اتنا وسیع نہ تھا کہ وہ تمام مذہبی مسائل سے بخوبی عہدہ برآ ہو جاتے۔ انہوں نے سیاسی مفاہمت کی تکمیل کے لئے مذہبی مفاہمت کا راستہ نکالا تھا۔ یہی مقصد اور غرض ان کو مذہبی میدان میں کھینچ لائی۔

(اردو کی علمی ترقی میں سرسید اور ان کے رفقاء کار کا حصہ: ص ۱۹۹)

ڈاکٹر ایچ۔بی۔خاں

بین الاقوامی سیاسی تبدیلی کے تصور کا فقدان:

سید احمد خاں ابتدا میں ملک کو دستوری مراعات دینے کے سب سے بڑے مناد تھے۔ وہ آخر میں حکومت کو یہ مشورہ دینے پر مجبور ہوئے کہ ملک کو سیاسی مراعات دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ آخر میں وہ انتخابی طرزِ حکومت دینے کے بھی خلاف ہو گئے تھے کیونکہ ان کی نظر اور فکر میں ان کے پیش نظر یہ امر تھا کہ مسلمان ایک عددی اقلیت ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ ہندوؤں کے دست نگر رہیں گے، بلکہ سید احمد خاں کا خیال یہ تھا کہ مسلمانانِ ہند انگریزوں کی وفاداری میں اپنا رشتہ خلافتِ ترکی سے بھی منقطع کر لیں۔ اسی نظریہ کے تحت آپ نے سید جمال الدین افغانی کے پان اسلامزم کی حمایت و تائید نہیں کی۔ وہ شاید اس بات کا تصور اور ادراک نہیں کر سکتے تھے کہ برطانیہ کو برصغیر میں دوام حاصل نہیں ہو سکے گا اور کچھ عرصہ کے بعد ان کو یہاں سے بے نیل و مرام واپس ہونا پڑے گا۔ وہ بین الاقوامی سیاسی تبدیلی اور حکومت کے مدوجزر کا بھی خیال نہیں رکھتے تھے، اس لئے وہ بین الاقوامی سیاسی تبدیلی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ موصوف کی ساری تحریریں بین الاقوامی تبدیلی کے تصور سے یکسر خالی ہیں۔

(تحریک علی گڑھ تا قیام پاکستان: ص ۳)

سرسید کے ساتھ ہی اُن کے عقلیت پسندانہ اسلام کی تدفین:

مذہبی نقطہ نظر سے تحریک علی گڑھ اپنے موسس اور بانی کی زندگی ہی میں ناکام رہی۔ سید احمد خاں نے ''تفسیر القرآن''، ''تہذیب الاخلاق'' اور دیگر تحریروں میں اسلام کی عقلیت پسندانہ ترجمانی کی جو اسلام کے بنیادی فلسفہ سے انحراف کے مترادف تھیں۔ چونکہ اسلام فطری مذہب ہے اور اس کا فلسفۂ حیات آفاقی اور الہامی بنیاد پر منحصر ہے اور طلبہ علی گڑھ کو عقلیت پسندی کی طرف مائل کر کے حقیقت پسندی اور آفاقی و فطری رجحانات سے دور رکھنے کی سعی کی گئی۔ سرسید غیر قدامت پسندانہ یا آزاد خیالی کو مسلمانوں میں متعارف کرانا

چاہتے تھے، جسے سرسید اپنے نزدیک مناسب سمجھتے تھے۔ اس کی تقلید یا پیروی کو طلبہ اور عام مسلمانوں کے لئے بھی عمل کرانے کے خواہش مند تھے اور سرسید کا یہ عقلیت پسندانہ اور غیر قدامت پسندانہ اسلام ان کی وفات کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لئے دفن ہوگیا۔ (ایضاً ص ۲۴۴)

پروفیسر بختیار حسین صدیقی

دنیاوی اور دینی علوم میں ربط کا فقدان:

سرسید نے جس درس گاہ کا نقشہ اپنے ذہن میں تیار کیا تھا، اس کے خدوخال کی وضاحت انہوں نے ان الفاظ میں کی تھی: ''فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا اله الا الله محمد رسول الله کا تاج ہمارے سر پر''۔ وہ عقلی اور نقلی علوم کے حسین امتزاج سے ''امت وسطی'' کا خمیر تیار کرنا چاہتے تھے، دین کی کنجی سے دنیا کا دروازہ کھولنا چاہتے تھے لیکن علی گڑھ ان کے اس فکری منصوبے پر پوری نہیں اُتری۔ علی گڑھ کا قصور یہ نہیں ہے کہ اس نے مسلمانوں کی مادی فلاح کی طرف توجہ کیوں دی، کیونکہ معاشی مسئلے کا حل کرنا بھی بلا شک وشبہ تعلیم کا ایک مقصد ہے۔ اس کا اصل قصور یہ ہے کہ وہ فلسفے اور سائنس کے عقلی علوم کی تعلیم پر دین کے نقلی علوم کی بالادستی کو قائم نہ رکھ سکا، وہ ''مشاہدات حکیم'' کو ''تجلیات کلیم'' سے ہم کنار نہ کر سکا، وہ دنیاوی علوم کو دینی علوم سے مربوط نہ کر سکا، وہ دین کی مدد سے دنیا میں حصہ لینا نہ سکھا سکا۔ سرسید کو اس بات کا تو احساس تھا کہ جدید علوم کو اسلام کی کسوٹی پر پرکھنا ضروری ہے لیکن انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ یہ کام کس طرح کیا جائے۔ انہوں نے علی گڑھ کے نصاب میں جدید علوم کے ساتھ اسلامیات کو ایک لازمی مضمون کی حیثیت دے دی اور فرض کرلیا کہ اس طرح وحی کے ذریعے حاصل ہونے والے علم اور عقل سے حاصل کردہ علم میں خود بخود ربط پیدا ہوجائے گا ..... اس طرح دینی عقائد واقدار کا شیشہ پاش پاش ہوا اور علم حق پر سائنس کی اجارہ داری قائم ہوگئی، مذہب انسان کا ایک نجی معاملہ ہوکر رہ گیا اور دنیوی معاملات میں اس کی گرفت ڈھیلی پڑگئی حالانکہ اسلام میں دین اور دنیا کی کوئی تفریق نہیں ہے۔
(مسلمانوں کی تعلیم فکر کا ارتقا: ص ۱۳۲۔۱۳۳)

علی گڑھ نے قوم کے نوجوانوں کو جس رنگ میں رنگا، وہ مذہبی رنگ نہیں تھا۔ اس نے بے روح مادیت کو فروغ دیا جو مغربی تہذیب کی ظاہری چمک دمک میں جلوہ گر ہے۔ اس نے سادہ زندگی اور اونچے خیالات کی بجائے اچھی تنخواہ اور آرام دہ زندگی کو قوم کا نصب العین بنایا۔ جس طرح روحانی پاکیزگی دیوبند کے حصے میں آئی، اسی طرح بے روح مادیت علی گڑھ کا مقدر بنی۔ (ایضاً ص ۱۳۵)

بشیر احمد ڈار

جہاد سے توجہ ہٹا کر تعمیری کاموں کی طرف لگائی:

سرسید کی تحریک مسلمانوں کی زندگی میں ایک تہذیبی اور ذہنی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، لیکن اس کی افادیت کے متعلق اس وقت بھی اور آج بھی بعض غلط فہمیاں موجود ہیں۔ بعض اس کی سیاسی نوعیت پر اور اکثر اس کی مذہبی تجدید پر معترض ہیں ..... سرسید کی نئی پالیسی کے جواز میں بعض لوگوں نے یہ دلیل بھی دی ہے کہ سید احمد بریلوی تحریک نہ عوامی تحریک تھی اور نہ اس کا مقصد انگریزوں کے خلاف جہاد تھا بلکہ صرف سکھوں کے مظالم کے خلاف ایک کوشش تھی لیکن یہ دونوں باتیں واقعات کے خلاف ہیں ..... اس تحریک کی ہمہ گیری کسی خاص طبقہ تک محدود نہ تھی بلکہ علما سے لے کر عوام تک سبھی اس میں شامل تھے اور کچھ کم پچاس برس تک خصوصاً شمالی ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی تمام قابلیتیں اسی مہم کی کامیابی میں صرف کر دیں۔ دوسری طرف یہ کہنا کہ اس تحریک کا تمام تر مقصد صرف سکھوں کے خلاف تھا، حالات کی غلط تعبیر اور اس کی صحیح عظمت سے انکار کے مترادف ہوگا۔ اس غلط نقطۂ نگاہ کو پیش کرنے کی ابتدا بھی شاید سرسید نے ہی ایک مقصد کے لئے کی تھی، جب انہوں نے ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کا جواب لکھا تھا ..... سرسید اس تحریک کے ابتدائی دور سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ کافی حد تک اس سے متفق بھی معلوم ہوتے ہیں۔ جب ''آثار الصنادید'' کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا (یعنی تقریباً ۱۸۴۵ء میں) تو انہوں نے جن الفاظ میں اس تحریک کے بانیوں کا ذکر کیا ہے، وہ ان کے دل کی حالت کا صحیح آئینہ ہے۔ ۱۸۵۷ء تک ان کے دل میں وہی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے جو

اس دور کے مسلمانوں میں تھا، یعنی انہیں امید تھی کہ اس طریقہ جہاد سے ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی اور معاشی حالت پھر سنبھل سکتی ہے۔ لیکن جب یہ تحریک اپنے اولین مقصد میں ناکام رہی اور اس کے بعد انگریزوں نے اس تحریک کے مختلف عناصر کو دبانے کی کوشش شروع کی تو اس وقت شاید سرسید کے دل میں پہلی بار احساس ہوا کہ یہ طریقہ اب کامیاب نہیں ہوسکتا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے صرف ۳ سال پہلے انہوں نے ''آثار الصنادید'' کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا تو اس دفعہ اس میں سے وہ تمام باب، جس میں اس تحریک اصلاح و جہاد کے بانیوں کا پرعقیدت بیان موجود تھا، بالکل نکال ڈالا۔ یہ ترمیم اس چیز کی غماز ہے کہ مسلمانوں کی حالت کو دیکھ کر سرسید اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ یہ راستہ اس قوم کی اصلاح کے لئے درست نہیں اسی لئے سرسید نے قوم کی توجہ جہاد سے ہٹا کر تعمیری کاموں کی طرف لگا دینی چاہی۔ جب اس نے کہا کہ تم انگریز کے وفادار ہو جاؤ اور اس سے تعاون کرو تو حالات کا تقاضا یہی تھا۔ بعض دفعہ جہاد سے ہٹ آنا بھی بزدلی نہیں بلکہ جواں مردی ہے تاکہ آئندہ زیادہ تیاری سے جہاد میں حصہ لیا جا سکے۔

(''ثقافت'' لاہور، اپریل ۱۹۵۶ء، ص ۵۴ تا ۵۷)

ہندوستان میں رائج مذہب قرآنی اسلام نہ تھا:

جس طرح تحریکِ جہاد کی ناکامی نے اس کو ایک نئے سیاسی پروگرام کا راستہ دکھایا اسی طرح اس سے سرسید نے اپنے لئے ایک نئے مذہبی فکر اور تصور کا نقشہ ذہن میں استوار کیا۔ اگر مذہب سے مراد وہ مذہب لیا جائے جس کے محافظ ترکی اور ہندوستان کے اس وقت کے علما تھے تو یقیناً سرسید اس کے خلاف تھے کیونکہ ان کے نزدیک جس چیز کے یہ محافظ تھے وہ اسلام نہ تھا جس کی تعلیم قرآن مجید دیتا تھا بلکہ یہ بعد کے فقہا اور علما کے فیصلوں اور آرا پر مبنی تھا جن کو تسلیم کرنا مسلمان کے نزدیک اس طرح ضروری اور فرض نہیں جس طرح قرآن مجید کے احکام یا رسول خدا کے اقوال۔ سرسید کو بلاشک شاہ اسمٰعیل شہید سے بہت عقیدت تھی...... لیکن جہاں تک اس تحریک کے سیاسی پہلو کا تعلق تھا وہ اسے ناقابل عمل سمجھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان میں مذہب کو سیاست کی بنیاد بنانا ایک بالکل غیر دانش مندانہ اقدام

ہوگا۔ ہمارے سیاسی اور معاشی تصورات، جن کو ہم اسلام کے نام پر پیش کرتے تھے اور جن پر سرِ مو انحراف ہمارے علما کے لئے قابل برداشت نہ تھا، زمانہ جدید کے لئے اس قدر ناقابل عمل تھے کہ ان کی روشنی میں کسی نئی سوسائٹی کی تعمیر ناممکن تھی، چنانچہ سرسید ان حالات میں مجبور تھے کہ مذہب کا ایسا تصور پیش کریں کہ اس کی اقدار قائم بھی رہیں اور مسلمانوں کو دورِ جدید کے نئے تقاضوں کے مطابق آگے چلنے کا موقع بھی حاصل رہے چنانچہ حکومت ترکیہ کے افسوس ناک حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ یہ تمام خرابیاں، بدعنوانیاں اور سیاسی کمزوریاں اسی غلط خیال کا نتیجہ ہیں جس کے بموجب دینی و دنیوی دونوں قسم کے کاموں کو مذہب میں شامل سمجھا ہے اور ''انتم اعلم بامور دنیاکم'' کے جملے کو چھوڑ دیا ہے۔ (ایضاً ص ۵۹۔۶۰)

جمال الدین افغانی کے غلط اور بے محل اعتراضات:

سرسید کی نگاہ میں مسلمانوں کی بین الاقوامی سیاست میں دلچسپیاں بھی کم خطرناک نہ تھیں۔ سلطان عبدالحمید نے ذاتی استحکام کی خاطر پین اسلامزم کا ایک خالی نعرہ ایجاد کیا سرسید کی نگاہ میں صرف ہندوستان کے مسلمانوں کا مفاد تھا اور اس کا تقاضا یہی تھا کہ وہ ان سب بظاہر دلکش لیکن حقیقی طور پر بے معنی نعروں سے بچے رہیں۔ جمال الدین افغانی نے جو اعتراضات سرسید کے متعلق کئے، وہ ہر لحاظ سے غلط اور بے محل تھے۔ سرسید کے شاندار اور عظیم الشان کام کا جائزہ افغانی کے اعتراضات کی روشنی میں کرنا ایک ایسا غلط قدم تھا جس کی بنا پر بے شمار غلط فہمیاں لوگوں میں آج تک موجود ہیں۔ (ایضاً ص ۵۷۔۵۸)

وجدان سے عاری عقلیت کا دور:

غزالی عقل سے آگے بڑھ کر وجدان کی منزل میں جا پہنچا جہاں اسے یقین کامل حاصل ہوا مگر یہ منزل سرسید کے لئے ناممکن تھی۔ جس زمانے میں سرسید نے مذہبی مسائل کو سوچنا شروع کیا تھا، وہ تصوف کے لئے بالکل ناسازگار تھا۔ عقل کے آگے وجدان کا چراغ جلنا ناممکن تھا اس لئے عقل کے میدان سے ماورا وجدان کا سہارا لینا سرسید کے لئے ممکن نہ تھا کیونکہ

وجدان کی دنیا میں اس زمانے کے معیار کے مطابق نور اور روشنی کی بجائے تاریکی اور ظلمت تھی۔ (ایضاً مئی ۱۹۵۶ء، ص ۶۹)

بلال زبیری

سرسید اور مرزا قادیانی کے مقلدوں کا وفادار ٹولہ:

سرسید کے نظریات نے مسلمانوں میں فکری اختلاف کی تحریک پیدا کی۔ اس طرح مغرب پرستوں کا دین بیزار طبقہ پیدا ہوا اور اسی طبقہ نے بعد میں مسلمانوں کی سیاسی قیادت و سیادت کا تاج پہنا۔ سرسید احمد خاں کے خلاف دینی محاذ سے جو مخالفت کی آواز بلند ہوئی تھی، اس کا پس منظر موصوف کے نظریات تھے اور مسلمانوں کو انگریزی تعلیم و تہذیب کی طرف لانے کی تحریک تھی۔ سرسید اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اور مسلمانوں میں ایک طبقہ ان کا مقلد بن گیا۔ اس کے بعد انگریزی حکومت نے مسلمانوں میں مزید فکری اور ذہنی انتشار پیدا کرنے کے لئے ایک نیا مذہبی محاذ کھولا جس کا مرکزی مہرہ مرزا غلام احمد قادیانی تھا دونوں طبقوں کے لوگ انگریزی حکومت کی نگاہ میں مسلمانوں کے صحیح نمائندے قرار پائے۔ یہ ایک بہت بڑی سازش تھی اور انگریز نے یہ کام ایسی چابکدستی سے کیا کہ لکھے پڑھے مسلمان اس رو میں بہہ گئے۔ چونکہ سرسید اور مرزا غلام احمد نے قدیم مذہبی تصورات کی نفی کی تھی، مذہبی طبقہ میں ان کی مخالفت لازمی ہوئی تھی لہٰذا مسلمانوں میں انتشار و افتراق پیدا ہو گیا جو انگریز چاہتا تھا۔ اور برطانوی حکومت نے صرف انہی طبقوں سے وابستہ افراد کو اپنی کونسلوں اور سرکاری ملازمتوں میں جگہ دی تاکہ وفاداروں کے اس ٹولہ کو مسلمانوں پر اس طرح مسلط کر دیا جائے کہ مسلمان ان کی قیادت کو تسلیم کر لیں اور آزادی کے مسئلہ پر ایک طرف انڈین نیشنل کانگرس کے زعما کو گفتگو کے قابل سمجھا، وہاں دوسری طرف مسلمانوں کے اس طبقہ کو شامل کیا جو سرسید احمد خاں اور مرزا قادیانی کے مقلد تھے۔

(چٹان لاہور، یکم مارچ ۱۹۷۶ء، ص ۱۷)

ڈاکٹر تحسین فراقی

علی گڑھ میں تعلیم کا مقصدِ وحید --انگریز سے وفاداری:

خواجہ (محمد زکریا) صاحب لکھتے ہیں کہ اگر سرسید اپنی جدو جہد صرف تعلیم تک محدود رکھتے تو اُن کی مخالفت اس درجہ پر نہ ہوتی، بدقسمتی سے انہوں نے ایک مصلح اور مجدد کا کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔ حالی نے ''حیات جاوید'' میں لکھا ہے کہ ستاون مسائل میں انہوں نے مروجہ عقائد کا اتباع کیا ہے جب کہ تیرہ مسائل میں انہوں نے ذاتی اجتہاد کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ سرسید نے اتنا بڑا مجتہد بننا چاہا جتنا عالمِ اسلام میں پہلے کوئی نہ ہوا ہوگا۔ سرسید نے قرآن کی آیات و رجال اور ہمارے دینی معتقدات کو وکٹورین سائنس اور فلسفے سے ہم آہنگ کرنے میں وہی رول ادا کیا جو پروقرسطس یونانی کیا کرتا تھا کہ ڈاکہ ڈالنے کے بعد صاحب سامان کو پکڑلاتا اور آہنی پلنگ پر لٹا دیتا۔ اگر اُس کی ٹانگیں پلنگ کے طول سے چھوٹی ہوتیں تو اُنہیں کھینچ کھانچ کر پلنگ کے برابر کر دیتا، اور اگر بڑی ہوتیں تو اصولِ مساوات کو کام لاتے ہوئے بڑھا ہوا حصہ کاٹ ڈالتا۔ یوں صاحب سامان ہر دو حالتوں میں اللہ کو پیارا ہو جاتا۔ اکبر (الہ آبادی) کو سرسید سے یہ بھی شکایت تھی کہ اُنہوں نے علی گڑھ کے نصاب کو دنیوی ضرورتوں تک محدود کر دیا ہے جس سے طلبہ انگریزی وضع قطع، ظاہری ٹیپ ٹاپ اور انگریزی کھیلوں کے تو شائق ہو گئے ہیں لیکن اچھے انسان بننے کا خیال اُنہیں نہیں آتا۔ ... صاحب نے دلائلِ قاطع سے ثابت کیا ہے کہ اکبر کی سرسید سے شکایت بجا تھی۔ بھٹناگر کی تاریخ ایم اے او کالج علی گڑھ'' کے علاوہ انہوں نے میر ولایت حسین کے بیانات سے اس امر کی تصدیق کی ہے کہ طلبہ میں علمی مذاق پیدا کرنے اور ان کی ہمت بندھانے کا خیال نہ اساتذہ کو تھا، نہ ٹرسٹیوں کو۔ ہاں، قدر تھی تو صرف فٹ بال اور کرکٹ کے کھلاڑیوں کی، اور مسلمانوں کی علی گڑھ میں تعلیم کا مقصدِ وحید انگریز سے وفاداری تھا، خدا سے وفاداری نہیں۔

(جستجو: ص ۱۸۰۔۱۸۱)

انگریز سے وفاداری ورثے میں:

سرسید کو انگریز سے وفاداری، اس کے مفادات کی حفاظت اور تعقل پسندی ورثے

میں ملیں۔ اس باب میں وہ وفادار ملازم اور سعادت مند فرزند ثابت ہوئے۔ جنگ آزادی کو انہوں نے ہمیشہ غدر کہا، اسے ہندوستانیوں کی ناشکری کا وبال قرار دیا۔ انگریز کے خلاف جنگ لڑنے والے ان کے نزدیک نہایت جاہل، بدمعاش، بے علم، حرام زادے، نمک حرام اور نامحمود تھے۔ ان کے نزدیک آخری مغلیہ تاجدار بہادر شاہ مالیخولیا کا مریض تھا اور ملکہ معظمہ کے سر پر خدا کا ہاتھ تھا۔ دورانِ جنگ سرسید نے انگریزی حکام کے لئے پرچہ نویسی کی خدمات بھی بہ طیب خاطر اور جزوِ ایمان سمجھ کر انجام دیں۔ ان کے خیال میں تو ایسے نازک وقت میں سرکارِ انگلشیہ کی طرف داری سب ہندوستانیوں پر واجب تھی۔

(خودنوشت حیاتِ سرسید: ص ۲۴)

سید تصدق بخاری

قرآن کریم میں تحریفات:

سرسید خاں بہادر نے ملائکہ، جن، شیطان، جنت، دوزخ، خارق عادت معجزات کے معنی میں یہاں تک غلو اور تغیر و تبدل کیا ہے کہ سرے سے کلام الٰہی کو اُلٹ پلٹ کر مذہب اسلام کو معاذ اللہ پہیلیوں کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا ہے۔

(محرف قرآن سرسید: ص ۲۴)

سرسید صاحب دین اسلام کی پٹڑی سے سینہ تان کر اس لئے اُتر گئے ہیں کہ وہ مذہبی علوم کے کامل عالم نہ تھے۔ دوسرا، لغت عربی سے بالکل کورے تھے۔ تیسرا، انہوں نے بغیر علم کے قرآن کی تفسیر لکھنا شروع کر دی۔ ایک مفسرِ قرآن کو جن علوم کی مہارت کاملہ کی اشد ضرورت ہوتی ہے ان میں سے وہ ایک کے بھی ماہر نہ تھے۔ (ایضا: ص ۲۶)

سرسید کی تفسیر القرآن کو جو شخص بھی کورانہ عقیدت کا قلادہ اتار کر بنظر امعان پڑھے گا، اس پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ موصوف نے خدا کے کلام کو اپنی محرفانہ تاویلات فاسدہ اور عقائد کاسدہ سے پہیلیوں، چیستانوں اور بجھارتوں کا ایک مجموعہ بنا کر پیش کیا ہے تا کہ معاندین دین حقہ خوش ہو کر ان کی عزت و اکرام کریں۔ (ایضا: ص ۳۶)

تاریخ وجغرافیہ میں مفلسی کا عالم:

غور فرمائیے اور سرسید کے علم کی داد دیجئے جو ارارت کے ایک چھوٹے سے پہاڑ کو ایک ملک بتا رہے ہیں اور ملک آرمینیہ کو میڈی ٹرینین سی (Mediterranean Sea) جو افریقہ اور یورپ کے مابین حائل ہے، جو دونوں براعظموں کی حدِ فاضل کا تعین کرتا ہے، اس کے بحر اسود کے درمیانی قطعہ میں ارارت کا ملک بتا رہے ہیں۔ کوئی بھی سکول اٹلس یا گریٹ ورلڈ اٹلس یا دنیا کا کوئی بھی نقشہ اٹھا کر دیکھئے تو اس میں آپ کو صاف نظر آئے گا کہ ارارت کا ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے جو ایرانی سرحد کے قریب ترکی میں ہے۔ دسویں کا طالب علم بھی اس کا محلِ وقوع صحیح بتا دے گا لیکن سرسید بے چارے، جو کوہ ارارت کو ایک ملک بتا رہے ہیں اور اس کا محلِ وقوع ہی نہیں جان سکے، وہ بھلا قرآن حکیم کے عمیق حقائق و دقائق کیسے سمجھ سکتے تھے! (ایضاً ص ۲۴۰)

پروفیسر ثریا حسین

اُفتادِ طبع کی اُپج آرا:

وہ (سرسید) عقلیت پسند اور آزاد خیال (لبرل) مفکر تھے۔ جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے وہ کسی کی رائے کے پابند نہیں بلکہ اپنی ذاتی رائے رکھتے تھے جو عام طور اُن کی افتادِ طبع کی اپج ہوتی تھی۔ پیغمبر اسلام کی زندگی کے جو واقعات پرانی تاریخی حدیث کی کتابوں میں ملتے ہیں ان کی سید احمد کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ اگر کسی واقعہ کی عقلی توجیہہ نہیں کر سکتے تو کہہ دیتے کہ وہ واقعہ سرے سے غلط ہے اور پیغمبر اسلام نے وہ کام نہیں کیا تھا۔

(سرسید احمد خاں اور اُن کا عہد: ص ۷۸)

ولیم میور کی کتاب بمقابلہ خطبات احمدیہ:

ولیم میور چاہتا تھا کہ اس کے ہم وطن انگریز ان اصولوں سے فائدہ اٹھائیں جن کے باعث پیغمبر اسلام اور ان کے خلفا نے کامیابیاں حاصل کیں۔ اُس نے قبل اسلام کے

عربوں، خاص کر اہل مکہ، کی تجارتی سرگرمیوں کے متعلق وسیع اور عمیق انداز میں غیر جانبداری سے لکھا اور اسلام کی قدیم تاریخ سے واقعات کو معروضیت سے پیش کیا۔ وہ آنحضرتؐ کے لئے پیغمبر کا لفظ بکثرت استعمال کرتا ہے۔ ہم ولیم میور کے اخذ کردہ نتائج سے متفق نہ ہوں مگر اُسے شر پسندی اور شدت آمیزی کے لئے مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ حضرت محمدؐ کی سوانح عمری نیز مذہب اسلام پر متعدد کتابیں مغربی زبانوں میں موجود ہیں، جب اُن سے مقابلہ کریں تو میور کی کتاب اتنی ہمدردی سے لکھی گئی ہے کہ کہیں کہیں اسلام کا دفاع معلوم ہوتی ہے ''خطباتِ احمدیہ'' کا ولیم میور کی کتاب کی فہرست مضامین سے مقابلہ کریں تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ بذاتِ خود یہ بارہ خطبے سید احمد خاں کے حصولِ مقصد کے لئے ناکافی ہیں، مثلاً اس میں عرب کی تجارتی سرگرمیوں کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں ملتا جن پر ولیم میور نے بڑا زور دیا تھا۔ اُس کے خیال میں یہ ہی پیغمبر اسلام کی کامیابی کا اولین سبب تھیں۔ ولیم میور نے اپنی طرف سے اسلام پر کوئی خاص اعتراض نہیں کیا بلکہ اس نے قدیم مؤرخوں کے بیانات کو محض نقل کر دیا ہے۔ ان سے چونکہ سید احمد خاں متفق نہ تھے اس لئے طویل بحث کی گئی ہے جس سے اُن کے خیالات کی توجیہہ تو ہو جاتی ہے لیکن ولیم میور کی تردید نہیں ہوتی۔ (ایضاً: ص ۱۱۵۔۱۱۶)

جمال پانی پتی

سرسید کے فکر و عمل کے کھرے کھوٹے کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے کی ضرورت:

......ان کی خدمات اور تاریخ ساز شخصیت اپنی جگہ، مگر ہمیں ان کے تصورات و افکار کو صحیفۂ آسمانی سمجھ کر من و عن قبول کرنے کی بجائے یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ سو سال گزرنے کے بعد آج کے موجودہ حالات میں ہمارے لئے ان کے تصورات و افکار اور فلسفۂ تعلیم کی relevance کیا بنتی ہے؟ سرسید بلاشبہ ایک بڑے آدمی تھے، ان سے کم تر درجے کے آدمی کی تنقید شاید ہمارے لئے چنداں ضروری نہ ہو لیکن سرسید جیسے بڑے آدمی کی غلطیوں کا خمیازہ پوری قوم کو بھگتنا پڑتا ہے، اس لئے خود سرسید کی اہمیت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہم ان کے فکر و عمل کے کھرے کھوٹے کو تنقید کی کسوٹی پر کس کے دیکھیں۔...... ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ان کے

فکر و عمل کا ایک رخ اگر تعمیری ہے تو دوسرا تخریبی بھی ہے۔ لہٰذا ہمیں ان پر بات کرتے ہوئے دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا چاہیے، اندھی موافقت یا اندھی مخالفت سے گریز کرکے زندگی کی تبدیلیوں کی روشنی میں ان کے کام کا جائزہ لینا چاہیے۔ اس کے بغیر ہم نہ تو سرسید کو ٹھیک طور سے سمجھ سکیں گے، نہ اپنی تاریخ کو اور نہ ہی خود اپنے آپ کو۔

(اختلاف کے پہلو: ص ۱۲

پیروئ مغربی سے ہماری اپنے ماضی اور اپنی روایت سے دُوری:

سرسید کے انقلابی اقدامات سے ہماری تاریخ کے سفر میں جو تبدیلی رونما ہوئی اس تبدیلی سے ہماری منزل، راستہ اور رُخ تینوں بدل کر رہ گئے۔ پہلے ہم مشرق کی طرف جا رہے تھے، اب ہمارا رُخ مغرب کی طرف ہو گیا۔ پہلے ہماری منزل آخرت تھی، اب دنیا ہو گئی۔ پہلے ہماری زندگی کا بنیادی حوالہ مذہب تھا، اب مذہب ہماری زندگی کے بنیادی حوالے سے خارج ہو گیا۔ یہ ہے وہ تبدیلی جسے حالی نے پیروئ مغربی کا نام دیا ہے۔ سرسید پیروئ مغربی کے اس پروگرام کے ساتھ ہماری تاریخ میں نمودار ہوئے۔ پیروئ مغربی کا رجحان جس قدر ہماری زندگی میں جڑ پکڑتا گیا، اسی قدر ہم اپنے ماضی اور اپنی روایت سے دور ہوتے گئے۔ وہ مذہب ہو یا تہذیب، اخلاق ہو یا زبان اور لباس، پیروئ مغربی کا مطلب ہماری ہر چیز کے خاتمے کی صورت میں برآمد ہوا۔ (ایضاً: ص ۱۹۳۔۱۹۴)

سرسید کے نظامِ تعلیم سے الحاد اور بے راہ روی کی آمد:

دراصل یہ موجودہ مغربی طرزِ تعلیم ہی تو ہے جو اپنے ساتھ ایک ملحدانہ فضا لے کر ہمارے ہاں آیا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے پرانے طرزِ تعلیم کی بنیاد اس اصول پر تھی کہ مذہب ہماری اجتماعی زندگی کی اساس ہے۔ سرسید کے نئے نظامِ تعلیم نے اس اساس کو منہدم کر دیا۔

اب ہمارا سوال ہے کہ یہ الحاد آیا کہاں سے؟ الحاد ہی نہیں، خودسری اور بے راہ روی بھی، بے حیائی اور بے غیرتی بھی۔ کیا ان سب چیزوں کا سوتا اس نظامِ تعلیم کے اندر موجود نہیں جو ہمیں سرسید کے علی گڑھ سے وراثتاً منتقل ہوا ہے؟ دراصل اس نظامِ تعلیم کا سب سے بڑا نقص

یہ ہے کہ اس کا کوئی تصورِ حیات نہیں۔ یہ کسی ایسے مرکزی عقیدے یا آگہی سے بہرہ نہیں کھومتی جس کی جڑیں قوم کے باطن کی گہرائیوں میں ہو۔ یہ ہماری اجتماعی زندگی سے اس طرح نہیں اگا جس طرح بیج سے درخت اُگتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر یہ ایک ایسی قوم کا نظامِ تعلیم تو بے شک ہے جو اس کے ذریعے معاشرتی مشین کے کارآمد پرزے یا کلرک پیدا کرنا چاہتی ہو مگر یہ ایسی قوم کا نظامِ تعلیم نہیں جو اپنے تصورِ حقیقت اور اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے اسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا بنیادی حوالہ بنانا چاہتی ہو۔ (ایضاً ص۲۰۳۔۲۰۴)

ڈاکٹر قاضی جمال حسین

تہذیبی، اخلاقی اور روحانی تسلسل میں گم کردہ اشیا:

تاریخی تسلسل اور روایت سے وابستگی کی اپنی ایک مخصوص قوت ہوتی ہے۔ گمان ہوتا ہے کہ سرسید نے بھی اسی تاریخی تسلسل اور روایت کے دھارے کو یکسر ازسرِ نو اس کی رفتار کو متاثر کیا اور اسے ایک نئی جہت سے آشنا کرنے کے لئے اس کے فطری بہاؤ پر قدغنیں عائد کیں۔ قدرے جذباتی طریق کار، روایت سے وابستگی اور تہذیبی اقدار کی اپنی ایک منطق ہے جسے یکسر بے معنی اور مہمل نہیں قرار دیا جا سکتا۔ چنانچہ سرسید کے اس انقلابی اقدام کو خود اُن کے عہد میں ایک بڑے طبقے نے محسوس بھی کیا اور اس کے نتیجے میں آئندہ پیدا ہونے والے خطرات سے قوم کو آگاہ بھی کیا۔ مولانا قاسم نانوتوی یا اکبرالہ آبادی کی فکر کو ہم یکسر نظرانداز نہیں کر سکتے اور تقریباً ایک صدی کا عرصہ گزر جانے کے بعد اگر ہم سرسید کی فکر کے زیرِاثر اپنے اکتسابات کا جائزہ لیں تو یہ کہنا بھی بہت بے جا نہ ہوگا کہ بہت کچھ حاصل کرنے کے باوجود ہم نے اپنے تہذیبی، اخلاقی اور روحانی تسلسل میں کچھ چیزیں گم بھی کر دی ہیں۔ جو کچھ ہم نے حاصل کیا ہے، اس کی قدر و قیمت سے انکار نہیں لیکن اخلاقیات اور روحانیات کے نام پر بعض چیزیں جو ہم نے کھو دیں، وہ بھی کم اہمیت کی حامل نہیں تھیں۔ غالباً عقلیت پسندی اور غیر جذباتی طریق کار میں ہمارے ایک بڑے طبقہ نے جس جذباتی رویہ کا ثبوت دیا اور جس غلو سے کام لیا، اس پر آج عہد حاضر میں نظرِ ثانی کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، مارچ اپریل ۱۹۹۸۔ ص ۵۶)

پروفیسر جمال خواجہ

مذہبی افکار کی اشاعت کا مسئلہ:

اسے سوائے ستم ظریفی کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ جو حضرات سرسید کا یوم ولادت بڑے طمطراق سے مناتے ہیں، وہی لوگ اسلام کے متعلق سرسید کے شاندار علمی کارنامے تنقیدی مطالعہ کو پس پشت ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حد یہ ہے کہ (علی گڑھ) یونیورٹی لائبریری میں بھی سرسید کی ساری تصانیف موجود نہیں ہیں اور اسلامیات میں سرسید کے گراں قدر اضافے کو شعبۂ دینیات میں شاملِ نصاب نہیں کیا گیا ہے۔ علمائے کرام اب بھی سرسید کی تصانیف کو اپنے حدود اختیار میں بے جا دخل سمجھتے ہیں۔ بہت سے حضرات کا خیال ہے کہ اس عظیم رہنما اور سماجی ریفارمر کے مذہبی نظریات اور تصنیفات پر خاموشی کا جو پردہ پڑا ہوا ہے اسے اٹھانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے، گو کہ سرسید کی تعظیم ہم پر لازم ہے لیکن ان کی تصنیفات کے مطالعہ اور ان پر بحث و تمحیص کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ان کی دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ اگر سرسید کے مذہبی افکار کی وسیع پیمانے پر نشر و اشاعت کی گئی تو ہم بہت سے خطرناک غیر اسلامی فکری عناصر کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ یہ حضرات اس بات کو نہیں سمجھتے کہ اس طرح کا طرز فکر اگر ایک طرف سطحی مذہب نوازی کی طرف لے جاتا ہے تو دوسری طرف مغائرت اور بغاوت کے جذبات کو بھی بھڑکاتا ہے، لیکن اس طرح کبھی بھی ایمانِ صادق اور اطمینانِ قلب حاصل نہیں کیا جا سکتا ہے۔

(سرسید کی اسلامی بصیرت: ص ۱۵-۱۶)

پان اسلامزم اور تصورِ خلافت کا رد:

سرسید مذہب کو سیاسی معاملات سے الگ کرنے کے قائل ہیں۔ گو کہ سیکولرازم کا لفظ ان کی تصانیف میں استعمال نہیں ہوا ہے لیکن ہندوستانی اور بین الاقوامی مسائل کے بارے میں انہوں نے سیکولر رویہ کو ہی اپنایا۔ انہوں نے بغیر کسی لگی لپٹی اور بڑی صفائی کے ساتھ پان اسلامزم (Pan-Islamism) کے نظریہ کو رد کیا جس کی وجہ سے وہ اور علی گڑھ تحریک میں ان

کے قریبی ساتھی پان اسلامزم کے سب سے بڑے علم بردار جمال الدین افغانی کی تلخ تنقید کا نشانہ بنے۔ سرسید کا خیال تھا کہ بلقان کی جنگیں اصل میں بلقان قوم پرستی اور ترکی سامراجی مفادات کے درمیان محاذ آرائی ہے، اسے اسلام اور عیسائیت کے درمیان جہاد نہیں کہا جا سکتا ہے۔ سرسید اسلامی بھائی چارے کے قائل تھے لیکن وہ خلافت کے تصور کو مذہب اسلام کا ایک اٹوٹ انگ نہیں سمجھتے تھے۔ (ایضاً: ص ۲۸)

مذہب اور سیاست کو الگ کرنے کی توجیہہ:

اگر ایک طرف بعض حضرات سرسید کی سیاست کو فرقہ پرستانہ قرار دیتے ہیں تو دوسری طرف بعض دیگر حضرات مذہب اور سیاست کو الگ کرنے کی بنا پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے اسلام کو صرف صوم وصلوٰۃ اور بعض دوسری عبادات تک محدود کر دیا ہے۔ ان حضرات کی نظر میں اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، انسانی زندگی کا کوئی بھی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں اسلام پوری رہنمائی نہ کرتا ہو۔ مولانا مودودی اور اُن کے مکتب فکر کے دوسرے علمائے دین نے اس طرز فکر کو جدید اسلامی سوچ کا مرکزی موضوع بنا دیا ہے لیکن سوچنے کا یہ ڈھنگ معاملے کی نزاکتوں سے انصاف نہیں کر پاتا ہے..... مذہب کو سیاست سے الگ کرنے کا مطلب نہ مذہب کی عظمت کو ٹھیس پہنچانا ہے، نہ انفرادی اور اجتماعی اخلاق کو پامال کرنا ہے اور نہ ہی دنیا میں ایک منصفانہ سماجی، سیاسی اور اقتصادی نظام کے قیام جیسے اہم ترین مشن سے دست بردار ہونا ہے۔ مذہب کو سیاست سے الگ رکھنے کا مدعا بس اتنا ہے کہ مندرجہ صدر مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ متعلقہ امور میں کسی خاص مذہب کی حاکمیت کو تسلیم کرنے کے بجائے تمام اساسی اقدامات آزادانہ اور جمہوری گفت وشنید کے ذریعے اٹھائے جائیں۔ (ایضاً: ص ۲۹-۳۰)

تصوّرِ پاکستان کا موجد قرار دینے کی ستم ظریفی:

سرسید کے پاس کوئی واضح اور مربوط سیاسی فلسفہ نہیں تھا، گو کہ اسلامی لبرلزم کے بارے میں سرسید کے خیالات واضح اور مضبوط ضرور تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے سیاسی رویوں

میں متضاد اجتماعی اثرات کے شکار ہو گئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو خوب صورت ہندوستانی
دلہن کی دو آنکھیں کہنا اور اس طرح کے دوسرے خیالات جہاں سرسید کے آفاقی طرزِ فکر کی
نشان دہی کرتے ہیں وہاں بنگالی بابوؤں اور ہندو جبر کا ذکر اور بلا لحاظ ہندو مسلم اونچی نیچی ذات
کی تفریق میں سرسید کا یقین ان کے جاگیردارانہ پس منظر کے تعصبات کی نشان دہی کرتے
ہیں۔ سرسید ان تعصبات سے اس حد تک چھٹکارا حاصل نہ کر سکے جس حد تک وہ بہت سے
روایتی مذہبی تصورات سے اپنے آپ کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔
ہندوستانی سیاست میں سرسید کو مسلم علیحدگی پسندی کے مورثِ اعلیٰ کے طور پر پیش کرنا ان کے
تاریخی مرتبے کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ یہ اور بھی زیادہ ستم ظریفی کی بات ہوگی اگر ہم سرسید کو
ہندوستان میں ایک خالص اسلامی مملکت کے خیال کا موجد قرار دیں۔ (ایضاً: ص ۲۸۔۲۹)

مذہبی مسائل میں قابلِ قبول اور کمزور استدلال:

قرآنی آیات کی روایتی تشریح کے برعکس ان کے صحیح مفاہیم سمجھاتے ہوئے اور اپنی
بات منواتے ہوئے سرسید عربی گرامر و لغت پر اپنی گرفت دکھاتے ہیں۔ وہ قرآنی آیات کی عام
فہم اور فطری تعبیر کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی دکھاتے ہیں کہ کس طرح قرآنی آیات پر مافوق
الفطری تاویلات تھوپی گئی ہیں۔ اکثر مسئلوں میں سرسید کا استدلال قابلِ قبول دکھائی دیتا ہے
لیکن ہر مسئلے کے ساتھ وہ انصاف نہیں کر پاتے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ وہ بڑی دیدہ
ریزی اور دیانت داری کے ساتھ مسائل کو سلجھانا چاہتے ہیں لیکن ایک حد تک کامیاب ہونے
کے بعد ان کا استدلال کمزور پڑ جاتا ہے اور وہ ہمیں قائل نہیں کر پاتے ہیں۔ (ایضاً: ص ۲۴)

دُنیوی معاملات میں حضورؐ کو کامل ماننے سے انکار:

سرسید نے قرآن کے غلطی سے مبرا ہونے کے مقبول عام نظریئے کی جو تاویل
کی تھی، وہ اس روایتی خیال سے قریب تھی کہ کاملیت کا کوئی بیرونی مرجع و مرکز ہونا چاہیے، اور
وہ صرف کلام الٰہی ہی ہو سکتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سرسید کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ قرآن
پاک کے غلطی سے مبرا ہونے کی یہ تاویل عقلیت پسندوں کی مکمل فکری آزادی اور روحانی خود
مختاری کے ساتھ میل نہیں کھاتی ہے۔ سرسید نے قرآن کی تاویل تمثیلی انداز میں پیش کرنے

کی شدید مخالفت تو کی لیکن وہ اس خطرے کو نہ بھانپ سکے کہ اگر ہم ایک طرف قرآن یا پیغمبر اسلام کو غلطی سے مبرا تسلیم کرلیں تو دوسری طرف بے لاگ عقلیت پسندی کا پرچار نہیں کر سکتے ہیں۔ ایمان کی نیم پختہ تصوراتی شکلیں اور بے لگام عقلیت پسندی کے تقاضے جب ٹکراتے ہیں تو سرسید کا مذہبی رویہ ایک ایسے سچے آزاد خیال مسلمان کے لئے کوئی درماں نہیں ہوسکتا جس کے ضمیر کی گہرائیوں سے کلام الٰہی کے کسی مسئلے کے متعلق کوئی اصولی اعتراض اٹھتا ہو۔ حدیث کے متعلق سرسید کے رویہ میں دیانت دارانہ اختلاف رائے کی گنجائش تو ہے کیونکہ سرسید دنیوی معاملات میں حضورؐ کو کامل نہیں مانتے ہیں لیکن اگر کوئی شخص واقعی روحانی کشمکش اور باطنی کرب کا شکار ہو تو سرسید کے نظریہ وحی میں اس بات کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ قرآن کی حاکمیت کے دائرے میں رہتے ہوئے اسے اطمینانِ قلب ہو سکے۔ (ایضاً ص۳۳)

جمیل یوسف

نیا علم کلام، نیا راستہ:

جس نئے علم کلام کو بنیاد بنا کر سرسید نے قرآن حکیم کے مطالب و معانی کو سمجھنے کی کوشش کی اور اس سمت میں جو نیا راستہ دکھایا...... اس کی کوئی نظیر سرسید سے پہلے موجود نہ تھی مگر سرسید کے بعد علامہ اقبال، علامہ حمید اللہ فراہی، غلام احمد پرویز، مولانا امین احسن اصلاحی اور موجودہ دور میں جاوید احمد غامدی نے اسی انداز اور طریقے پر قرآن حکیم کی تعبیر و تفسیر کی ہے۔ اس میدان میں بلاشبہ سرسید احمد خاں کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ انہوں نے جو چراغ روشن کیا، ان کے بعد آنے والوں نے اس کی روشنی میں اپنا راستہ تلاش کیا۔

(سرسید احمد خاں، شخصیت اور فن: ص ۱۰۸)

جوش ملیح آبادی

انگریز پرست علی گڑھ تحریک کے بنیادی نکات:

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج --- یہ مسلمانوں کو غیر اسلامی خطاب دینے والا غلامانہ

انگریزی نام اس کالج کے بانی اُن سید احمد (جن کے کاسۂ سر میں ''سر'' کے خطاب کا ہندوستان شکار عقاب اپنا آشیاں بنا چکا تھا) اپنی ذہنیت کے اس تیشۂ زبوں سے تراشا تھا جس سے خود وطن کے پہاڑ کاٹے جاتے اور ''عشرت کدۂ پرویز'' کی جانب ''جوئے شیر'' لائی جاتی ہے۔ یہ خدا بخشے انہی خویش دشمن و بیگانہ دوست بزرگ کا موروثی اثر ہے جو آج تک ہمارا تعاقب کر رہا ہے اور جس کے باعث ہم آزاد ہو جانے کے باوجود آج بھی اپنے سرکاری محکموں، تہذیبی اداروں اور اپنے شہر کے محلوں کو پی۔آئی۔ڈی۔سی، رائٹرز گلڈ اور پی۔ای۔سی۔ایچ سوسائٹی کے انگریزی نام عطا فرما کر فخر محسوس کر رہے ہیں اور یہاں تک کہ اپنے ناموں کے سروں پر ٹی۔پی۔عبداللہ، اے۔ڈی۔اظہر، وائی۔ایف۔مجیب اور ڈبلیو۔ڈبلیو۔رحمٰن کے گندے ٹوکرے لادلاد کر اس آرزو میں مرے جارہے ہیں کہ کوئی اللہ کا بندہ ہم کلموں کو فرنگی یا کم سے کم کرسٹان ہی سمجھ لے اور ہماری کالی نیٹویت پر انگلستان کا گوراپن چھا جائے۔ دراصل علی گڑھ تحریک اٹھائی ہی گئی تھی اس غرض سے کہ:

۱۔ مسلمانوں کو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے بے تعلق ثابت کر کے اس امر پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دی جائے کہ مسلمان کا دل حُبِ وطن کی سی ذلیل چیز سے قطعی آلودہ نہیں ہے۔

۲۔ مسلمانوں کو پیٹ پالنے کی خاطر فقط اس قدر تعلیم دی جائے کہ وہ بابو یا ڈپٹی کلکٹر بن کر بڑا بابو بن سکے۔

۳۔ اپنی زبان کو فراموش کر کے انگریزی میں اس قدر غرق ہو جائے کہ وہ انگریزی میں سوچے اور انگریزی ہی میں خواب دیکھے۔

۴۔ وہ مغربیت اختیار کر کے مشرق سے اس قدر بیزار ہو جائے کہ وہ اپنی معاشرت، اپنی زبان، اپنے ادب، اپنی روایات، اپنی ثقافتی وراثت کو ذلیل اور یہاں تک کہ اپنے باپ دادا تک کو احمق سمجھنے لگے۔

۵۔ اور اس کا نتیجہ یہ برآمد ہو کہ حکومتِ برطانیہ کو دوام حاصل ہو جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مزاجِ روزگار کی کارفرمائی کی بدولت اس شر سے خیر اور اس نقصان سے کچھ فائدے کے پہلو بھی نکل آئے لیکن جب آخری حساب کتاب کے بعد ''میزانِ کل''

کی نوبت آئی تو پتہ چلا کہ اس کاروبار میں نفع بہت کم اور گھاٹا بہت زیادہ ہوا، اور قلیل سود کا کثیر زیاں احاطہ کئے ہوئے ہے۔

(یادوں کی برأت: ص ۱۳۴)

حامد حسن قادری

ہر عقیدہ قانون کو عقل سے جانچنے کا عمل:

سرسید نے قرآن مجید کی تفسیر لکھنے میں کمال جسارت سے کام لیا۔ ان کے پیش نظر وہی خطرے تھے جو ''خطبات احمدیہ'' کے لکھنے کا باعث ہوئے تھے۔ وہ یہ تھے کہ نوجوان مسلمان مغربی فلسفہ و سائنس پڑھ کر اسلام کے ہر عقیدہ قانون کو عقل سے جانچیں گے اور عقل کے موافق نہ پانے کے سبب سے اسلام سے برگشتہ ہو جائیں گے، اس لئے سرسید نے یہ طے کر لیا کہ اسلام کے ہر عقیدے، ہر قانون، ہر حکم، ہر قصہ کو عقل کے مطابق ثابت کیا جائے اور جو اس کسوٹی پر کھرا نہ نکلے اس کو ٹکسال باہر کر دیا جائے۔ سرسید کا یہ خیال صرف ایک حد تک درست تھا، یعنی اسلام کی بہت سی باتیں عقل انسانی اور قدرت کے قوانین معلومہ و مسلمہ کے بالکل موافق ہیں بلکہ جملہ مذاہب عالم میں صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جس کی صداقت و فضیلت کی علم و عمل اور عقل و تجربہ نے ہمیشہ تصدیق کی ہے، لیکن نفسِ مذہب ایسی چیز ہے جس میں بعض ان دیکھی اور بن سمجھی باتوں کے مانے بغیر کام نہیں چل سکتا، اور اسلام بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ سرسید کا تفسیر القرآن میں تمام معجزات اور خلاف عادات اور غیب کی باتوں سے انکار کرنا، ایمان بالغیب کی غلط تاویل کرنا، جنّوں سے صحرائی اقوام مراد لینا وغیرہ وغیرہ اصلاحی نظر سے غیر ضروری تھا اور اسلامی نگاہ میں غلط فہمی پر مبنی۔

(مطالعہ سرسید احمد خاں. ص ۱۹۶۔۱۹۷)

وہ (تفسیر) بھی ان کی دینی خدمت اور اس سے زیادہ مہتم بالشان خدمت تھی لیکن وہ ایسا کام تھا جس کے سرسید اہل نہ تھے، جس کو ضروری سمجھنے میں سرسید سے غلطی ہوئی، جس کا نہ کرنا کرنے سے بہتر تھا۔

(داستان تاریخ اردو: ص ۳۰۱ بحوالہ سرسید کی ادبی خدمات: ص ۱۳۷)

حبیب احمد صدیقی

نہ یورپین لٹریچر اور نہ یورپین سائنس میں ناموری:

سرسید بھی اتاترک کی طرح یورپ کی تقلید کے قائل تھے۔ ان کے خیال میں دیہاتی مکتبوں میں تو دیسی زبان میں تعلیم دی جاسکتی تھی مگر کالجوں میں سب مضامین کو انگریزی میں پڑھانا ضروری تھا۔ گو وہ عربی علوم کو قومی نشانی اور مذہبی علوم کو روحانی تربیت کا ذریعہ کہتے تھے مگر کالجوں کو ان علوم کی دسترس سے باہر رکھنا چاہتے تھے۔ ان علوم کی ترویج کے لئے ان کا مشورہ یہ تھا کہ انہیں مسلمانوں کے اوقاف کے سپرد کردیا جائے۔ وہ مشرقی علوم کو مُردہ علوم جانتے تھے اور ان کو زندہ کرنے کی فکر کو فعل عبث سمجھتے تھے سرسید کے خیال میں عربی و فارسی پڑھنے کے بعد بجز اس کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا کہ مُردوں کی فاتحہ کی روٹیوں پر زندگی بسر کی جائے سید احمد خاں کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا اور مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیل گئی۔ اس کالج کے پڑھے ہوئے طلبہ کو سرکاری ملازمتیں ملیں اور کچھ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔ اس کالج کے پڑھے ہوؤں کو فاتحہ کی روٹیوں کو معاش کا ذریعہ نہیں بنانا پڑا، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ مقصد، جو اس کالج کو قائم کرتے وقت سید احمد خاں کے سامنے تھا، پورا ہوا؟ ..... سید احمد خاں نے اس امید میں انگریزی تعلیم پر اصرار کیا تھا کہ طلبہ یورپین لٹریچر اور یورپین سائنس میں اعلیٰ ترقی کریں گے مگر یہ امید برنہ آئی۔ وہاں کے پڑھے ہوؤں میں سے کسی نے یورپین لٹریچر میں نام پیدا کیا اور نہ کسی کو دنیا کے ممتاز سائنس دانوں کی صف میں کھڑے ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ دوسری طرف نقصان یہ ہوا کہ مسلمان طلبہ اپنے مذہبی علوم، اپنی تاریخ، اپنے سائنسی کارنائے نمایاں سے، جو بیشتر عربی زبان میں قلم بند کئے گئے تھے، ناواقف رہے البتہ یورپ اور امریکہ کے لوگوں نے ان علم و حکمت کے خزانوں کی، جو عربی کتابوں میں مدفون تھے، ڈھونڈ نکالا، ان کتابوں کی قدر کی، انہیں پڑھا، انہیں مدوّن کیا، انہیں چھپوایا اور دنیا کو بتایا کہ اصل سائنس کی بنیاد مسلمانوں نے رکھی تھی۔

(فاران کراچی، ستمبر ۱۹۷۰ء: ص ۲۳-۲۴)

حبیب الرحمٰن خاں شروانی

زمانہ وہ تاریک تھا یا آج ہے؟

مسلمان انگریزی تعلیم سے قریباً نا آشنا تھے۔ اس ناآشنائی کا عموماً آجکل ذمہ دار مسلمانوں کا مذہبی تعصب قرار دیا جاتا ہے۔ ایک سبب ممکن ہے یہ بھی ہو لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ اور اسباب بھی تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کا ایک تمدن تھا، معاشرت و تہذیب تھی، علمی معیار تھا: صنعت و ہنر کا سلیقہ و ملکہ تھا، سلطنت تھی، ترفع تھا اور ان تمام حالات و واقعات پر فخر تھا۔ ملازمتوں کے دروازے ان کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ یہ واقعہ کہ فرمائش کرکے بلکہ اصرار و تمنا کرکے ان کو ملازمتیں دی جاتی تھیں۔ وکالت و دیوانی کے محکمہ پر ان کا پورا قبضہ تھا۔ اپنی علمی و تمدنی قابلیت کی ہر جگہ داد پاتے تھے۔ دلی کے لال قلعہ میں چند ہی روز پہلے شاہی دربار تھا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ برائے نام تھا، تاہم یہ بھی صحیح ہے کہ نام بڑا تھا جس کے سامنے اعلیٰ و ادنیٰ جھکتے تھے۔ سرسید نے اولاً اسی دربار سے خطاب پایا تھا۔ آج یہ علوم متعارفہ میں داخل ہے کہ وہ زمانہ تاریکی کا تھا۔ واقعات اس کے خلاف ہیں۔ خود سرسید کی شہادت پر غور کرو، ''آثار الصنادید'' کو اٹھالو، شہر دہلی میں جو اہل کمال ان کے عہد میں موجود تھے اُن کی فہرست پر نظر ڈالو اور انصاف سے کہو کہ زمانہ وہ تاریک تھا یا آج ہے؟ ...... نئے دور میں یہ صرف نام ہی نام ہیں، حالات فضائل کا نقش دلوں سے مٹ چکا ہے۔ یہ اہل کمال کیسے تھے، اس کا اندازہ خود سرسید کی تصنیف ''آثار الصنادید'' پڑھ کر کرو۔ اگر مجھ کو کچھ کہنے کی اجازت ہو تو میں کہوں کہ ہر ایک نے ان میں سے اپنے میدان میں ابد تک نہ مٹنے والے کارناموں کا نقش اپنے پیچھے چھوڑا ہے۔

(برگ گل کراچی، سرسید نمبر ۶۹۔۱۹۶۸ء: ص ۶۶۔۶۷)

سرسید کی تفسیر نگاری بمقابلہ غیر ماہر کپتان کے جہاز کا انجام:

ہمارے خیال میں سرسید کی تفسیر نگاری کی مثال بعینہ ایسی ہے کہ ایک طوفان خیز سمندر میں جہاز کو ایسا کپتان لے جائے جو کسی بحری مدرسہ کا تعلیم یافتہ ہو، نہ ناہر استاد کی صحبت

میں اس نے جہاز رانی سیکھی ہو اور محض ضرورتِ وقت پر لحاظ اور اپنی عقل پر بھروسہ کر کے جہاز لے کر چل کھڑا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسے جہاز کا انجام کیا ہوگا!

(مقالات شروانی: ص ۵۹، بحوالہ ''تاریخ دعوت و جہاد: ص ۲۱۸)

حبیب الرحمٰن ہاشمی

مُحرّفِ قرآن:

سر سید احمد خاں برصغیر کی متنازعہ ترین شخصیت تھے۔ جدت پسند تھے اور شوق رہ نوردی میں الحاد و گمراہی کے چوراہے میں آ کھڑے ہوئے۔ انگریز کے زبردست حامی تھے، اسی لئے انگریزی نظام تعلیم کے مبلغ و منادبن کر تمام عمر اسی خدمت میں صرف کر دی۔ ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی میں مسلمانوں سے غداری کر کے انگریزوں کو پناہ دی۔ انکارِ حدیث کے فتنہ کے بانی مبانی تھے، یعنی مسٹر پرویز کے فکری جد امجد تھے۔ فرشتوں اور جنات کے وجود کا انکار کیا، نصوص قرآنی کا انکار کر کے تحریف قرآنی کا ارتکاب کیا اور پھر بزعم خود مفسرِ قرآن بننے کی سعی لا حاصل بھی فرمائی۔ ان کی تفسیر قرآن کو تحریف کہنا زیادہ موزوں اور اُن کو محرفِ قرآن کہنا قرینِ انصاف ہے۔

(نقیب ختم نبوت ملتان، فروری ۲۰۰۰ء: ص ۵۹)

حسام الدین غوری

چہیتے بیٹے کے سامنے بے بسی کا عالم:

سر سید احمد خاں بانی تحریک علی گڑھ کو اپنی آخری عمر میں اولاد کی بدسلوکی اور ہندو کلرک کی بددیانتی کی وجہ سے ناقابلِ برداشت روحانی صدمہ ہوا۔ سر سید کو اپنے لڑکے سے بے حد محبت تھی، اس سے فائدہ اٹھا کر سید محمود جو چاہتے چنانچہ سر سید احمد خاں نے ٹرسٹیوں کی خالی جگہ کو سید محمود کی منشا کے مطابق اپنے اختیار سے پُر کیا۔ سید صاحب سے کروا لیتے، سید محمود سخت شراب نوشی کے عادی ہو چکے تھے، اس کے باوجود سید صاحب نے ان کو اپنی زندگی میں ۱۸۸۹ء کو اپنا جانشین بنا دیا اور اپنے بھتیجے سید محمد احمد کو اسسٹنٹ سیکرٹری مقرر کیا۔ جب اس عمل

پر وقار الملک مولوی مشتاق حسین اور دوسرے ٹرسٹیوں نے اعتراض کیا تو سید محمود ان لوگوں کو جماعت ٹرسٹیاں سے نکال دینے پر سید صاحب کو مجبور کرنے لگے لیکن سید صاحب ٹالتے رہے۔ جب سید محمود نے اختلافات کی بنا پر بات کو اپنی کوٹھی سے نکال باہر کیا تو سرسید احمد خاں حاجی اسماعیل خاں صاحب کی کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔ یہاں وہ نہایت دکھ سے سرد آہیں بھرتے اور کہتے تھے:

''ہائے افسوس! ہم کو کیا معلوم تھا کہ سید محمود آخری عمر میں اپنے گھر سے نکال دے گا ورنہ کیا ہم اس قابل نہ تھے کہ اپنے لئے ایک جھونپڑا بنا لیتے!''

(تہذیب الاخلاق لاہور، اکتوبر ۱۹۹۳ء، ص ۱۰)

حسن جعفر زیدی

رجعت پسندی اور دقیانوسیت کے علمبردار مجدّد الف ثانی سے روشن خیال سرسید تک:

مسلمانانِ ہند کی سیاسی و ثقافتی تاریخ میں دو لہریں نمایاں رہی ہیں، ایک لہر ترقی پسندی اور روشن خیالی کی لہر، اور دوسری رجعت پسندی اور دقیانوسیت کی لہر۔ یہ دونوں لہریں مغلیہ سلطنت کے زوال سے پہلے اور بعد دونوں ادوار میں نظر آتی ہیں۔ پہلے کے دور میں ترقی، روشن خیالی اور وسیع المشربی کی لہر کے علمبردار ثقافتی سطح پر چشتیہ سلسلہ اور بعد میں بھگتی تحریک کے صوفیا تھے جبکہ سیاسی سطح پر کشمیر کا سلطان زین العابدین (بڈشاہ)، بنگال کا سلطان علاؤالدین حسین شاہ اور سب سے اہم مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر اور اس کے دربار کے اہل علم خصوصاً شیخ مبارک، ابوالفضل، فیضی اور پھر اواخر عہد میں شہزادہ داراشکوہ شامل تھے۔ دوسری لہر یعنی رجعت پسندی اور دقیانوسیت کے علم برداروں میں مذہبی وثقافتی سطح پر شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی)، ملا عبدالقادر بدایونی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی وغیرہ تھے جبکہ سیاسی سطح پر سلاطینِ دہلی میں سلطان محمد تغلق اور مغلوں میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نمایاں قرار دئے جا سکتے ہیں ..... اولین سلاطین دہلی نے صوفیائے چشت کی مدد سے مسلمانوں کے لئے برصغیر کے طول وعرض میں جو جگہ بنائی اور استحکام حاصل کیا اُسے سلطان محمد تغلق کی کٹر پسندی نے تباہ

کر دیا۔ اس کے بعد جلال الدین اکبر اور اس کے روشن خیال امرا اور علما نے ایک وسیع و عریض ترقی پسندانہ مغل سلطنت کی بنیاد ڈالی اور عملی مباحث کا آغاز کیا جو برصغیر میں یورپ کے احیائے علوم کا پرتو ثابت ہو سکتے تھے لیکن شیخ احمد سرہندی اور دیگر رجعت پسند اور تنگ نظر قوتوں نے احیائے اسلام کے نام پر اس کی مخالفت کی ...... برصغیر کے مسلمان سیاسی و معاشی زبوں حالی کے پست ترین مقام تک پہنچ گئے۔ ان حالات میں ایک بار پھر ترقی پسندی اور روشن خیالی کی لہر اُٹھی۔ اسی کے ہراول سرسید احمد خاں، نواب عبداللطیف اور سید امیر علی وغیرہ تھے جنہوں نے بدلے ہوئے عصری تقاضوں کے مطابق لائحہ عمل اختیار کیا اور مسلمانوں کو تباہی کے گڑھے سے نکالنے کا راستہ ڈھونڈا۔

(روشن خیال سرسید احمد خاں: ص ۵۔۶)

سرسید نے قریباً سو سال قبل دقیانوسیت اور ملائیت کے خلاف جس نڈر، بے باک اور دلیر رویے کا مظاہرہ کیا آج کے نام نہاد ترقی پسند اس کے عشر عشیر بھی نہیں ہیں۔ اس نے اپنے مقالات اور تفسیر قرآن مجید میں دقیانوسیت اور کٹھ ملائیت کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ اس پر نیچری، کافر، زندیق اور ملحد ہونے کا الزام لگا لیکن چونکہ اس نے مسلم عوام کی مادی ترقی کے لئے خلوصِ دل سے کام کیا اس لئے مسلم رائے عامہ نے فتویٰ فروش ملاؤں کی پروانہ کی اور سرسید کا بڑھ چڑھ کر ساتھ دیا۔ (ایضاً: ص ۱۳)

ابوالاثر حفیظ جالندھری

مولوی سید ممتاز علی کی تالیف ''حقوقِ نسواں'' پر سرسید کا شدید ردِّ عمل:

سرسید کی یہ بات مشہور ہے کہ انہوں نے تعلیمِ نسواں کے لئے کچھ نہیں کیا اور نہ کرنا چاہتے تھے۔ صرف یہی نہیں کہ کرنا نہ چاہتے تھے بلکہ اگر کوئی کچھ کرنا چاہتا تو مانع ہوتے، اس لئے مولوی صاحب کو یہ خوف تھا کہ شاید سید صاحب اس کتاب کو ناپسند کریں گے۔ پھر بھی وہ ان کی خوشی کے بغیر شائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ آخر آپ اس کتاب کو سرسید کی خدمت میں اس غرض سے لے گئے کہ وہ اس پر دیباچہ لکھ دیں۔ مولانا شبلی نے اس کتاب کو پڑھ کر کہا کہ سرسید

کے پاس یہ کتاب نے لے جایئے، وہ اسے ناپسند کریں گے مگر سید ممتاز علی صاحب نے مولانا ممدوح کے اس مشورے کو کچھ خیال نہ کر کے سرسید کی خدمت میں وہ کتاب پیش کر دی۔ مولوی صاحب نے خود ہم سے بیان کیا کہ:

''جس وقت میں نے یہ کتاب سرسید کو دکھلائی تو ہم دونوں کے سوا کمرے میں کوئی تیسرا نہ تھا۔ اندازاً گیارہ بجے کا وقت تھا، سب لوگ اپنے اپنے دفتر کو چلے گئے تھے۔ میں نے قصداً یہ وقت اس لئے پسند کیا تھا کہ اگر سید صاحب ممدوح غصّے بھی ہوں تو کسی دوسرے آدمی کی موجودگی میں تو نہ ہوں۔ سرسید نے اس کتاب کو کھول کر کہیں سے پڑھا اور چیں بجبیں ہوئے۔ پھر کسی دوسری جگہ سے کھول کر پڑھا تو چہرہ سرخ ہو گیا، اور جب آپ نے اس کا کوئی تیسرا مقام پڑھا تو آپ کے ہاتھ کانپنے لگے۔ آخر ضبط نہ کر سکے۔ آپ نے کتاب کو بند کر کے لمبائی میں پھاڑ کر اس کتاب کے دو ٹکڑے کر ڈالے، اور پھر ایک ٹکڑے کو دوسرے پر رکھ کر اس کے پھر دو ٹکڑے کر ڈالے اور چاروں ٹکڑوں کو ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا اور آپ نہایت غضب آلود نگاہیں دیوار پر جمائے ایک آدھ منٹ بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ میں بھی بالکل بے حس وحرکت بیٹھا تھا اور ڈر رہا تھا کہ میری کوئی حرکت ان کی توجہ کو ادھر مائل نہ کر دے۔ خدا کا شکر کہ خانساماں آ گیا اور اطلاع دی کہ میز پر کھانا حاضر ہے۔ سرسید تو اٹھ کر غسل خانے کی طرف چلے گئے اور میں ردّی کی ٹوکری میں سے ''حقوقِ نسواں'' کے پھٹے ہوئے پرزے اٹھا کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور بوجہ رنج کھانے میں بھی شریک نہ ہوا''۔

(تہذیبِ نسواں لاہور، ٦ جولائی ۱۹۳۵ء، ص ٦۱۵)

حماد غزنوی

تاریخی شخصیات کے معاملے میں ہمارا غیر سائنسی توجیہات کا رویّہ:

(انگریزی سے ترجمہ) ہماری تاریخ کی نصابی کتابیں برصغیر میں مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ کی غیر سائنسی توجیہات سے پُر ہیں۔...... شخصیات کے معاملے میں تو کیفیت اس

سے بھی شدید تر ہے۔ ہم اپنے قائدین کو ہمیشہ پوجتے ہیں۔ ہم نے اپنے قومی یا ملی ہیروز کو خوبیوں اور خامیوں پر مبنی انسان تسلیم کرنے سے ہمیشہ انکار کیا ہے۔ ہم اپنے ہیروز کی پرستش کرتے ہیں اور اس معاملے میں اس قدر حساس ہیں کہ ان کی شخصیت کا دوسرا رُخ سامنے لانے کی کوئی بھی کوشش بے ادبی تصور کی جاتی ہے۔ سرسید نے جنگِ آزادی کو غدر قرار دیا اور اپنے ہم وطنوں کی بغاوت کچلنے میں برطانویوں کا ساتھ دیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ خونی دور ہندوستانیوں کی احسان فراموشی کے باعث پیش آیا۔ اس وجہ سے انہوں نے آزادی کی جنگ لڑنے والوں کو بدتہذیب، جاہل، بدمعاش، حرامزادے وغیرہ الفاظ سے مخاطب کیا۔...... سرسید یقین رکھتے تھے کہ برطانوی حکمرانی پر اعتراض کرنا مسلمانوں کے مذہب کی خلاف ہے۔ یہ ان کے ایمان کا ایک جزو تھا کہ ملکہ کو اللہ تعالیٰ نے ہم پر حاکم کیا ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ اس کی حکومت برصغیر میں دائمی طور پر قائم رہے۔

(فرنٹیئر پوسٹ لاہور: ۱۰ جون ۱۹۹۴ء)

خلیق احمد نظامی

عقیدت مندوں کی غلط تعبیریں:

افسوس کی بات یہ ہے کہ سرسید کے وہ تاثرات جو حالات گردوپیش کا ردعمل تھے اور جن کی حیثیت بالکل وقتی تھی، ان کی بنیادی فکر سمجھ لئے گئے اور ان کی فکر کا وہ پہلو جس پر وہ سماج اور سیاست کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے، نظروں سے اوجھل ہوگیا..... آج بھی ان کی بنیادی فکر کے متعلق غلط فہمیوں کا وہی حال ہے، بلکہ بعض حیثیتوں سے اس میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ ان کے زمانے میں کم از کم ان کے عقیدت مند تو اُن کے افکار و نظریات کی غلط تفسیر و تعبیر نہیں کرتے تھے، آج ایک مخصوص مکتب خیال سے تعلق رکھنے والے عقیدت مندوں کا طبقہ ان سے وہ تصورات منسوب کرتا ہے جن کی پرچھائیاں بھی ان کے حاشیائی خیال پر نہیں پڑی تھیں۔ جو غلط فہمی عقیدت مندی کے سہارے پھیلائی جاتی ہے، اس کا دور کرنا مخالفوں کی بدظنی کا مقابلہ کرنے سے زیادہ دشوار ہوتا ہے۔

(سرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے: ص ۳۴)

مسلمانوں کو سیاست سے علیحدگی کا مشورہ:

جو لوگ سرسید کی تحریک کے بنیادی مقاصد کو سمجھ نہیں پائے، انہوں نے اس غلط فہمی کو پھیلایا ہے کہ سرسید نے انگریز کی غلامی اور سیاسی حقوق کے حصول کی جدوجہد سے علیحدگی کا سبق پڑھایا تھا۔ حقیقتاً سرسید کا خیال اس وقت یہ تھا کہ مسلمانوں کی ترقی کا انحصار ان کی مغربی تعلیم کے حصول پر مبنی ہے، اور اگر ابتدا ہی میں سیاست کے خارزار میں پھنس گئے تو قوم کی تعلیمی کوششیں پس پشت پڑ جائیں گی اور پھر کوئی راہ ان کی ترقی کی پیدا نہ ہو سکے گی۔ یہ تجزیہ صحیح تھا اور بالکل صحیح، اس کی بنیادی سچائی کو جس شخص نے سمجھا ہے وہ پنڈت جواہر لال نہرو تھے، اپنی سوانح حیات میں لکھتے ہیں کہ سرسید کا مسلمانوں کو سیاست سے علیحدگی کا مشورہ اور مغربی تعلیم پر ان کا زور ان کی فکر کی صحیح انقلابی سمت کو ظاہر کرتا ہے۔

(علی گڑھ کی علمی خدمات: ص ۱۳۵)

سیکولرازم -- سرسید کی زندگی کی حقیقت:

سیکولرازم آج ایک لفظ ہے بغیر مفہوم کے، سرسید کے لئے یہ زندگی کی ایک حقیقت تھا۔ ان کے نانا نے اپنے ہندو منیجر کو اولاد کے برابر جائداد میں حصہ دیا تھا۔ سرسید نے دورانِ قحط مراد آباد میں اپنے عمل سے ہندوؤں کے دل کو جیت لیا تھا جن میں راجہ جے کشن داس بھی تھے جو آخری دم تک ان کے حلقہ بگوش رہے۔ کالج کے ٹرسٹیوں نے فرسٹ آنے والے مسلمانوں کے لئے انعام و وظائف مقرر کئے تو انہوں نے خود اپنی جیب سے ہندو فرسٹ آنے والے طالب علموں کے لئے انعام کا اعلان کیا تھا۔

(سرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے: ص ۳۹)

انیسویں صدی کے ہندوستان میں جس وضاحت اور پختگی کے ساتھ سرسید نے ''سیکولرازم'' کا تصور پیش کیا وہ ان کے خیالات کی توانائی کو ظاہر کرتا ہے...... سرسید کے اس نظریہ کا اثر قومی ذہن پر یہ مرتب ہوا تھا کہ مذہبی لوگوں کا غیر مذہبی معاملات میں مذہبی حیثیت سے دخل بہت کم ہو گیا تھا۔ اقبال نے مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کو ایک خط میں لکھا تھا:

''آپ نے ٹھیک فرمایا ہے۔ پیشہ ور مولویوں کا اثر سر سید احمد خاں کی تحریک سے بہت کم ہو گیا تھا مگر خلافت کمیٹی نے اپنے پولٹیکل فتووں کی خاطر ان کا اقتدار ہندی مسلمانوں میں پھر قائم کر دیا۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی جس کا احساس ابھی تک غالبًا کسی کو نہیں ہوا۔ مجھ کو حال ہی میں اس کا تجربہ ہوا ہے''۔ (ایضاً ص ۴۱)

سر سید کا متحدہ قومیت کا تصور:

سر سید کی فکر کا ایک نہایت ہی اہم پہلو اُن کا تصور قومیت ہے۔ انہوں نے دو بنیادی حقیقتوں کو اس سلسلہ میں بار بار دُہرایا ہے۔ ایک یہ کہ قوم مذہب سے نہیں بنتی، دوسرے یہ کہ ہندوستان میں بسنے والے سب ایک قوم ہیں۔ عجیب اتفاق تھا کہ پہلے نظریہ کی پرزور تائید ان کے انتقال کے ۳۷ سال بعد دیو بند سے ہوئی جب مولانا حسین احمد مدنی نے اعلان کیا کہ قومیں وطن سے بنتی ہیں اور علامہ اقبال نے اس کی پرزور تردید کی ...... غالبًا آج بھی متحدہ قومیت کا تصور اس سے آگے نہیں پہنچا جہاں سر سید نے پہنچا دیا تھا۔ (ایضاً: ص ۳۹-۴۰)

بعض کوتاہ بینوں نے سر سید کے اردو ہندی تنازعہ میں طرز عمل اور نقطۂ فکر کو غلط سمجھا اور غلط پیش کیا ہے۔ سر سید اردو کو ہندو اور مسلمانوں کی متحدہ سماجی اور لسانی جدو جہد کا نتیجہ سمجھتے تھے اور اس سے علیحدگی کی تحریک کو اپنے متحدہ قومی نظریات کے منافی تصور کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح اتحاد و یگانگت کے وہ تمام جذبات، جو صدیوں کی جہد و سعی نے پیدا کئے تھے، سرد پڑ جائیں گے۔ (ایضاً: ص ۵۲)

مغربی علوم سے ذہنی مرعوبیت:

سر سید نے ''خطبات احمدیہ'' لکھ کر جس طرح میور کا مقابلہ کیا تھا، اور مستشرقین کے حملوں سے مدافعت کا سامان مہیا کیا تھا، اور تلاش و تحقیق کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا تھا، وہ اپنی جگہ لائق ستائش و اعتراف ہے لیکن تفسیر قرآن میں انہوں نے جو رنگ اختیار کیا، وہ مغربی علوم سے ذہنی مرعوبیت کو ظاہر کرتا ہے۔ مذہب اور سائنس کے معرکہ میں وہ اس طرح داخل ہوئے کہ سائنس کے نظریات کو مذہب کے مطابق ثابت کرنے کے لئے وہ توجیہات کیں جو ناقابل

قبول بھی تھیں اور غیر ضروری بھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اپنے ابتدائی زمانہ میں سرسید کی تفسیر سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ وجہ غالباً یہ تھی کہ اس کا استدلالی انداز گفتگو ان کے اس وقت کے مزاج کے مطابق تھا، لیکن جب ''ترجمان القرآن'' لکھنے کا وقت آیا تو فکر ونظر کے زاویے بدل چکے تھے۔ انہوں نے سرسید کا نام لئے بغیر ان کے طرز وفکر کی پوری مخالفت کی ہے اور لکھا ہے کہ سائنس کی Theories دن رات بدلتی رہتی ہیں۔ مذہب کو ان کے مطابق ڈھالتے رہنا خطرناک تجربہ ہے۔ مذہب اور سائنس دونوں کے میدان علیحدہ علیحدہ ہیں۔

(معارف اعظم گڑھ، جولائی ۱۹۸۹ء، ص ۲۶۔۲۷)

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی

مخالفت کی بنیاد محض مذہبی خیالات:

سرسید کے وہ مخالفین جو مذہبی حیثیت سے سرسید کے مخالف تھے، ان کی مخالفت اس لئے نہیں تھی کہ سرسید ان انگریزوں کا ساتھ دیتے ہیں جو کوٹ پتلون پہنتے ہیں، کانٹے چھری سے کھاتے ہیں اور جو اپنے ساتھ ریل، تار، انجن، بجلی، مشین، بھاپ، ہوٹل اور ہسپتال وغیرہ لے آئے ہیں بلکہ ان کی مخالفت کی ساری بنیاد سرسید کے مذہبی خیالات تھے جو قرآن وحدیث کی تفسیر کے بارے میں تھے۔ انہیں یہ ڈر تھا کہ کہیں سرسید قوم کو سدھارنے کی دھن میں مسلمانوں کا مذہب ہی نہ بدل دیں۔

(نگار کراچی، اکبر الہ آبادی نمبر ۱۹۶۹ء، ص ۱۲۷)

پروفیسر خورشید احمد

سمجھوتہ کاری کی کوششیں:

ان کی بائبل کی تفسیر ''تبیین الکلام'' ...... میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ انہوں نے بائبل کو غیر محرف اور الہامی مان کر اس سے اسلام تعلیمات کی تائید میں استدلال کیا ہے۔

ایک تجدد [illegible] ''سمجھوتہ کاری'' کی پہلی کوشش [illegible] سرسید مرحوم نے

کی۔ یہ سمجھوتہ بائبل کے ساتھ نہیں بلکہ پوری مغربی تہذیب اور خصوصیت سے انگریز حمرانوں کے ساتھ ایک سمجھوتہ تھا جس نے سیاسی حیثیت سے ہمارے وزن کو کم اور علمی، تہذیبی حیثیت سے ہمیں محض دفاعی پوزیشن میں ڈال دیا۔ پھر آپ کا رسالہ ''طعام اہل کتاب'' بہت اہم ہے۔ اس میں آپ نے یہ بات پیش فرمائی ہے کہ اہل کتاب کا ذبیحہ مسلمانوں کے لئے حلال ہے، خواہ اس پر کلمہ پڑھا گیا ہو یا نہیں اور اس کی دلیل منجملہ دیگر دلائل کے یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی ضرورت یہ ہے کہ وہ انگریزوں کے ساتھ اگر وہ اٹھیں بیٹھیں گے تو کھانا پینا ضروری ہے، اس لئے طعام کے معاملے میں ان سے یہ اختلاف نہیں رکھا جا سکتا کہ ہم تمہارا ذبیحہ نہیں کھائیں گے۔

(تحریک اسلامی شاہ ولی اللہ سے علامہ اقبال تک: ص۱۷)

سرسید تحریک کا بنیادی نقص:

سرسید مرحوم کا اس پوری تحریک اور اس کے نتائج کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیادی خرابی یہ تھی کہ انہوں نے اسلام کو معیار بنا کر اصلاحی کام انجام نہیں دیا تھا بلکہ اس کے برعکس قدم قدم پر اسلام کی قطع و برید کی .....اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی ''اصلاح'' اور اسے جدید تصورات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی گئی۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ یہ کام نیک نیتی اور اخلاص کے ساتھ کیا گیا یا بدنیتی کے ساتھ۔ ہمارا گمان ہے کہ نیک نیتی ہی کی بنا پر کیا گیا لیکن نیک نیتی سے اگر کسی کے دست و بازو کاٹ دئے جائیں تو وہ شخص تو بہرحال اپاہج ہو ہی جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ سید مرحوم اہم اسلامی مباحث پر علمائے سلف سے بہت دور ہٹ گئے ہیں۔ (ایضاً ص۴۵۔۴۶)

تعبیری فتنوں کی بنیاد:

سرسید کو اگر معاف فرمایئے باوجود اپنے تمام اخلاص وللہیت کے، تعبیر کے بہت سے فتنوں کی بنیاد مرحوم ہی نے رکھی اور ان کے افکار ونظریات سے تحریک پا کر بہت سے ذہنی فتنے ابھرے۔ قرآن اور حدیث کی مرعوبانہ ذہن کے ساتھ تعبیر کرنے کا جو فتنہ اس ملک میں

رونما ہوا اور جس کے شاہکار آپ کو جا بجا ملتے ہیں، ان کی ابتدا سرسید مرحوم کے تفسیری مباحث سے ہی ہوئی۔ نیز سرسید مرحوم کی فکر اور ان کی تحریک کے مطالعہ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اوپر ایک منفی احساس غالب ہے۔ یہ ایک منفی چیز ہے کہ مغرب سے جو اعتراض کئے جائیں ان کا جواب دے دو، جو شبہات اُبھارے جائیں ان کو رفع کر دو۔ ہماری نگاہ میں یہ عمل بحیثیت مجموعی کچھ فوائد پہنچانے کے باوجود تحریکِ اسلامی کے استحکام میں بہت بڑی رکاوٹ ہے اور ہماری نگاہ میں سرسید اور اقبال میں بنیادی فرق یہی ہے کہ اقبال نے مثبت رویہ اختیار کیا جبکہ سرسید کی تحریک اپنی روح اور مزاج کے اعتبار سے منفی تھی۔ (ایضاً ص ۱۵)

سید خورشید احمد گیلانی

انگریزوں کی حمایت میں ذہنی عدم توازن:

جو کام انگریز اپنے ذہین مشیروں اور کارندوں کے ذریعے انجام نہ دے سکا کہ کسی طرح مسلمانوں کی انگریز دشمنی کی لہر کو مدھم کیا جا سکے، وہ کام بدقسمتی سے سرسید مرحوم نے سرانجام دیا اور وہ انگریزوں کی عدالت میں مسلمانوں کے خود ساختہ وکیل بن کر رحم کی اپیل دائر کرنے میں لگ گئے کہ ”جہاں پناہ! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ مسلمان آپ کے دشمن ہیں۔ کوئی اور آپ کا دشمن ہو تو ہوا کرے، مسلمان کا دل آپ کے خلاف کینہ اور کدورت سے بالکل پاک اور صاف ہے“۔ یہ برخود وکالت تھی جو مسلمانوں کے حوالے سے دی جارہی تھی۔ اگر مسلمان انگریزوں کے مخالف نہ ہوتے تو پلاسی کا معرکہ کیوں برپا ہوتا؟ سرنگاپٹم میں لڑائی کیوں ہوتی؟ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ ہندوستان کو دارالحرب کیوں قرار دیتے؟ علامہ فضلِ حق خیر آبادیؒ کو کالے پانی کی سزا کیوں ہوتی؟ شاہ احمد اللہ مدراسی کیوں سولی پر لٹکتے؟ فرائضی تحریک کیوں شروع ہوتی؟ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کیوں چھڑتی؟ الغرض مسلمان انگریز کے مخالف تھے اور مخالف رہے، اور ان کے ہر اقدام کا ایک ایک جز وانگریز دشمنی پر مبنی تھا۔ کوئی مؤرخ اور دانشور اس کی کوئی سی توجیہہ کرے، بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ عامۃ المسلمین مادی طور پر انگریز

ئی۔ یہ سمجھوتہ بائبل کے ساتھ نہیں بلکہ پوری مغربی تہذیب اور خصوصیت سے انگریز حکمرانوں کے ساتھ ایک سمجھوتہ تھا جس نے سیاسی حیثیت سے ہمارے وزن کوکم اور علمی، تہذیبی حیثیت سے ہمیں محض دفاعی پوزیشن میں ڈال دیا۔ پھر آپ کا رسالہ ''طعام اہل کتاب'' بہت اہم ہے۔ اس میں آپ نے یہ بات پیش فرمائی ہے کہ اہل کتاب کا ذبیحہ مسلمانوں کے لئے حلال ہے، خواہ اس پر کلمہ پڑھا گیا ہو یا نہیں اور اس کی دلیل منجملہ دیگر دلائل کے یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی ضرورت یہ ہے کہ وہ انگریزوں کے ساتھ اگر وہ اٹھیں بیٹھیں گے تو کھانا پینا ضروری ہے، اس لئے طعام کے معاملے میں ان سے یہ اختلاف نہیں رکھا جا سکتا کہ ہم تمہارا ذبیحہ نہیں کھائیں گے۔

(تحریک اسلامی شاہ ولی اللہ سے علامہ اقبال تک: ص ۴۹)

سرسید تحریک کا بنیادی نقص:

سرسید مرحوم کا اس پوری تحریک اور اس کے نتائج کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیادی خرابی یہ تھی کہ انہوں نے اسلام کو معیار بنا کر اصلاحی کام انجام نہیں دیا تھا بلکہ اس کے برعکس قدم قدم پر اسلام کی قطع و برید کی ..... اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی ''اصلاح'' اور اسے جدید تصورات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی گئی۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ یہ کام نیک نیتی اور اخلاص کے ساتھ کیا گیا یا بدنیتی کے ساتھ۔ ہمارا گمان ہے کہ نیک نیتی ہی کی بنا پر کیا گیا لیکن نیک نیتی سے اگر کسی کے دست و بازو کاٹ دئے جائیں تو وہ شخص بہرحال اپاہج ہو ہی جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ سید مرحوم اہم اسلامی مباحث پر علمائے سلف سے بہت دور ہٹ گئے ہیں۔ (ایضاً: ص ۴۵۔۴۶)

تعبیری فتنوں کی بنیاد:

سرسید کو اگر معاف فرمایئے باوجود اپنے تمام اخلاص وللہیت کے، تعبیر کے بہت سے فتنوں کی بنیاد مرحوم ہی نے رکھی اور ان کے افکار و نظریات سے تحریک پا کر بہت سے فتنے ابھرے۔ قرآن اور حدیث کی مرعوبانہ ذہن کے ساتھ تعبیر کرنے کا جو فتنہ اس ملک میں

رونما ہوا اور جس کے شاہکار آپ کو جا بجا ملتے ہیں، ان کی ابتدا سر سید مرحوم کے تفسیری مباحث سے ہی ہوئی۔ نیز سر سید مرحوم کی فکر اور ان کی تحریک کے مطالعہ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اوپر ایک منفی احساس غالب ہے۔...... یہ ایک منفی چیز ہے کہ مغرب سے جو اعتراض کیے جائیں ان کا جواب دے دو، جو شبہات اُبھارے جائیں ان کو رفع کر دو۔ ہماری نگاہ میں یہ تحریک بحیثیت مجموعی کچھ فوائد پہنچانے کے باوجود تحریکِ اسلامی کے استحکام میں بہت بڑی رکاوٹ ہے اور ہماری نگاہ میں سر سید اور اقبال میں بنیادی فرق یہی ہے کہ اقبال نے مثبت رویہ اختیار کیا جبکہ سر سید کی تحریک اپنی روح اور مزاج کے اعتبار سے منفی تھی۔ (ایضاً ص ۵۱)

سید خورشید احمد گیلانی

انگریزوں کی حمایت میں ذہنی عدم توازن:

جو کام انگریز اپنے ذہین مشیروں اور کارندوں کے ذریعے انجام نہ دے سکا کہ کسی طرح مسلمانوں کی انگریز دشمنی کی لہر کو مدھم کیا جا سکے، وہ کام بد قسمتی سے سر سید مرحوم نے سر انجام دیا اور وہ انگریزوں کی عدالت میں مسلمانوں کے خود ساختہ وکیل بن کر رحم کی اپیل دائر کرنے میں لگ گئے کہ ”جہاں پناہ! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ مسلمان آپ کے دشمن ہیں۔ کوئی اور آپ کا دشمن ہو تو ہوا کرے، مسلمان کا دل آپ کے خلاف کینہ اور کدورت سے بالکل پاک اور صاف ہے“۔ یہ بر خود وکالت تھی جو مسلمانوں کے حوالے سے دی جا رہی تھی۔ اگر مسلمان انگریزوں کے مخالف نہ ہوتے تو پلاسی کا معرکہ کیوں برپا ہوتا؟ سرنگا پٹم میں لڑائی کیوں ہوتی؟ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ ہندوستان کو دار الحرب کیوں قرار دیتے؟ علامہ فضلِ حق خیر آبادیؒ کو کالے پانی کی سزا کیوں ہوتی؟ شاہ احمد اللہ مدراسی کیوں سولی پر لٹکتے؟ فرائضی تحریک کیوں شروع ہوتی؟ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کیوں چھڑتی؟ الغرض مسلمان انگریز کے مخالف تھے اور مخالف رہے، اور ان کے ہر اقدام کا ایک ایک جزو انگریز دشمنی پر مبنی تھا۔ کوئی مؤرخ اور دانشور اس کی کوئی سی توجیہہ کرے، بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ عامۃ المسلمین مادی طور پر انگریز

سے شکست کھا گئے تھے لیکن سرسید مرحوم ذہنی طور پر انگریزی استعمار سے مغلوب ہو گئے تھے اور وہ اپنے حروف الفاظ کو انگریزوں کے خلاف نفرت ابھارنے کے بجائے خود کو گرانے اور اپنی ہجو کرنے میں استعمال کرتے رہے۔ اسے سرسید کی کھلی ذہنی شکست کہیے یا نوآبادیاتی نظام کے بدترین نفسیاتی اثرات کی تجسیم کا نام دیجئے، بہر کیف ثابت یہی ہوتا ہے کہ سرسید نے اپنا زور انگریزی استعمار سے مجہول مطابقت پذیری میں صرف کیا۔

(درویش لاہور، مئی ۱۹۸۹ء: ص ۸۰۔۸۱)

سرسید مرحوم کی انگریزی استعمار سے مطابقت بلکہ اس کی حمایت کی لے اتنی تیز ہو گئی کہ وہ محض سیاسی حربے کے طور پر اسے نہیں اپنانا چاہتے تھے بلکہ مستقل سلسلہ مضامین اور ہنگامی بیانات کے ذریعے انگریز کی حمایت کو باقاعدہ مذہبی سند قرار دینے پر اصرار کرتے رہے۔ مراد آباد سے جاری ہونے والے اپنے ایک جریدے ''لائل محمڈنز آف انڈیا'' میں ایک بیان کے ذریعے مسلمانوں کے بالائی طبقے میں یہ تحریص اور ترغیب پیدا کرنے کی کوشش کی کہ وہ ممکن حد تک انگریز سے مراعات ملنے کے عوض اس سے کامل وفاداری کا مظاہرہ کریں، اور وہ اپنے اس بیان میں ان برسرپیکار مسلمانوں پر نفرت کے تیر برساتے ہیں جنہیں کسی بھی قیمت پر انگریزی استبداد اور استعمار منظور نہیں تھا۔ انگریزی عنایات جن پر ہوئیں انہوں نے انگریزوں کا ساتھ بھی دیا لیکن جن کے حصے میں بے قدری، اقتدار سے محرومی، تشخص کی پائمالی جیلیں، جزائر انڈیمان کی سزائیں، کوڑے، پھانسیاں اور سختیاں آئیں انہیں ناشکری اور نمک حرامی کا طعنہ چہ معنی دارد؟ اس معاملے میں سید موصوف اتنے پرجوش اور جذباتی ہو گئے ہیں کہ ان کے اس رویئے کو نرم سے نرم الفاظ میں ''ذہنی عدم توازن'' کا نام دیا جا سکتا ہے۔ (ایضاً: ص ۸۲۔۸۳)

خورشید اکبر

فروگزاشتوں کے جائزوں میں ''دانش ورانہ معصومیت'':

سرسید احمد کی ذاتِ بابرکات سے تمام تر عقیدتوں کے باوصف بیشتر ثقہ اصحاب فکر و دانش کی تحریریں منصفانہ علمی فضا خلق کرنے سے قاصر نظر آتی ہیں، بالخصوص سیاست اور

ہندوستانی سماج کی تشکیل نو کے تعلق سے سرسید کے افکار و نظریات کا بے باکانہ تجزیہ بھی معروضیت کا تقاضا کرتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ان کی فروگزاشتوں کے جائزے میں بھی ارباب فکر و نظر محض قیاسی جواز کی فراہمی سے گریز نہیں کرتے۔ اس قسم کی ''دانش ورانہ معصومیت'' نے سرسید کی تفہیم کے راستے محدود کر دیے ہیں۔

(جامعہ دہلی، جولائی تا دسمبر ۱۹۹۸ء ص ۳۵۷)

فکر اور عمل کے متضاد مظاہر:

ہر چند کہ سرسید نے کورانہ مغرب پرستی کو اپنی کئی تحریروں میں غلط سمجھا ہے لیکن وہ عملی طور پر مغرب کے سحر سے آزاد نہیں ہو سکے۔ ان کی ذکر اور عمل کے متضاد مظاہر نے کئی تاریخی غلط بینیوں کو بھی جنم دیا۔ فرنگی حکومت سے عقیدت اور اس کی پاسداری کے علاوہ انگریزوں کے مقابلے میں اپنی قوم کو فرومایہ سمجھنا سرسید کی بصیرت کے متنازع فیہ علاقے ہیں۔ وہ اسلامی معاشرے کو فرسودہ رسوم اور دقیانوسیت کے حصار سے نکال کر جس مغربی تعلیم کے سہارے آگے لے جانا چاہتے تھے، اسی مغربی تعلیم نے ان کے شعور پر کچھ متوازن اثرات بھی مرتب کئے۔ اس میں قصور مغربی تعلیم کا نہیں تھا بلکہ ان کی ذاتی ترجیح کا تھا ورنہ کیا سبب ہو سکتا ہے کہ شاہ مخصوص اللہ (نبیرہ شاہ ولی اللہ) کی شاگردی، مذہب اسلام کے تصور عدل و مساوات اور تصوف کی تعلیمات میں یقین کے باوجود تہذیب اور معاشرت کے ایک اشرافی تصور سے سرسید آزاد نہیں ہو سکے۔ سرسید کی سوچ کے پس پشت کون سے اسباب و عوامل کارفرما تھے، یہ مسئلہ گہرے غور و فکر کا طلب گار ہے۔ یوں سرسید کا ظاہری تعلق جس نظام اقدار سے تھا، اس کے پیش نظر کسی معاشرتی تفریق کی گنجائش نہیں تھی...... سرسید کو اپنے نسلی امتیاز کا کتنا گہرا احساس تھا اور وہ اپنی روایات سے کتنا شدید تعلق رکھتے تھے، ان کے شعور کی مخصوص جہتوں کو اس پس منظر کی روشنی میں بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے...... واقعہ یہ ہے کہ سرسید اپنے ہم وطنوں کو انگریزوں کے مقابلے میں بے حد کم تر سمجھتے تھے۔ انگریزوں کی ذہنی اور تہذیبی برتری کا انہیں مبالغہ آمیز احساس تھا...... ہم دیکھتے ہیں کہ آزمائش کے لمحے میں سرسید نے قومی آزادی کی جدوجہد میں شریک ہونے کی بجائے اپنی تمام تر توجہ تعلیمی سرگرمیوں پر مرکوز کر دی۔ انہوں نے اس

وقت تک اپنی قوم کو کانگرس میں شریک ہونے یا عملی سیاست میں حصہ لینے سے باز رکھنا چاہا جب تک کہ ہندوستان کا تعلیمی اور معاشی معیار انگلستان کے ہم پلہ نہ ہو جائے۔ سرسید کے اس اقدام کو بعض اصحاب فکر نے دانش مندانہ مصلحت سے تعبیر کیا ہے اور اس کے پس پردہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے مضر اثرات کو ذمے دار ٹھہرایا ہے حالانکہ غدر اور ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگرس کے درمیان تقریباً ۲۸ برسوں کا زمانی تفاوت ہے، اس لئے اس کے اسباب وعلل کی تلاش خارجی واقعات کی بجائے سرسید کی داخلی شخصیت میں کی جانی چاہیے۔...... کانگرس کی کھلے عام مخالفت، فرنگی حکومت کی غیر ضروری وکالت اور عملی سیاست میں علیحدگی کی تلقین کے پیچھے بڑی حد تک سرسید کا اشرافی رویہ کارفرما تھا ان کے عملی دائرہ کار نے یہ ثابت کر دیا کہ انہیں مسلمانوں کے اعلیٰ طبقات کی فکر زیادہ تھی۔ اس مخصوص رویے نے پس ماندہ اور مزدور پیشہ مسلمانوں کے مسئلے کو پس پشت ڈال دیا۔ سرسید نے سیاسی تحریک کی جو مخالفت کی تو اس کی خاص وجہ یہی تھی کہ وہ اعلیٰ طبقے کے مسلمانوں کی مشکلات میں تخفیف کے جویا تھے......سرسید کو رخصت ہوئے اب سو سال کی مدت گزر چکی۔ ان کی خدمات کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ اس امر کی ضرورت ہے کہ ان کے مجموعی نظام فکر کا معروضی تجزیہ کیا جائے اور ان کی حدود کو سمجھنے کی کوشش بھی کی جائے۔ سرسید کی عہد ساز شخصیت صرف رسمی عقیدت مندانہ جوش اور جذباتیت کی محتاج نہیں ہے۔ تاریخ کے ایک پیچیدہ دور میں اس شخصیت کا ظہور ہوا تھا۔ پھر اس شخصیت کی اپنی پیچیدگیاں بھی تھیں، چنانچہ یہ دور اور اس سے وابستہ تمام حقیقتیں نئے سرے سے اپنی تفہیم اور تجزیے کا تقاضا کرتی ہیں۔ (ایضاً ص ۳۵۷ تا ۳۶۶)

خورشید مصطفیٰ رضوی

تحریک آزادی کے پیٹ میں خنجر:

نواب محمود نے امروہہ، مراد آباد وغیرہ میں بھی فوج کے دستے روانہ کئے تاکہ تحریک آزادی کو تقویت پہنچے مگر وہاں انگریزوں کے بعض وفادار سرسید اور رحمت خاں وغیرہ برابر تحریک آزادی کے پیٹ میں خنجر گھونپنے کی مذموم کوششوں میں مصروف تھے۔ ان کی انگریز

حکام سے خفیہ خط و کتابت ہوتی تھی

ڈاکٹر خیال امروہوی

سیکولر سرسید کے مذہبی تصورات:

سرسید نے اپنے دور میں قرآن کی جدید انداز سے تفسیر کی اور طبقاتی اعتبار سے مسلمانوں کو انگریزوں اور ہندوؤں کے مقابل علمی اور نظریاتی طور پر اونچا کرنے کی کامیاب کوشش کی، مجبور انسانوں کو مذہبی تعصبات کی دلدل سے نکال کر سیکولر ذہن پیدا کرنے کے لئے تحریک چلائی۔ اس اعتبار سے بلاشبہ برصغیر پاک و ہند کے عوام سرسید کے احسانات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

(سپوتنک لاہور، جنوری ۱۹۹۵ء: ص ۳۳)

سید احمد نے غلط معتقدات کے بخیے ادھیڑ دیئے اور اسلام کو عیسائی، یہودی اور ہندو دھرم بننے سے بال بال بچالیا۔ چنانچہ موجودہ اسلام تو وہ اسلام ہی نہیں جو قرآن میں موجود ہے۔ (ایضاً: ص ۳۴)

انہوں نے قرآنی آیات کی مروجہ تفاسیر کو ناقص قرار دیا، قرآنی متشابہات اور تماثیل کے لغوی معنی متعین کئے اور پھر مفسروں کی تاریخی اغلاط کی نشان دہی کر کے "قصص القرآن" کو عبرت آموز بنا دیا، ورنہ مجھ جیسا جاہل تو والدین اور اساتذہ کے ارشادات کے مطابق یہی سمجھتا کہ وحی الٰہی زمینی چیز نہیں بلکہ آسمانی ہے، منزل من اللہ، لیکن اس کی مادی تشریح مقالات سرسید...... میں ملی جس سے معلوم ہوا کہ وحی الٰہی کی وہ تفسیر درست نہیں جو اہل مذاہب کے یہاں رائج ہے۔ اسی طرح معجزات کی حقیقت کو بھی سرسید نے انتہائی نیچرل انداز میں بیان کیا ورنہ اب تک تو ہم معجزات کو "بھان متی" کا تماشہ ہی خیال کرتے آئے تھے کہ "مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ"۔ (ایضاً: ص ۳۶)

فرشتوں کے وجود کے بارے میں سرسید نے مفسرین کے مغالطوں کی تردید کی اور

بتایا کہ قرآن میں صرف جبرئیل اور میکائیل کے نام ہیں، باقی اسرافیل و عزرائیل کے شاخسانے ''اسرائیلیات'' کے زمرے میں آتے ہیں۔ سرسید کے مطابق فرشتوں کا ''وجود'' خارج نہیں بلکہ قوی (Forces) کے معنوں میں ہے اسی طرح ''شیطان'' کی حقیقت پر سرسید نے جو تحقیقی دریا بہائے ہیں، ان میں تمام ایمان ساز مفسرین تنکوں کی طرح بہتے دکھائی دیتے ہیں۔ (ایضاً ص ۳۷)

سرسید نے قرآنی آیات کے لب و لہجے اور Situation ہی سے ثابت کردیا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے والد ''یوسف'' نامی ایک شخص تھے اور تقدس پیدائش عیسیٰ کو نہایت دانش ورانہ اسلوب اور تاریخی پس منظر کے ساتھ سائنٹفک اور نیچرل بنا کر پیش کیا ہے۔ اسی طرح حضرت لوطؑ کے فرشتوں، حضرت یوسف کا قصہ، قوم عاد وثمود کے حالات، طالوت و جالوت کا قصہ، موسیٰ اور فرعون کا قصہ ''فلق البحر''، ہاروت ماروت کی اصلیت، غزوہ بدر یا قرآن کا کون سا واقعہ یا روایت ہے جسے روایتی مفسرین نے رام کہانی بنا کر پیش کیا ہو اور سرسید نے اس کی عالمانہ اصلاح نہ فرمائی ہو۔ (ایضاً ص ۳۸)

سرسید نے جہاں انگریزی پڑھوا کر ''افسر شاہی'' پیدا کی وہاں ''ملائیت'' کی بنیادیں بھی ہلادیں۔ ہم تو سرسید احمد اور غلام احمد پرویز یا ان کے متبعین کو اس لئے آگے لانا چاہتے ہیں کہ وہ ''ملائیت'' کے لئے ڈھال کا کام دیتے ہیں۔ آج کی افسر شاہی مغرب پسند سے زیادہ ''شاونسٹ'' ہے ہمیں شاونزم کو سوشلزم میں تبدیل کرنا ہے۔ موجودہ بیوروکریسی سے ہم ناامید نہیں لہٰذا اس معرکے میں ان تمام حربوں کو استعمال کرنا ہے جن سے انسان دشمن اور خرد دشمن افکار کا خاتمہ ہوسکے۔ (ایضاً ص ۳۹)

بنیاد پرستی سے چھٹکارے کا عمل:

بنیاد پرست مذہبی ذہن یا سوقیانہ [illegible]ب پسند مذاق سائنٹفک سوشلزم کو مکمل طریقے سے نہیں سمجھ سکتا کیونکہ صدیوں پرانے غیر سائنسی مذہبی عقائد موجود ہیں۔ یعنی اگر ایک مسلمان سائنسی سوشلزم کو سمجھنا چاہے تو اس کی فکری تطہیر ضروری ہے۔ اس کے لئے سرسید احمد خاں اور غلام احمد پرویز کے دروازوں پر دستک دینی ہوگی [illegible] اس لئے ہر معقول طالب علم کے لئے

ضروری ہے کہ وہ مارکس یا لینن کے اس قول پر جذباتی بحث نہ کرے کہ ''مذہب افیون ہے''، بلکہ سرسید کے مقالات کا مطالعہ کرے، غلام احمد پرویز کا گہرا مطالعہ کرے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ پرویز کی دو چار کتابوں کے مطالعے سے ہی ایک قاری نئی دنیا میں آجاتا ہے اور بنیاد پرستانہ خیالات سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جاتی ہے، اس کے بعد مارکسزم اور لینن ازم کا مطالعہ کرے۔ (ایضاً ص ۴۰)

ذاکر حسین

علی گڑھ کی اپنے بانی کے مذہبی خیالات سے غیر وابستگی:

ایسے لوگ معقول تعداد میں کبھی نہیں رہے جنہوں نے مذہبی افکار میں سرسید کے ساتھ اتفاق کیا ہو۔ طلبائے علی گڑھ کی پچھلی نسلیں شاید اس سے مستثنٰی ہوں لیکن ان کے بارے میں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ اس مصلح نے ترجمانی مذہب کے معاملے میں جن لبرل خیالات اور مذہبی رواداری سے کام لیا اس کو انہوں نے مذہب سے اپنی بے پروائی کے واسطے ایک سہل جواز کے طور پر تو استعمال نہیں کیا۔ آج کے علی گڑھ کے متعلق اگر کوئی صحیح بات کہی جاسکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ اسے اپنے بانی کے خیالات کے مذہبی پہلو سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

(ذاکر صاحب اپنے آئینہ لفظ و معنی میں: ص ۷۷)

رحمت اللہ طارق

مذہبی اساس پر قومی تقسیم سے ناگواری:

...... ہماری نصابی کتابوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، وہ اس نقطہ نظر کو واضح کرتے ہیں کہ ہند میں علیحدہ قومیت کی داغ بیل سرسید نے رکھی تھی۔ اس کے برعکس ایک دوسرا نقطہ نظر ہے جسے تقسیم ہند کے بعد ہندی دانش ور پیش کرتے ہیں کہ سرسید ایک ہندوستانی ریفارمر اور ہیرو تھے۔ وہ معروضی حالات میں مسلمانوں کی تعلیمی و سماجی اور سیاسی اصلاح تو ضرور چاہتے تھے مگر ''مسلم قومیت'' سے ان کا تعلق تھا، نہ واسطہ بلکہ یہ لفظی ترکیب ان دنوں سرسید کے حوالہ سے نہ

متعارف ہوئی تھی نہ ایجاد۔ اس طرح سرسید کے حوالہ سے دو نقطہ ہائے نظر سامنے آتے ہیں۔

(آواز لاہور، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۸ء، ص ۱۵۱)

قوم اور قومیت کے مفاہیم مصلحتوں اور مفادات کے تابع بدلے جاتے رہے ہیں اور بدلے جاتے رہیں گے، تاہم ان معروضی تبدیلیوں کے باوجود اس کے اصلی اور وضعی معنی تبدیل نہیں ہوئے اور نظریات پرستوں نے جتنا بھی زور لگایا، اپنے عنوان سے ''مسلم قومیت'' بمعنی ذات و نسل مخصوص نہ کر سکے۔ (ایضاً ص ۲۵۲)

ہندوؤں کی طرف سے کچھ ایسے مفاہمت شکن حالات پیدا ہو چکے تھے کہ آپ نے مجبور ہو کر اور معروضی حالات کو مدنظر رکھ کر مسلمانوں کے لئے ''عرفِ عام'' کا سہارا لیا جب کہ عرف عام بطور خاص غلط بھی استعمال ہوتا رہتا ہے اور غالباً سرسید جیسے فرزانہ سیاست دان بلکہ یگانہ سکالر نے حقیقت کا ادراک کرتے ہوئے بھی صدیوں سے رائج غلط العام نوعیت عرفِ عام کو دانستہ ایکسپلائٹ کیا تاکہ ''معروضی'' طور پر مقصد برآری کا سامان ہو سکے۔ لیکن پھر ہوا یہ کہ اس ''معروضی'' تجویز کو آنے والوں نے مستقل فارمولا بنا لیا جب کہ اسلام میں تمام قانونی لچک موجود ہونے کے باوجود فریق بننے یا قومیت میں ڈھلنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے کہ اسلام ایک آفاقی نظریہ حیات، آئیڈیالوجی اور نصب العین کا نام ہے۔ وہ جغرافیائی اور کسی علاقائی محل وقوع میں نہیں ڈھل سکتا جب کہ قومیت جغرافیائی اور وطنی محل وقوع کی محتاج ہوتی ہے۔ (ایضاً ص ۲۵۳)

سرسید بیرونی معاملات یعنی غیر عقائدی معاملات میں اسلام کو درمیان میں لانے کے لئے تیار نظر نہیں آتے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ آپ سیکولر خیالات کے تھے۔ نہیں، اس طرح تو سوچنا بھی نہ چاہیے۔ آپ راسخ العقیدہ اور دفاعِ اسلام کے لئے اپنی تمام توانائیاں صرف کرنے والے تھے، بایں ہمہ بنیاد پرست نہیں تھے۔ آپ نے ''مسلم'' کے لفظ کو قومیت کا تنگ پاجامہ پہنا کر صرف غلط العام کی روایت کا سہارا لیا تھا جو معروضی بھی تھا اور ضروری بھی۔ (ایضاً ص ۲۵۶)

سرسید مرحوم ایک وسیع الظرف اور جینئس انسان تھے۔ آپ تنگ ظرفی سے کوئی

سروکار نہ رکھتے تھے۔ وہ حقائق کے پاسدار تھے اور حقائق ہی کو سامنے لانا پسند فرماتے تھے۔ مذہب کی اساس پر'' قومی تقسیم'' کو'' ناگوار'' تصور کرتے تھے۔ (ایضاً ص ۲۵۷)

پروفیسر رشید احمد

سیاست اور مذہب میں کوئی رشتہ نہیں:

سرسید مذہب کو تو عقل سے جدا نہیں دیکھنا چاہتے لیکن سیاست اور مذہب میں ان کے نزدیک کوئی رشتہ نہیں بلکہ ان کے نزدیک مذہب سیاست کی راہ میں ایک زبردست روڑا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ دینی حکومتیں جو دینی اور دنیوی دونوں کاموں میں اپنے آپ کو ان احکامات کا پابند اور مجبور سمجھتی ہیں جن کو انہوں نے مذہبی احکام تصور کر رکھا ہے، ایسی حکومتیں بالعموم غیر مہذب ہوتی ہیں کیونکہ وہ قدما کے جادہ سے سرمو تجاوز کرنے کے لئے، آمادہ نہیں ہوتیں، خواہ قدما کا رویہ مذہبی اعتبار سے غلط ہی کیوں نہ ہو۔ سرسید کہتے ہیں کہ ایسے لوگ نہایت تنگ نظر ہوتے ہیں اور معمولی معمولی جزئیات کے متعلق بھی مذہبی سند تلاش کرتے ہیں ...... سرسید کی رائے میں'' ایسا ملک اور ایسی قوم ہمیشہ تنزل کی حالت میں رہتی ہے، تہذیب وشائستگی کی ہوا بھی وہاں تک نہیں جاتی، کوئی مستحکم قانون ان کے ہاں نہیں ہوتا، کسی شخص کے حقوق محفوظ نہیں ہوتے، کوئی شخص مال سے پورا پورا تمتع حاصل نہیں کرسکتا، نہ کبھی ملک میں امن ہوتا ہے''۔ وہ ترکی کی مثال پیش کر کے اس کے آئے دن کے فسادات اور بدامنی کا ذکر کرتے ہیں اور تمام بدنظمی، لاقانونیت اور اقتصادی ابتری کی واحد وجہ اس غلط خیال کو بتلاتے ہیں'' جس کے بموجب دینی اور دنیوی دونوں قسم کے کاموں کو مذہب میں شامل سمجھا ہے اور 'انتم اعلم بامور دنیاکم' کے جملے کو چھوڑ دیا ہے''۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ترکی ہی پر کیا، جن حکومتوں نے مذہب اور سیاست کو توام سمجھ رکھا ہے، ان کا بھی ترکی جیسا حال ہے لیکن جن مسلمان حکومتوں نے سیاست کو مذہب سے الگ رکھا ہے، ان کی حالت بہتر ہو رہی ہے اور اسی مناسبت سے وہ ترقی کر رہی ہیں۔ اس سلسلے میں وہ مصر و تیونس کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ سید خیر الدین، وزیر تیونس کے بڑے مداح ہیں جن کا عقیدہ یہ تھا کہ امورِ دنیوی سے احکامِ مذہبی کو کچھ تعلق نہیں۔ اسی

طرح وہ خدیو مصر اسمٰعیل پاشا کی تعریف میں رطب اللسان ہیں جس نے لادینی طرز کی حکومت کی بنیاد رکھی۔

سر سید کے یہ خیالات ممکن ہے کہ ہمارے کانوں کو ناگوار معلوم ہوتے ہوں لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ انیسویں صدی میں اسلامی حکومتیں جاں بلب تھیں اور لادینی طرز کی حکومتوں نے ان کے لئے عرصہ حیات تنگ کر دیا تھا، ملاؤں کا کاروبار مملکت میں بڑا دخل تھا جو اپنی قدامت پسندی کے باعث ہر قسم کی اصلاح کے شدید مخالف تھے، حتیٰ کہ تابڑ توڑ شکستوں کے باوجود فوج کو جدید اسلحات جنگ سے مسلح کئے جانے کی مخالفت میں انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ ان کے اس رویہ نے تمام تعلیم یافتہ اور روشن دماغ افراد کو مذہب سے بیزار بنا کر رکھ دیا، اس لئے اگر سر سید مذہب کو سیاست سے الگ رکھنے کے خواہاں ہیں تو ہمیں غم و غصہ کے اظہار کے بجائے اس ماحول کو پیش نظر رکھنا چاہیے جس میں یہ نظریات پیش کئے گئے تھے اور جن سے مجبور ہو کر کمال اتا ترک کو لادینی قسم کی حکومت قائم کرنی پڑی تھی اور ادارہ حکومت سے مذہب کو بے دخل کرنا پڑا تھا۔

(ثقافت لاہور، اگست ۱۹۵۹ء: ص ۱۴۔۱۵)

اطاعت! اطاعت! نہ ایجی ٹیشن، نہ احتجاج!

سر سید جہاں رعایا کے حقوق کی تفصیل لکھتے ہیں وہاں ان کے فرائض کے بیان کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے۔ وہ تاکید کرتے ہیں کہ رعایا بادشاہ کی خیر خواہ اور وفادار رہے۔ فرماں روا خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم، بہر حال سر سید کے نزدیک اس کی اطاعت رعایا پر فرض ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام میں اس سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں کہ جس حکومت کے سایہ حمایت میں رعیت کو ہر طرح کا امن اور آزادی حاصل ہو، اس کی رعیت حکومت کی وفادار اور خیر خواہ نہ ہو۔ اسی لئے ان کا دعویٰ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا مذہباً یہ فرض ہے کہ اپنے بادشاہ، جس کی وہ رعیت ہیں اور جس کی امان میں مذہبی آزادی سے وہ بسر کرتے ہیں، ہمیشہ اس کے تابع رہیں گو وہ ترکوں کے ساتھ کیسی ہی ہمدردی رکھتے ہوں اور گو ترکی اور خود قسطنطنیہ میں کچھ ہی ہوا کرے۔ سر سید یہاں تک کہہ دیتے ہیں:

''فرض کرو کہ خود انگلش گورنمنٹ بجائے روس کے ہوتی اور ترکوں کا ملک بہ ظلم چھین لینا چاہتی اور گو اس بات سے کیسا ہی رنج و غم اور غصہ و آزردگی ہندوستان کے مسلمانوں کو ہوتی، اس پر مذہب کی رو سے ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوستان میں جہاں ان کو امن اور مذہبی آزادی ہے بجز انگریزی گورنمنٹ کی اطاعت کے اور کچھ چارہ کار نہیں''۔

سرسید رعایا کی طرف سے ایجی ٹیشن یا احتجاج کئے جانے کو بھی اطاعت کے منافی سمجھتے ہیں۔ ان کی کانگرس سے مخالفت کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ کانگرس نے احتجاج کو اپنا ہتھیار بنالیا تھا اور گورنمنٹ پر دباؤ ڈالنے کے لئے پچاس ہزار رسالے عوام میں تقسیم کرائے جن میں گورنمنٹ کے خلاف بہت مواد تھا۔ (ایضاً:ص۲۳)

پروفیسر رشید احمد صدیقی

نوکری کا نشہ اور انگریزوں کی مضحکہ خیز نقالی:

مدتوں حکمران رہنے کے بعد مسلمان ہمہ گیر اور ہمہ جہتی زوال کی گرفت میں تھے۔ کچھ دنوں حکومت کے انتقام اور عتاب میں مبتلا رہ کر چھوٹی بڑی نوکریوں پر فائز ہونے لگے جس سے کھوئے اقتدار اور روایات تازہ ہوتی تھیں اور ایک حد تک ان کی تلافی ہوتی تھی۔ یہ رجحان اور راستہ جتنا مضر ثابت ہوا وہ آپ جانتے ہوں گے، شاید جھیلتے بھی ہوں۔نوکری کے نشہ میں انہوں نے ملک کی وسیع اور اہم تر سرگرمیوں کو نظر انداز کردیا اور انگریز، انگریزی اور انگریزی حکومت کی مضحکہ خیز نقالی شروع کردی۔ اکبر نے اس صورتِ حال کو پہچانا اور اس کو اپنی طنز وظرافت سے بے نقاب کرنا شروع کردیا...... اکبر نے سرسید اور علی گڑھ پر بھی بڑی آزادی لیکن خلوص سے تنقید کی ہے اور مسلسل کی ہے، لیکن اس بنا پر نہیں کہ علی گڑھ جدید تھا بلکہ وہ جدید کو زیادہ قیمت دے کر قبول کر رہا تھا۔

(عزیزان علی گڑھ ص ۱۲۹-۱۳۰)

مولوی طبقہ زیادہ صاحب نظر نکلا:

سرسید جس طرح یا جس حد تک مغربیت سے متاثر تھے اس سے نہ حالی کو اتفاق تھا نہ شبلی کو، نہ نذیر احمد کو۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ یہ تینوں مولوی تھے لیکن پچاس سال بعد معلوم ہوا کہ جہاں تک مغربیت سے احتیاط برتنے کا سوال تھا، سرسید اور سید امیر علی دونوں سے یہ طبقہ زیادہ صاحب نظر نکلا!...... اکبر سرسید سے زیادہ دیکھتے تھے اور سرسید سے زیادہ دور تک دیکھتے تھے ...... سرسید جس مغربیت کے حامی تھے، اس نے بالآخر خود اپنے سے پناہ مانگنی شروع کردی۔ زیادہ دور تک دیکھنے کا صحیح طریقہ یا مفہوم یہ ہے کہ جتنا آگے دیکھ سکتا ہو اتنا ہی پیچھے بھی دیکھ سکتا ہو اور یہ صرف اس طرح ممکن ہے کہ زیادہ بلند ہو کر اور زیادہ علیحدہ ہو کر دیکھے۔

(نگار کراچی، اکبر الہ آبادی نمبر ۱۹۶۹ء، ص ۳۰۔۳۱)

ہندو دوستی کا غیر معمولی ثبوت:

سرسید کی ہندو اور ہندوستان دوستی کا یہ ثبوت بھی معمولی نہیں ہے کہ انہوں نے سید جمال الدین افغانی کا ساتھ نہیں دیا جو عالم اسلام میں وحدت خیال اور وحدت عمل (عالمگیر اخوت اسلامی) پھیلانے کے مشن پر بلاد اسلامیہ کا دورہ کرنے نکلے تھے اور سرسید سے اس مہم میں تعاون کے خواستگار ہوئے تھے۔ سرسید نے ان سے اتفاق نہیں کیا۔ اس طرز عمل پر سید موصوف نے سرسید کو جتنا برا بھلا کہا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کے برخلاف سرسید نے ہمیشہ اس کی تبلیغ کی کہ ہندوستان کے مسلمان اپنی صلاح وفلاح کا راستہ اور منزل ہندوستان ہی میں تلاش کریں اور رکھیں، کہیں باہر نہیں۔

(مسلک ملتان، سرسید نمبر ۲۰۰۰ء، ص ۳۶)

رعایت اللہ فاروقی

شخصیت پرستی کا اثر:

پاک و ہند کے باسیوں کا یہ ایک مشترکہ مزاج ہے کہ اگر ان کے سامنے کسی شخصیت

کا یہ والا فقرہ [illegible] جائے تو یہ شخصیت پسند کرنے والے اس سے پیوستہ ہو جاتے ہیں اور اس سلسلے میں اس شخصیت کی تمام جانچ پڑتال تو درکنار بعض باتیں سامنے کی ایسی باتوں کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ جن کی بنیاد پر اس تحریک کو پرکھا جا سکتا ہے۔ شخصی تحریک کے یہ نمونے ''جالوں کے کونوں والی'' - کائنات سے لے کر پڑھے لکھے طبقے سے سر سید احمد خاں تک پہنچتے ہیں۔ جہاں جبہ اور سجادوں اور نذرانوں کے چوغے پہن کر شخصیت پرستی کا یہ فریضہ ادا کر رہا ہے تو پڑھا لکھا طبقہ اکیڈمیاں اور کونسلیں بنا کر اس میدان میں پیش قدمی کرتے ہوئے کشتوں کے پشتے لگا رہا ہے۔ سر سید احمد خاں کی شخصیت کو ماہتاب بنا کر پیش کرنے کے لئے باقاعدہ ادارے کام کر رہے ہیں اور بڑے بڑے محققین سر سید کی شخصیت کے نئے نئے گوشوں سے پرانے پرانے پردے سرکا کر اپنے ایک دعوے (کہ سر سید احمد خاں برصغیر کے مسلمانوں کے عظیم محسن ہیں) کے لئے دلیلوں کا بندوبست کر رہے ہیں۔

(سر سید احمد خاں کا مقدمہ: ص ۳)

سر سید کا اخلاص للہ تھا یا للبرطانیہ؟:

سر سید نے انگریز کی نمک حلالی کا حق ادا کر دیا کیونکہ آج ہم اپنی جدید نسل کی تباہی کا جو رونا روتے ہیں، اس کی بنیاد ۱۸۷۰ء میں سر سید نے ''کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان'' قائم کر کے رکھی تھی جو برطانیہ کی منشا اور لارڈ میکالے کی تجویز تھی۔ یہاں میں سر سید پرستوں سے یہ سوال کرنا چاہوں گا کہ آپ جو سر سید کو مسلمانان ہند کے ایک مخلص رہنما کے طور پر پیش کرتے ہیں، ان کا یہ اخلاص للہ تھا یا للبرطانیہ؟ جب تاریخ گواہی دیتی ہے کہ یہ سب کچھ انگریز کے اشارے پر تھا اور بقول لارڈ میکالے یہ اس لئے تھا کہ ہندوستانی مسلمان لباس، بول چال، رہن سہن اور طرز تمدن میں انگریز معلوم ہونے لگے تو اب ذرا انصاف سے بتایئے کہ یہ برصغیر کے مسلمانوں پر احسان تھا یا کہ بدترین ظلم اور زیادتی؟ اور یہ کہ یہ سب کچھ اللہ کی رضا کے لئے تھا یا برطانیہ کی خوشنودی کے لئے؟ .... آج اگر ٹیپو سلطان کا ساتھ چھوڑ کر انگریز کا ساتھ دینے پر میر صادق کو رسوائے زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے اور انگریز ہی کا ساتھ دینے پر میر جعفر کو مسلم قوم کا غدار کہا جا سکتا ہے تو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے موقع پر سر سید کے

کردار کو کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ (ایضاً ص ۷)

سرسید کی شخصیت اقبال کے مقابلے میں:

سرسید احمد خاں کی شخصیت کو کتنا ہی قد آور بنا کر کیوں نہ پیش کیا جائے، وہ علامہ اقبال مرحوم کے سامنے ایک بونے سے کم نہیں باوجود یکہ علامہ اقبال نے مغرب میں وقت گزارا ہے مگر انہوں نے مغربیت کو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دیا اور مغرب سے لوٹنے کے بعد ان کے دل کے تاروں پر سرسید کی طرح مغرب کے نغمے نہیں بلکہ اسلام ہی کے ترانے تھے مسلمانوں کی ذلت کا جو علاج سرسید نے دریافت کیا تھا، یعنی مغربی تہذیب کا اختیار کرنا، کیا اس علاج کے بعد مسلمان یورپین اقوام کی نگاہوں میں باعزت مقام پانے میں کامیاب ہو گئے ہیں؟ (ایضاً ص ۱۰ تا ۱۲)

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

مغرب کی ذہنی غلامی کا شکار:

سرسید احمد خاں نہایت نیک نیتی کے ساتھ مسلمانوں کی بھلائی اسی میں سمجھتے تھے کہ وہ انگریزی طور طریقے اختیار کریں، مغربیت کی راہ اپنائیں اور انگریزوں کی وفادار رعایا بن کر رہیں۔ بہ الفاظ سید سلیمان، سرسید چاہتے تھے کہ ''مسلمان مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریز بن جائیں''۔ برطانوی حکومت کا باقی رہنا اور اس کا مستحکم ہونا، سرسید کی پر خلوص رائے میں مسلمانوں کے لئے نہایت مفید اور سودمند تھا۔ اس ذہنی روش نے قدرتی طور پر سرسید کو عقل پرست بنا دیا۔ انہوں نے عقلی نقطۂ نظر سے مذہب کی تعبیر و تفسیر کا بیڑا اٹھایا۔ ان کا خیال تھا کہ مذہب کو وقت کے تقاضوں کے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ یوں سیاسی فکر اور مذہبی تفسیر، دونوں اعتبار سے وہ مغرب کی ذہنی غلامی کا شکار ہو گئے۔ سرسید کا یہ رویہ ذہنی اعتبار سے مغرب کے سامنے کامل اطاعت گزاری (Complete Surrender) کی حیثیت رکھتا ہے۔

(تفہیم و تجزیہ: ص ۱۵)

عدمِ تقلید کا داعی، مغرب کا سرتاپا مقلد:

سرسید تقلید کے زبردست مخالف اور اجتہاد کے داعی تھے مگر پیرویٔ مغرب کے باب میں انہوں نے بالکل برعکس روش اپنائی اور سرتاپا مغرب کے مقلد ثابت ہوئے ...... سرسید نے سطحی تبدیلیوں کے ذریعے وقتی علاج کرنا چاہا اور مذہب کو وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لئے اس میں کانٹ چھانٹ اور تعبیر و تاویل کے ذریعے تجدیدِ قوم کا بیڑا اٹھایا۔ (ایضاً ص ۲۱)

انگریزوں کی ''مکارانہ حکمتِ عملی'' کا شکار:

سرسید کے اخلاص اور اپنی قوم کے لئے ان کی دردمندی میں شبہ کرنا مشکل ہے مگر ان کی ذہنی افتاد نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ انگریزی حکومت کو دوام بخشنے کے لئے وہ ان کی ''مکارانہ حکمتِ عملی'' کا شکار ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں انہوں نے نہایت جانفشانی سے انگریزی حکام کی مدد کی، پرچہ نویسی کی خدمات بھی انجام دیں ...... انگریزوں کی وفاداری میں انہوں نے اس حد تک غلو برتا کہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف مزاحمت کرنے والوں کو جاہل، بدمعاش، بے علم، حرامزادے، نمک حرام اور نامحمود قرار دے ڈالا۔

(ترجمان القرآن لاہور، مئی ۱۹۹۴ء)

ڈاکٹر رفیق زکریا

پرنسپل بیک کے فکری ہتھیار:

سرسید کے کانگرس مخالف رویے کے لئے بعض ناقدین نے ایم۔اے۔او کالج کے انگریز پروفیسروں کو موردِ الزام گردانا ہے۔ انہوں نے اس رویے کے بطورِ خاص ''پرنسپل بیک کے لطیف لیکن طاقت ور اثر کا نتیجہ'' قرار دیا ہے ...... سرسید نے ان الزامات کا جواب دینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی اور نہ ہی انہوں نے اپنا موقف تبدیل کیا۔ اپنے الزامات کی تائید میں ان کے ناقدین سرسید کی ان تقاریر کا حوالہ دیا کرتے تھے جو انہوں نے بیک کی آمد سے قبل کی تھیں، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ ابتداً وہ طریقِ نمائندگی کے قائل تھے اور

ہندو مسلم اشتراکِ عمل کے حامی تھے۔

(ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج، ص ۴۳)

یہ ایک فاش غلطی ہوگی اگر ہم تھیوڈور بیک کے اس کردار کو کمتر سمجھیں جو انہوں نے مسلمانوں کے معاملات کے سلسلے میں نبھایا ہے۔ متعدد وجوہات کی بنا پر انہیں ہیوم کا پرتو قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ آخرالذکر نے جو کچھ کانگرس کے لئے کیا اتنا ہی کچھ اول الذکر نے علی گڑھ تحریک کے لئے کیا۔ اگر بیک کی پرخلوص کوششیں شامل حال نہ ہوتیں تو شاید انگریز عہدیداروں اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کے روابط اس قدر قریبی اور خوش گوار نہ ہوتے۔ انہوں نے ان روابط کو ہمیشہ زندہ رکھا جس کے باعث دونوں آپسی میل ملاپ کے ذریعے ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ انہوں نے کانگرس کی اسی لئے مخالفت کی کہ انہیں ہندو مسلم مفاہمت سے بڑھ کر انگریز مسلم دوستی عزیز تھی۔ یہ خیال ان کے دل میں گھر کر چکا تھا کہ انگریزوں کی مصالحت مسلم قوم کے ساتھ ہوگئی تو اس سے برطانوی راج کو دوامی استحکام حاصل ہوگا۔ بیک نے ہندوؤں پر کبھی بھروسہ نہیں کیا۔ کانگرس کے دستوری مطالبات کے خلاف سرسید کی لڑائی میں بیک نے انہیں جدید خیالات اور نظریات سے لیس کیا، مثلاً سرسید کی لکھنؤ اور میرٹھ کی مشہور تقاریر بڑی حد تک بیک ہی کی فکری کاوش کا نتیجہ تھیں۔ اسی طرح ۱۸۹۰ء میں پارلیمنٹ کے روبرو پیش کیا جانے والا مسلم محضر نامہ بھی انہی کے زورِ قلم کا نتیجہ تھا۔ دراصل اس دور کی مسلم سیاست کو مکمل طور پر برطانوی رنگ میں رنگنے کے ضمن میں بیک نے سب سے نمایاں خدمات انجام دیں۔ وہ فکری ہتھیار فراہم کرتے رہے جن کی مدد سے سرسید نے کانگرس کے خلاف اپنی جنگ جاری رکھی لہٰذا یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اگر بیک کئی معاملات میں پہل کر کے سرسید کی مدد نہ کرتے تو شاید ان کے کئی تعلیمی اور سیاسی منصوبے کبھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ پاتے۔ (ایضاً، ص ۴۳۳-۴۳۴)

کانگرس مخالف تقاریر کا اثر:

سرسید کی کانگرس مخالف تقاریر کی وجہ سے نہ صرف انہیں دفتر شاہی کی حمایت حاصل

ہوئی بلکہ انہی کی وجہ سے مسلمان زمیندار اور تعلقدار بھی ان کے حلقہ اثر میں آ گئے جو کسی نہ کسی طرح سے برطانیہ کے ساتھ وفاداری کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ (ایضاً ص ۲۵۶)

جمال الدین افغانی اور سرسید کے رویوں میں بُعدِ مشرقین:

سرسید پر انیسویں صدی کے سب سے بڑے اسلامی مفکر جمال الدین افغانی نے بھی تنقید کی ہے جن کا نام آج بھی دنیا بھر کے مسلم مذہبی حلقوں میں بڑی عزت اور احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ پان اسلامزم تحریک کے ابتدائی رہنما جمال الدین افغانی نے ایشیا اور یورپ کے دور دراز ملکوں کا سفر کیا تھا اور کئی یورپین زبانیں جانتے تھے اور جدید مذہبی فکر اور سیاسی حالات کی نشوونما سے کماحقہ واقفیت رکھتے تھے۔ وہ کوئی پرانے قسم کے عالم نہیں تھے بلکہ اُس دور کے ذی شعور نباض تھے جس میں وہ زندگی گزار رہے تھے۔ الافغانی انگریزوں سے نفرت کرتے تھے کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ انگریز ہی اسلام کے زوال کا سبب ہیں۔ فطری بات ہے اُن میں اور سرسید میں کوئی خلوص برقرار نہیں رہ سکتا تھا کیونکہ انہوں نے سرسید پر ''اپنے مذہب اور اپنے ملک کے ساتھ غداری'' کرنے کا الزام لگایا تھا۔ اپنے ہم مذہبوں کے مسائل کے حل کے تعلق سے دونوں کے رویوں میں بعد مشرقین پایا جاتا تھا۔

الافغانی نے سرسید کی ''فطرتیت'' یا Naturalism کا یہ کہہ کر مذاق اُڑایا کہ یہ یورپ کے مادہ پرستوں کے بنیادی نظریات کی محض ایک بھونڈی نقالی ہے۔ اُنہی کی طرح یہ (سرسید) بھی سمجھتے رہے کہ یورپ کی ترقی کا راز اس کے علوم اور فنون میں پوشیدہ ہے اسی لئے انہوں نے مسلمانان ہند کو مشورہ دینا شروع کر دیا کہ وہ اپنے تہذیبی ورثے کو دریا برد کر دیں اور انگریزی تہذیب کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیں۔ الافغانی نے لکھا کہ ''فطرت کے طریقوں کی نمائش کے لئے انہوں نے ایک جھوٹ گھڑ لیا ہے جسے وہ خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں''۔

علاوہ ازیں الافغانی کے کہنے کے مطابق سرسید نہ صرف اپنے مذہب کے غدار تھے بلکہ اپنے ملک کے بھی۔ لہٰذا اُن کا حال تو ایک یورپین مادہ پرست سے بھی بدتر تھا'' جو اگرچہ اپنے مذہب کو ترک کر دیتا ہے لیکن اپنے ملک سے محبت کرتا ہے''۔ اس کے برخلاف سرسید نے

مسلمانوں میں کام کرتے ہوئے نہ صرف اُن کے مذہبی جوش کو ختم کیا ہے بلکہ ''حب الوطنی''
بھی۔ اس مقصد کے حصول کے لئے بقول الافغانی سرسید نے مسلمانوں کو نہ صرف انگریزوں
زرخرید غلام بنا دیا بلکہ ''ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفریق کے بیج بھی بو دیئے''۔ اس طرح
انہوں نے ہندوستان پر بدیسیوں کی گرفت مضبوط کروادی ہے۔ انہوں نے سرسید اور ان کے
رفقا پر الزام لگایا کہ انہوں نے ''ہندوستان میں انگریز حکومت کے لئے ایک ایسی فوج کا کام
جو اپنے ہی ہم مذہبوں کے گلے کاٹنے کے لئے اپنی شمشیریں برہنہ کرے اور پھر مقتولین کے
مردہ جسموں سے چیخ چیخ کر کہے کہ انہیں خود اُن کی بھلائی کے لئے قتل کیا گیا ہے، ہم نے یہ
کام تم پر انتہائی ترس کھا کر از راہ ترحم تمہاری ہی بھلائی کی نیت سے کیا ہے۔'' انگریزوں کے
پاس بقول الافغانی ''اپنے مقصد کے حصول اور اسلام اور مسلمانوں کو کمزور کرنے کا'' اس سے
بہتر اور کوئی ذریعہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ (ایضاً ص ۳۳۸۔۳۳۹)

روبینہ سہگل

حقوق نسواں کے معاملے میں ایک قدامت پسند اور تنگ نظر انسان:

سرسید احمد خاں کے بارے میں عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو
قائل کیا کہ وہ مغربی علوم سے دور نہ رہیں اور مسلمان قوم کی ترقی اور بقا کے لئے سائنس،
ٹیکنالوجی اور جدید علوم اپنائیں ورنہ ہندو اُن سے آگے نکل جائیں گے اور ہر شعبے پر حاوی
ہو جائیں گے۔ مسلمان قوم کی آگہی، ترقی، شعور اور بیداری کا ذمہ دار سرسید کو ٹھہرایا جاتا ہے۔
کہا جاتا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے لئے روشن خیالی اور ترقی پسندی کا دور شروع کیا، لیکن
سرسید احمد خاں کے بارے میں عام طور پر یہ نہیں بتایا جاتا کہ اُنہوں نے ترقی، جدت، روشن خیالی
اور مغربی علوم صرف مسلمان مردوں کے لئے اہم سمجھے۔ سرسید احمد خاں عورتوں کو جدید سوچ
سے ہمکنار کروانے کے بے حد خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عورتوں کے لئے جدید تعلیم
موزوں نہیں ہے اور نہ ہی صدیوں تک ہوگی۔ انہیں سخت فکر تھی کہ اس طرح ہندوستان کی اور
یورپ کی عورت میں کوئی فرق نہیں رہے گا اور ''ہماری'' عورتیں ''ان'' کی عورتوں جیسی ہو

جائیں گی۔ سرسید احمد خاں کو یہ خوف بھی تھا کہ اگر لڑکیوں کے لئے عام [illegible]
جہاں وہ دوسرے مذاہب اور قوموں کی لڑکیوں سے ملیں گی، باتیں کریں گی اور [illegible]
اس سے بھی شناخت مٹ سکتی ہے۔ نہ صرف سرسید دوسری قوموں اور مذاہب سے خوف [illegible]
تھے، وہ طبقاتی اور ذات پات کے میل جول کے بھی خلاف تھے۔ وہ اشراف اور ام[illegible]
نمائندے تھے اور ان کی نظر میں دوسرے طبقوں اور دوسری ذاتوں کی لڑکیوں سے میل جول
خطرناک ثابت ہوسکتا تھا، کیونکہ اشراف کی طبقاتی حیثیت متاثر ہوسکتی تھی۔ سرسید کی سوچ
میں صنفی درجہ بندی کا عنصر نمایاں تھا۔ وہ مردوں کو عورتوں سے اول، زیادہ اہم اور برتر قرار
دیتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اگر مرد پہلے عقل مند ہوگئے اور تعلیم یافتہ ہوگئے تو وہ قوم کی
عورتوں کو ایسی تعلیم دے سکیں گے جو مردوں کی مرضی کے مطابق ہوگی اور اُن کے مفادات کا
تحفظ کرے گی...... وہ عورتوں کو اُن کے پرانے طریقے، قدیم روایتی کردار سے نہیں نکالنا
چاہتے تھے۔ سرسید جدید تعلیم کو دُہرا ہتھیار تصور کرتے تھے۔ اس تعلیم کے ذریعے مردوں کے
لئے ممکن نہ تھا کہ جدید دور میں داخل ہوں اور ترقی کی طرف جائیں اور اسی تعلیمی نظام کے
ذریعے یہ ممکن تھا کہ عورتوں کو قدامت پرستی، روایت اور رسم و رواج کے دائرے میں قید رکھا
جائے۔ جدید طرزِ تعلیم سے دونوں مقاصد پورے ہوتے نظر آتے تھے۔ اس کے ذریعے
مسلمان مردوں کی قوم ترقی پذیر اور جدید ہوسکتی تھی تاکہ انگریزوں اور ہندوؤں کا مقابلہ کرسکے
اور اسی تعلیم کے ذریعے مسلمان عورتوں کی قوم کو روایت اور قدامت کی زنجیروں میں قید رکھا
جاسکتا تھا...... چنانچہ سرسید احمد خاں کو صرف ترقی، روشن خیالی اور جدت پسندی کا علم بردار نہیں
ٹھہرایا جاسکتا، وہ بے حد قدامت پرست اور روایتی سوچ کے مالک بھی تھے۔ ہمارے لئے
ضروری ہے کہ ہم ان کی شخصیت کے دوسرے پہلوؤں پر روشنی ڈالیں اور یہ عام تاثر ختم کریں
کہ سرسید احمد خاں جدید دور اور ترقی کے آغاز کے ذمہ دار تھے۔ عورتوں کی تعلیم کے موضوع پر
ان کے اور قدامت پسند اور بنیاد پرست مفکرین میں کوئی فرق نہیں تھا...... سرسید احمد خاں
عورتوں کے حقوق کے نقطۂ نظر سے ایک قدامت پرست اور تنگ نظر انسان تھے۔

(آواز لاہور، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۸ء، ص ۲۶۶ تا ۲۷۱)

ریاض الرحمٰن شروانی

ہندوستانی اور پاکستانی اصحاب فکرونظر کے رویوں میں اختلاف کا حل:

سید احمد خاں کی سیاست سب سے زیادہ مختلف فیہ مسئلہ ہے اور اس مسئلہ کے دو رُخ ہیں ۔انگریزوں اور بیرونی حکومت کی طرف ان کا رجحان طبع اور اہل وطن بالخصوص ہندوؤں کے ساتھ ان کا رویہ۔ اس مسئلے پر بالعموم ہندوستان اور پاکستان کے اہل قلم کے درمیان شدید اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں (ہندوستان میں ناقل) اس امر پر زور دیا جاتا ہے کہ ان کی انگریز دوستی ان کے تعلیمی مشن کی بارآوری کے لئے ناگزیر تھی اور وہ ہندوؤں کے ساتھ مکمل اتحاد اور یک جہتی کے قائل تھے، البتہ اس میں ہندو اردو مسئلے کے بعد رخنہ پڑ گیا تھا۔ اس کے برخلاف پاکستان کے اہل قلم اس پر اصرار کرتے ہیں کہ ہندوستان کی ہندو اکثریت کے مقابلے میں ان کے لئے انگریزوں سے رشتہ موانست استوار کرنا لازمی تھا اور وہ دو قومی نظریے اور علیحدگی پسندی کے اصلی بانی تھے۔ ہر نظریے کی مانند اس نظریے میں مستثنیات ہیں یعنی ہندوستان میں بھی ایسے مصنف مل جاتے ہیں جو پاکستانی مصنفین کے ہم خیال اور ہم نوا ہیں ،اور پاکستان میں بھی بعض ایسے اصحاب فکر پائے جاتے ہیں جن کا اس بارے میں رویہ اگر اپنے ہندوستانی معاصرین سے مکمل طور پر نہیں تو جزوی طور پر ضرور ہم آہنگ ہے......لطف کی بات یہ ہے کہ یہ سب صاحبان فکرونظر اپنی اپنی آرا کا ثبوت خود سید احمد خاں کی تحریروں سے مہیا کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن، جیسا کہ بالعموم ہوتا ہے، اپنی مفید طلب تحریروں ہی کے اقتباسات پر انحصار کرنا مناسب خیال کرتے ہیں..... ہماری ناچیز رائے میں ان تضادات کی موجودگی میں حق وانصاف پر اسی وقت پہنچا جاسکتا ہے جب سب مطلوبہ مواد سامنے رکھ کر اور عقیدت اور مخالفت دونوں سے حتی الامکان اوپر اُٹھ کر خالص معروضی انداز میں تحقیق وتجسس کے تقاضوں کو پورا کیا جائے۔ شاید یہ کام علی گڑھ میں بیٹھ کر ممکن نہیں ہے کیونکہ علی گڑھ تو اس مرد دانا وبینا کے افکار واعمال کی تجربہ گاہ ہے اور شاید یہ کام بعض سیاسی وجوہ سے پاکستان میں بھی انجام نہیں پاسکتا ہے۔ اس کے لئے ہندوستان کی کوئی دوسری یونیورسٹی تعصبات اور

ترجیحات دونوں سے دامن بچا کر یہ ذمہ داری اپنے سر لے تو خاطر خواہ نتائج برآمد ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

(مقالات قومی سرسید سیمینار، ص ۹۔۱۰)

مذہبی مسائل میں پکے اور سچے مسلمان کی ایک ٹھوکر:

سرسید کے ساتھ ایک دشواری ضرور ہے۔ اگر آپ ''اسباب بغاوت ہند'' کو سامنے رکھ کر ان کی تصویر کھینچیں تو اس کے نقوش اس سے بالکل مختلف اُبھرتے ہیں جو'' تاریخ سرکشی بجنور'' کو سامنے رکھ کر تصویر کھینچنے پر اُبھرتے ہیں۔ سرسید کمپنی سرکار کے ملازم تھے اور جب بغاوت کے جوش میں انگریزوں پر ظلم وزیادتی ہوئی تو ان کی فرض شناسی اور انسان دوستی دونوں کا تقاضا تھا کہ وہ جان کی بازی لگا کر ان کی حفاظت کرتے لیکن غیظ وغضب کے جوش میں انہوں نے باغیوں، جو بعد میں اہلِ ملک کی اکثریت کی نظر میں مجاہدِ آزادی ٹھہرے، کے لئے جو زبان استعمال کی ہے وہ یقیناً ثقاہت کے معیار پر پوری نہیں اُترتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ انتقامی کارروائی کے طور پر اس کا نام لے کر جو مظالم کمپنی ''بہادر'' کے اہل کاروں نے عام ہندوستانیوں، بالخصوص مسلمانوں پر روا رکھے، سرسید نے ان کی مذمت اتنی شدت سے نہیں کی ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ سرسید نے اس دورِ ابتلا کے فوراً بعد ''اسباب بغاوت ہند'' لکھ کر حاکمانِ وقت کو ان کی کوتاہیوں کی طرف جس طرح توجہ دلائی، وہ بڑی جرأت وہمت کا کام تھا۔

جہاں تک ان کے مذہبی عقائد کا تعلق ہے، وہ بلاشبہ ایک پکے اور سچے مسلمان تھے؛ موحدِ کامل، عاشقِ رسول ﷺ، فرائض کی ادائیگی کے پابند اور مسلمانوں کے حقیقی خیر خواہ۔ ان کا اصرار مذہب کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے اور اس کی روشنی میں دیکھنے سمجھنے پر تھا۔ بالخصوص وہ قرآن فہمی میں تعقل، تفکر اور تدبر پر بہت زور دیتے تھے۔ خود قرآنِ مجید میں بھی بار بار یہی ارشاد ہوا ہے۔ اس لحاظ سے سرسید کوئی ایسی بات نہیں کہہ رہے تھے جو قرآنِ مجید کی روح سے متعارض ہوتی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ عقلیت کو جتنی دُور تک لے گئے، مذہب میں عقلیت اتنی دُور تک نہیں جاتی ہے۔ عقلیت کی حدود ہیں اور جب وہ ان سے تجاوز کرتی ہے تو دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اگر ہم ہر مسئلے کی کسوٹی عقل کو بنائیں تو سوال پیدا ہوتا ہے، کس کی عقل؟ عرب کی اُن

بادیہ نشینوں کی عقل جن پر سب سے پہلے قرآن نازل ہوا یا سرسید کے دور کے ہندوستانیوں کی عقل یا آج کے زمانے کے امریکہ اور کینیڈا میں رہنے والے انسانوں کی عقل اور ایک دور اور ایک ملک میں بھی حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کی عقل یا ابوطالب اور ابولہب کی عقل، سرسید کی عقل یا مولانا محمد قاسم کی عقل، مولانا ابوالکلام آزاد کی عقل یا مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی عقل، سلمان رُشدی کی عقل یا رفیق زکریا کی عقل؟ قرآنِ مجید کی بات تو الگ ہے، محدثینِ کرام نے اسی لئے حدیث کے معاملے میں بھی روایت کو درایت پر ترجیح دی ہے۔ بس ہمارے نزدیک سرسید نے مذہبی مسائل میں یہیں ٹھوکر کھائی ہے کہ وہ عقل کی کارفرمائی پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے ہیں۔

(کانفرنس گزٹ علی گڑھ، اکتوبر ۲۰۰۵ء، ص ۱۴تا۱۶)

ریاض صدیقی

سرسید کے دوقومی نظریہ کی سیاسی تفسیر:

سرسید کے دوقومی نظریہ کی تفسیر وتشریح جس طرح سیاسی وجوہ کی بنا پر ۱۹۳۸ء کے بعد کی گئی ہے، اس کا سرسید کے اصل مفہوم سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ اس موقف کی بنیاد پر بٹوارے کا کوئی تصور ۱۹۳۸ء تک پیدا نہیں ہوا تھا۔

(تخلیق لاہور، دسمبر ۲۰۰۰ء، ص ۸)

انگریزوں کی خودساختہ منطق پر یقین:

سرسید نے مسلمانوں کو سختی کے ساتھ منع کیا کہ وہ کانگرس کے قریب سے بھی نہ گزریں اور کسی قیمت پر اپنے محسن انگریزوں کی وفاداری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں بلکہ ان کی برتر اخلاقی، تہذیبی اور علمی خوبیوں ہی کی پیروی کریں اور ان سے سیکھیں۔ رسالہ درباب طعام میں انہوں نے مسلمانوں کے کھانا کھانے کے طریقے پر بھی تنقید کی اور میز کرسی پر بیٹھ کر چھری کانٹے سے کھانا کھانے کو ایک مہذب طریقہ قرار دیا، گویا انہوں نے ہندوستان پر قبضہ کرنے والے انگریزوں کی خودساختہ منطق کو، کہ وہ ہندوستان کے سیاہ رنگ، جاہل، خونخوار

اور بدتہذیب لوگوں کو تہذیب سکھانے کے لئے خدا کے حکم پر آئے ہیں۔ ... تھے۔

(ایضاً ص ۱۱)

سرسید تحریک کے تجزیاتی مطالعہ کی بجائے اس سے عقیدت مندانہ رشتہ:

نوآبادیاتی حکمرانوں کی حکمتِ عملی کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد ... خلاف فعال ہونے والے ہندوؤں کی مزاحمت کو مسلمانوں اور اردو دشمنی کی طرف موڑ دیا اور اس دشمنی کی سرپرستی بھی کی۔ دوسری طرف مسلمانوں کی مزاحمتی قوت کو پہلے تو طاقت کے ذریعہ کچل دیا اور بعد میں جو کمزور مزاحمت باقی رہ گئی تھی، اس کو سرسید تحریک نے راستے سے ہٹا دیا۔ بہت بعد میں علمائے دیوبند نے اپنی مزاحمتی قوت کو یکجا کیا۔ اس دور میں بصارت اور بصیرت کا معیار بھی اس سطح پر نہیں پہنچا تھا کہ سرسید یا ان کے رفقا یہ اندازہ کر پاتے کہ بلاواسطہ انداز میں نوآبادیاتی حکمران ان کو کس طرح استعمال کر رہے تھے۔ ... زمانے کی فکری اور اجتماعی تحریکات کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ رعایت دینا ہی پڑے گی۔ اصل میں سابقہ دور کی غلطیوں کو بعد کے دور میں آنے والے ہی بالغ الرائے درست کرتے ہیں مگر بدقسمتی یہ تھی کہ بیسویں صدی میں جو پڑھی لکھی جدید مسلمان نسل آئی، اس نے سرسید تحریک کا تجزیاتی وتنقیدی مطالعہ کرنے کے بجائے اس سے عقیدت مندانہ رشتہ قائم کر لیا اور یہ رشتہ ابھی تک قائم ہے۔ (ایضاً ص ۱۳)

علی گڑھ میں انگریزوں کی وفاداری اور برتری کا سبق:

علی گڑھ کا تعلیمی ادارہ مغربی طرز پر بنایا گیا تھا جہاں باہر سے آنے والے طالب علموں کے لئے ہوسٹل کی سہولت موجود تھی۔ اس میں کوئی قابلِ اعتراض پہلو نہیں ہے۔ البتہ تعلیمی ادارے کی وساطت سے مسلمان طالب علموں کو انگریزوں کی وفاداری اور ان کی برتری کا جو سبق دیا جاتا تھا، اس نے نئی آنے والی نسل کے مزاج میں تبدیلی پیدا کر دی تھی۔...... علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کا جو ڈھانچہ سرسید نے بنا دیا تھا، ان کے بعد آنے والوں نے اسے جاری رکھا بلکہ اس میں ایک کمزور پہلو یہ بھی در آیا کہ ہندوستان کے بیشتر شرفا و اُمرا اور جاگیرداروں کی اولادیں تعلیم حاصل کرنے کے لئے علی گڑھ ہی آتی تھیں۔ اس طبقے کو بھی نوآبادیاتی حکمرانوں

ی نے پیدا کیا تھا جو ہر حال میں ان کا وفادار رہا۔ برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی قیادت پر ہم
اسی طبقے کا عمل دخل رہا اور اب تک ہے۔ (ایضاً ص ۱۴)

دو قومی نظریے کے پرچارک ہونے کا تاریخی طور پر غلط حوالہ:

تحریکِ پاکستان کے حوالے سے مسلم لیگ کے سیاسی لیڈروں اور ان کے ہم نوا مؤرخوں نے سید احمد خاں کا سیاسی استعمال کرتے ہوئے ان کو دو قومی نظریے کا پرچارک بتایا ہے جو کہ تاریخی حوالے سے غلط ہے۔ اصل میں انہوں نے ہندوستان میں آباد ہندوستانی مسلمانوں کی آبادی کے تناسب سے زندگی کے تمام شعبوں میں نمائندگی کے حق کی مانگ کی تھی اور اس مانگ کو جواز فراہم کرنے کے لئے مسلمانوں کو ایک الگ قوم کہا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کی تاریخ کے معروضی حالات کو اگر دیکھیں تو یہ مانگ اور قوم کے علیحدہ تصور کا موقف غلط نہیں تھا لیکن ان کے ذہن میں آخر وقت تک برصغیر کے بٹوارے کا کوئی خیال پیدا نہیں ہوا تھا۔ .... ۱۸۵۷ء کے بعد جب وہ خواب سے جاگے تو اپنی تحریک کی بنیاد انگریزوں کی مداحی اور وفاداری پر قائم کی، مسلمانوں کو ترغیب دی کہ وہ انگریزوں کی پیروی کریں اور ان سے تہذیب سیکھیں اور کسی صورت بھی ان کی مخالفت نہ کریں۔ جن لوگوں نے ہنگاموں کے دوران انگریزوں کے خلاف بہادر شاہ ظفر کا ساتھ دیا تھا ان کو شر پسند، غدار اور مجرم قرار دیا۔ وہ خود ہنگاموں کے دوران اپنے ساتھیوں کے ساتھ صبح سے رات تک اپنے صاحب کی کوٹھی پر پہرا دیتے تھے تاکہ یہ ''شرپسند'' ، صاحب اور ان کے اہلِ خانہ کو نقصان نہ پہنچائیں۔ ...... انہوں نے ایسے تمام ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک مکمل فہرست بنائی جنہوں نے ہنگاموں کے دوران انگریزوں، ان کی عورتوں اور بچوں کو قتل کیا تھا اور بہادر شاہ سے رابطہ رکھتے تھے۔ یہ فہرست انہوں نے انگریز حکام کو پہنچائی تھی۔ ان خدمات کے عوض ان کو اعزاز بھی ملا اور ''سر'' کا خطاب بھی دیا گیا۔ اس زمانے میں دیوبند کے اور جن دوسرے علما نے انگریزوں کے خلاف مزاحمت یا جہاد کی تحریک چلائی تھی، سید احمد خاں نے ان کی بھی مذمت کی اور ان کو قدامت پسند اور جدید تعلیم کا دشمن قرار دیا۔ یہ تھی ان کی تحریک۔

(منشور کراچی، ستمبر ۲۰۰۵ء، ص ۲۳)

لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی سے معاملہ:

جہاں تک جدید علوم کی تعلیم کا مسئلہ تھا تو سید احمد خاں نے لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی ہی سے معاملہ کیا تھا جس نے صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ ہندوستان کی غریب اکثریت کو جدید علوم کی تعلیم دینے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہ اکثریت انگریز راج کے لئے مشکلات پیدا کرے گی؛ جدید علوم کی تعلیم صرف ہندوستانی شرفا واُمرا ہی کے بچوں کو دی جائے تاکہ ایک ایسا محدود پڑھا لکھا طبقہ پیدا ہو جو انگریزوں کا وفادار، مداح اور تابعدار ہو اور انتظامی شعبوں میں انگریز حکامِ بالا کے ماتحت خدمات انجام دے؛ ہمیں وہ ہندوستانی پڑھا لکھا طبقہ چاہیے جس کے جسم ہندوستانی ہوں مگر ان کا شعور برطانیہ کا ہو۔ علی گڑھ میں بھی مسلمان جاگیرداروں، اُمرا اور شرفا ہی کے بچے تعلیم حاصل کرنے جاتے تھے۔ سر سید احمد خاں کا بہت واضح موقف تھا کہ تعلیم حاصل کرنے والے مسلمان انگریز راج کے انتظامی شعبوں میں خدمات انجام دیں۔...... حالی، نذیر احمد اور شبلی تینوں ہی مسلمان مرد عورتوں کو جدید علوم کی تعلیم حاصل کرنے کے حق میں تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سید احمد خاں کو اپنے ہی قریبی ساتھیوں کے اختلاف سے بھی سابقہ پڑا تھا۔ اس کے باوجود علی گڑھ پر سید احمد خاں اور ان کے انگریز معاون مسٹر بیک کی چھاپ بہت گہری تھی۔ ہنر اور کاروبار کی تعلیم وتربیت کی ناموجودگی ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بہرحال ایک سانحہ تھا۔ چنانچہ ان کی بہت بڑی اکثریت جاہل ہی رہی۔ ..... مسلمانوں کے برعکس ہندوؤں نے سرکاری ملازمتوں میں بھی شمولیت اختیار کی لیکن بیشتر نے ہنر، کاروبار، مالیات اور صنعت کاری کے آزاد شعبوں کو ترجیح دی تھی۔...... بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی کے بعد جب ہندوستان کی معروضی صورت حال بدل چکی تھی تو علی گڑھ کے کرتا دھرتا دانشوروں پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ وہ سید احمد خاں کے لائحہ پر نظر ثانی کرتے لیکن وہ اسی لائحہ عمل کو اٹل سمجھ کر اسی پر سختی سے قائم رہے۔ اس کے باوجود کہ خود علی گڑھ میں تعلیم پانے والے بعض مسلمان طالب علم برطانوی راج کے خلاف مزاحمتی سیاست سے وابستہ ہو گئے تھے، ان کے داخلے منسوخ کر کے ان کو علی گڑھ سے نکال باہر کیا تھا۔

(نیاز مانہ لاہور نومبر ۲۰۰۵ء ص ۳۷)

انگریزوں سے وفاداری نبھانے کے معاملے میں علی گڑھ اس قدر حساس تھا کہ جب وہاں کے قوم پرست طالب علموں نے انگریزوں کے خلاف مزاحمت میں حصہ لیا تو ان کے داخلے منسوخ کر دیئے گئے اور ان کو یونیورسٹی کی حدود سے نکال باہر کیا گیا تھا۔ ان میں محمد علی جوہر اور ذاکر حسین بھی شامل تھے۔

(منشور کراچی، ستمبر ۲۰۰۵ء، ص ۱۵)

ریاض محمد

مسلم سوسائٹی کے لئے ناسور:

اگر گہری نظر سے مسلم معاشرہ کا مطالعہ کیا جائے تو بہت سے ایسے اشخاص نظر آجائیں گے جن کو دین سے ناواقف اور سادہ لوگ بالعموم اور مغربیت سے متاثر افراد بالخصوص اپنے دین و دنیا کے مصلح اور مخلص سمجھتے ہیں اور انہی کی اقتدا اور ہم مسلکی کو باعث فخر اور نجات سمجھتے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ اشخاص ان کے لئے مصلحین اور مخلصین نہیں ہوتے بلکہ مار آستین اور زہریلی شوگر کوٹڈ گولیاں ہوتے ہیں۔ ان برائے نام مصلحین میں ایک مشہور زمانہ شخصیت سرسید احمد خاں کی ہے جو ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے تو مسلمانوں کا بڑا خیر خواہ اور خیر اندیش معلوم ہوتا ہے لیکن اگر اس کو اس کی تصنیفات کے آئینہ میں دیکھا جائے تو وہ مسلمانوں کے لئے زہر قاتل سے بھی بدتر ہے۔ اس کے عقائد اور خیالات اسلامی تعلیمات اور قرآن وحدیث کے بالکل متضاد ہیں۔ سرسید احمد خاں کے دینی خرافات اور لغویات...... کو پڑھ کر سرسید کی دینی اور علمی شخصیت کی حقیقت کھلتی ہے:

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

اس کے بعد پتہ چلتا ہے کہ سرسید احمد خاں قوم کے لئے اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے ایک خیر خواہ نہیں تھے بلکہ مسلم سوسائٹی کے لئے ناسور اور خطرناک زہر تھے۔

(''العصر'' پشاور، اگست ستمبر ۱۹۹۹ء، ص ۹)

ڈاکٹر ریحان ثروت

ہندو مسلم سیاسی تعاون کا حامی:

سرسید احمد خاں ایک عظیم محب وطن اور ہندو مسلم سیاسی تعاون کے حامی تھے۔ وہ تمام عمر ان دونوں فرقوں کے مابین اتحاد و اتفاق کے لئے کوشاں رہے اور انہوں نے بحیثیت مجموعی ہندوستانی عوام کی بہتری کے لئے بہت ساری کوششیں کیں۔ وہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب عظیم کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے محافظ تھے۔ ان کی علی گڑھ تحریک نے مسلم معاشرے میں ایک ہلچل مچادی۔ یہ تحریک نہ صرف مسلم فرقے بلکہ پورے ہندوستانی سماج کے لئے ایک عہد نو کا پیام بر ثابت ہوئی۔ بلاشبہ سرسید جدید ہندوستان کے ایک ممتاز معمار تھے۔

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۹۸ء: ص ۸۵)

زاہد الراشدی

سرسید کے فلسفہ کی انہی کے شاگردوں کے ہاتھوں موت:

یہ بات کہ علما نے سرسید احمد خاں کی مخالفت کی تھی اور قوم میں علما کی بجائے سرسید احمد خاں کی فکر کو کامیابی حاصل ہوئی..... ایک تاریخی مغالطہ کے سوا کچھ نہیں ہے، اس لئے کہ سرسید احمد خاں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی مخالفت کرتے ہوئے اور اس کے بعد نئی فکری تحریک کی بنیاد رکھتے ہوئے جو فلسفہ پیش کیا تھا وہ دو امور پر مشتمل تھا۔ ایک یہ کہ قرآن وسنت کے احکام اور تعلیمات پر مغربی دانشوروں کے اعتراضات کو قبول کرتے ہوئے اسلامی احکام کی ایسی نئی تشریح کی جائے جو جدید مغربی فلسفہ کے قریب ہو اور مغربی دانشوروں کے لئے قابل قبول ہو۔ اسی مقصد کے تحت سرسید احمد خاں نے قرآن کریم کی جو نئی تفسیر لکھی اس میں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات کا انکار کیا اور اسلامی احکام وقوانین میں عجیب و غریب تاویلیں کیں جبکہ سرسید احمد خاں کے فلسفہ کی دوسری بنیاد اس پر تھی کہ انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت درست نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ کامل وفاداری کے ساتھ رہنا ہی مسلمانوں کے لئے صحیح راستہ ہے..... سرسید احمد خاں کی یہ دونوں باتیں خود علی گڑھ کی دوسری

نسل نے مسترد کر دی تھیں اور مولانا شبلی نعمانی، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خاں کی
قیادت میں علی گڑھ سے تعلیم پانے والوں نے نہ صرف یہ کہ اسلامی عقائد و احکام کی تشریح...
کر دیا تھا جو سرسید احمد خاں نے کی بلکہ انگریزی حکومت کے ساتھ وفاداریوں کے تصور کو مسترد
کر کے تحریک آزادی کی قیادت میں مولانا محمد علی جوہر اور ان کے رفقا پیش پیش ہو گئے تھے۔
سب حضرات علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے مگر قومی جدوجہد میں ان میں سے بیشتر حضرات سرسید
احمد خاں کے فکر و فلسفہ کا پرچم تھامنے کی بجائے دیو بند کے صدر شیخ الہند مولانا محمود حسن کی
قیادت میں برطانوی استعمار کے خلاف صف آرا ہو گئے تھے، اس لئے علمی اور سیاسی دونوں
محاذوں پر سرسید احمد خاں کا فلسفہ ایک نسل سے آگے نہیں چل سکا تھا اور خود سرسید کے اپنے
شاگردوں کے ہاتھوں دم توڑ گیا تھا۔

(دینی مدارس کی مثالی خدمات: ص ۱۰)

اسلامی عقائد کی نئی تشریح کی ناکامی:

سرسید احمد خاں مرحوم نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران اور اس کے بعد مسلمانوں کی راہ نمائی کے لئے جو پروگرام تجویز کیا، اس کے اہم نکات یہ ہیں کہ انگریزی اقتدار کی مخالفت نہ کی جائے بلکہ نئے حکمرانوں کا ساتھ دیا جائے، آزادی کے لئے لڑنے والے گروہوں اور مجاہدین کی مخالفت کی جائے اور انہیں فسادی اور غنڈے قرار دے کر انگریزوں کی ہم نوائی کی جائے، اسلامی احکام و عقائد کے بارے میں مغربی دانشوروں کے اعتراضات کو مسترد کرنے کی بجائے ان کے سامنے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیا جائے اور اسلامی احکام و عقائد کی ایسی تشریح و تعبیر کی جائے جو مغرب کے لئے قابل قبول ہو...... جہاں تک اسلامی عقائد و احکام کی نئی تشریح و تعبیر کا تعلق ہے، سرسید مرحوم اس میں اس حد تک آگے نکل گئے کہ کوئی مسلمان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا...... اس تفصیل سے تو نبوت اور قرآن حکیم کی پوری عمارت دھڑام سے زمین پر آپڑتی ہے...... اسلامی عقائد و احکام کی نئی تعبیر و تشریح اور انگریزوں کی وفاداری کی تلقین کے بارے میں سرسید احمد خاں کا فکری پروگرام ان سے ایک نسل بھی آگے نہیں بڑھ سکا۔ (ایضاً: ص ۱۳ تا ۱۵)

زاہد چوہدری

سرسید کے مبینہ ''دوقومی نظریے'' کی غیر مذہبی بنیاد:

بیشتر مسلمان مؤرخین مثلاً چوہدری محمد علی، چوہدری خلیق الزماں، خالد بن سعید، ایس ایم اکرام اور شریف الدین پیرزادہ وغیرہ ۱۸۶۷ء میں اردو ہندی تنازعے کے بارے میں سرسید احمد خاں کے ریمارکس، اس کی ۱۸۸۳ء میں وائسرائے کی کونسل میں تقریر اور ۸۸۔۱۸۸۷ء میں اس کی لکھنؤ اور میرٹھ کی تقریروں میں چند منتخب فقروں کے حوالے دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سرسید احمد خاں تحریک پاکستان کا قائد اول تھا کیونکہ اس نے ۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر کے مسلمانوں کو ایک الگ قوم ہونے کا تصور دیا تھا اور یہ پیغمبرانہ پیش گوئی کی تھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کا سیاسی ملاپ ممکن نہیں ہوگا ...اس قسم کے سارے کے سارے مؤرخین جو یہ کہتے ہیں کہ سرسید نے دوقومی نظریے کا تصور پیش کر کے تحریک پاکستان کی بنیاد رکھی تھی، سرسید کی ۱۸۸۴ء کی ان تقریروں کے حوالے نہیں دیتے جن میں اس نے مذہب کو دنیاوی امور سے بےتعلق قرار دیا تھا اور بار بار یہ اعلان کیا تھا کہ ہندو اور مسلمان باعتبار وطن ایک قوم ہیں۔ یہ مسلم مؤرخین سرسید کی لکھنؤ اور میرٹھ والی تقریروں میں سے ان حصوں کا حوالہ بھی نہیں دیتے ہیں جن میں اس نے ہندوستان کے عوام کو مذہب کی بنیاد پر دو قوموں میں تقسیم نہیں کیا تھا بلکہ اس برصغیر کو اس نے ایک کثیر الاقوامی بلکہ کثیر الممالک خطہ قرار دیا تھا۔ وہ اس حقیقت کا بھی ذکر نہیں کرتے کہ مارچ ۱۸۸۸ء میں میرٹھ کی تقریر کے چند ماہ بعد اگست ۱۸۸۸ء میں سرسید نے ایک غیر فرقہ وارانہ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن بھی قائم کی تھی، جس کا نصب العین صرف مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ نہیں تھا.....محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا پرنسپل اس ایسوسی ایشن کی جانب سے پمفلٹ، خطوط اور مضامین لکھنے میں سرسید کی امداد کرتا تھا۔ اس ایسوسی ایشن کے قیام سے ظاہر تھا کہ سرسید نہ صرف پسماندہ مسلمانوں کے حقوق کو کانگرس کی دست اندازی سے بچانا چاہتا تھا بلکہ اس کی یہ بھی کوشش تھی کہ بورژوا کانگرس بلا لحاظ مذہب و ملت سارے نوابوں، مہاراجوں، تعلقہ داروں، جاگیرداروں اور زمینداروں کے

مفادات کو کوئی نقصان نہ پہنچانے پائے اور نہ ہی اس تنظیم سے انگریزوں کے اقتدار کو کوئی ز
پہنچے۔ اس کا دوقومی نظریہ محض یہ تھا کہ کلکتہ، بمبئی اور مدراس کے ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ ہندو
بالخصوص بنگالی ہندوؤں کا برصغیر کے مسلمانوں پر بالعموم اور صوبہ جات آگرہ و اودھ
مسلمانوں پر بالخصوص خالص پارلیمانی جمہوریت اور سیکولر نیشنلزم کی آڑ میں مستقلاً سیاسی،
اور معاشرتی غلبہ قائم نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے اس نظریے کی بنیاد سراسر مادی تھی، مذہبی
تھی۔ وہ اس نظریے کے زور پر پورے ہندوستان میں یا ہندوستان کے کسی علاقے میں اسلا
نظام یا نظامِ مصطفیٰ نافذ کرنے کا عزم نہیں رکھتا تھا بلکہ چاہتا تھا کہ مسلمان من حیث القوم انگر
ارباب اقتدار کی زیرسرپرستی تعلیمی، معاشی اور معاشرتی ترقی کریں۔ اسے خدشہ تھا کہ متعصب
اور تنگ نظر سرمایہ دار ہندوؤں کی بالادستی میں نہ صرف مسلمانوں کی بحیثیت قوم حالت خراب
سے خراب تر ہو جائے گی بلکہ بلا لحاظ مذہب وملت پورا جاگیردار طبقہ بھی مغلوب ہو جائے گا۔
گویا اس کے دوقومی نظریے کی بنیاد قومیتی اور طبقاتی دونوں ہی قسم کے تضادات پر تھی۔ ا
نظریے کی بنیاد اس نعرے پر نہیں تھی کہ ''اسلام خطرے میں ہے''۔

(روشن خیال ..... سرسید احمد خاں: ص ۱۵۴ تا ۱۵۷)

سیکولر انڈین نیشنلزم کا علم بردار:

بیشتر مسلم مؤرخین یہ موقف پیش کرتے ہیں کہ سرسید احمد خاں نے ..... ہندوستان
میں پہلی مرتبہ دوقومی نظریہ پیش کرکے تحریک پاکستان کی بنیاد ڈالی تھی۔ ان کا یہ موقف حقائق
کے منافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ اس زمانے میں سرسید مسلمانوں کا بے انتہا خیرخواہ
لیکن اس کے ذہن میں قوم یا قومیت کے بارے میں کوئی واضح تصور یا نظریہ نہیں تھا۔ وہ کبھی
ہندوستان کو ایک کثیر الاقوامی ملک کہتا تھا اور بنگالی لیڈروں کو بھی ایک الگ قوم قرار دیتا تھا۔
کبھی تو ہندوؤں اور مسلمانوں کو مذہب کی بنیاد پر دو الگ قومیں قرار دیتا تھا اور کبھی یہ کہتا تھا کہ
ہندو اور مسلمان ایک ہی ملک کے رہنے والے ہیں لہٰذا وہ ایک ہی قوم ہیں۔ اس کا اگر کوئی
قومی نظریہ تھا تو وہ یہ تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد اقتدار میں ہندوؤں اور
مسلمانوں کے درمیان جو معاندانہ تضاد پیدا ہو گیا تھا، چونکہ انگریزوں کے عہد میں اس میں

مزید شدت پیدا ہوئی ہے اس لئے اسے پارلیمانی جمہوریت کے ذریعے حل نہیں کیا جا سکتا۔
(ایضاً ص۸۲)

مذہب کی بنیاد پر دو قومی نظریہ اس کے وہم و گمان میں نہیں تھا۔ وہ سیکولر انڈین نیشنلزم کا علمبردار تھا۔ وہ مذہب کو سیاست سے وابستہ نہیں کرتا تھا بلکہ یہ کہتا تھا کہ مذہب ایک نجی معاملہ ہے جس کو دنیاوی امور سے الگ رکھنا چاہیے، تاہم اسے اس امر کا شدید احساس تھا کہ مسلمان اپنے تعصبات کی وجہ سے ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ جب تک یہ فرقہ زندگی کے ہر شعبہ میں ہندوؤں کے برابر درجہ حاصل نہیں کرلے گا اس وقت تک ہندوستان دو روشن اور رسیلی آنکھوں والی خوبصورت دلہن نہیں بن سکے گا۔ وہ اس سلسلے میں ترقی یافتہ ہندوؤں سے امداد کی بھیک مانگتا تھا اور کہتا تھا کہ تندرست و توانا بڑے بھائی کا فرض ہے کہ وہ بیمار و ناتواں چھوٹے بھائی کی صحت کی تدبیر کرے۔ سید احمد خاں کا یہ موقف اس کی اعلیٰ سیاسی بصیرت کا مظہر تھا۔ (ایضاً ص۹۱-۹۲)

اسلام کو مکمل ضابطۂ حیات تسلیم کرنے سے انکار:

سرسید اپنے مذہبی عقائد کے اظہار میں الفاظ کا کوئی ہیر پھیر نہیں کرتا تھا۔ وہ برملا اور بار بار اعلان کرتا تھا کہ وہ معجزات، جسمانی معراج النبی، شق الصدر، فرشتوں، جنوں، شیطان، مذاہب اربعہ، جنت، دوزخ اور قیامت کے بارے میں روایتی عقائد کو نہیں مانتا اور یہ رائے رکھتا ہے کہ ان سب عقائد کی بنیاد یہودیوں کے بے بنیاد قصوں کہانیوں پر ہے۔ چونکہ صدیوں سے ملاؤں کی مذہبی دکانیں ان روایتی عقائد کے زور پر چلتی رہی تھیں اس لئے جب انہوں نے دیکھا کہ سرسید قومی فلاح و بہبود کا پرچم اٹھا کر دیرینہ کاروبار کو تباہ و برباد کرنے کا عزم رکھتا ہے تو انہوں نے اس کی مخالفت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ ملاؤں نے اپنے ترکش کے سارے زہریلے تیر استعمال کئے اور دشنام طرازی کی ساری حدود کو عبور کیا، مگر سرسید کا کارواں تھا کہ آگے ہی بڑھتا چلا گیا۔ سرسید نے تن تنہا ملاؤں کے عظیم لشکر کو شکست فاش دی اور اس کی زندگی میں اس کے سامنے کسی مُلّا کا چراغ نہ جل سکا۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہ تھی کہ ملاؤں کی مذہبی سیاست اس وقت کے مسلمانان ہند کے تقاضوں سے متصادم تھی اور سرسید احمد خاں کی

سیکولر یا لادینی سیاست ان کی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی ضرورتیں پوری کرتی تھی۔
مسلمانوں سے یہ حقیقت مخفی نہیں تھی کہ سرسید احمد خاں پورے برصغیر میں یا برصغیر کے کسی بڑے
حصے میں اسلامی نظام کے قیام کے تصور کو ممکن العمل نہیں سمجھتا اور نہ ہی وہ اسلام کو مکمل ضابطۂ
حیات تسلیم کرتا ہے بلکہ وہ جگہ جگہ یہ اعلان کرتا ہے کہ مذہب کا دنیاوی امور سے کوئی تعلق نہیں
ہے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے روایت پسند مُلاؤں کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا اور سرسید
احمد خاں کا بھرپور ساتھ دیا۔ وہ سرسید کو اپنا محسن اعظم سمجھتے تھے اور سرسید واقعی اُن کا محسن اعظم
تھا۔ (ایضاً ص ۲۳۶۔۲۳۷)

سبطِ حسن

سیاسی طور پر رجعت پسند سرسید کی تعلیمی اسکیم کی کوتاہیاں:

(سرسید پر) اعتراضات دو طرح کے تھے۔ اول تو بنیاد پرستوں کی طرف سے کفر اور
نیچری کے فتوی لگے، دوسرے قومی سوچ رکھنے والوں نے انہیں انگریز کا پٹھو کہا کہ وہ نئے
خیالات اور تصورات کو اپنانے کی دھن میں حکومتِ انگلشیہ کے زبردست حامی اور مبلغ بن گئے
تھے اور انگریزوں کی حکمتِ عملی اور فیصلوں کے لئے راہ ہموار کرنے کی خاطر انتہا پسندانہ حد تک
انگریز پرست نظر آنے لگے تھے۔ ان پر یہ اعتراض بڑی حد تک صحیح بھی تھا۔ اصل میں سرسید
سیاسی طور پر تو رجعت پسند تھے کہ وہ انگریزوں کی حکمرانی ہی میں ہندوستان کی بقا سمجھ رہے تھے
اور ہندوستان کی قومی امنگوں سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کی بجائے مسلمانوں کو ایک
علیحدہ قوم کے طور پر دیکھ رہے تھے۔ لیکن سماجی اعتبار سے ان کا رویہ ترقی پسندانہ تھا۔ انہوں
نے جدید تصورات کے حق میں اور اوہام پرستی کے خلاف خیالات کو منظم کرنے کی باقاعدہ مہم
چلائی تھی۔ انہوں نے نئے علم الکلام پر زور دیا اور توہمات اور اندھی روایت پرستی کے
خلاف مہم شروع کی، نئے تعلیمی مراکز اور سکول کھولے۔ اب یہ ان کی خامی تھی کہ انہوں نے
اپنے سامنے کیمبرج اور آکسفورڈ کے تعلیمی اداروں کی مثال رکھی تھی اور انگریزوں کو اپنے تعلیمی
اداروں کی سربراہی سونپی جس کی وجہ سے ان تعلیمی اداروں کی پالیسی کھلے طور پر انگریز نوازی

کی پالیسی ہو کر رہ گئی جو یقیناً ان کی اسکیم کا بہت بڑا نقص تھا۔ لیکن یہ سب کچھ ان کی سیاسی سوچ کا حصہ تھا۔ دوسری بڑی کوتاہی سرسید کی تعلیمی سکیم کی یہ رہی ہے کہ انہوں نے صنعت وحرفت اور ٹیکنالوجی کی تعلیم و تدریس پر کوئی توجہ نہیں دی حالانکہ کسی قوم کی معاشی ترقی ٹیکنیکل ایجوکیشن کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ جس طبقے سے ان کا تعلق اور واسطہ تھا، یعنی جاگیردار اور اشرافیہ کا طبقہ، اس کی سوچ اور رویے میں صنعت وحرفت کی گنجائش تھی ہی نہیں۔

(گفتگو: ص ۶۰۔۶۱)

سردار محمد

مطلق العنانی اور خود سری:

چند ذی شعور اور قومی درد رکھنے والے حضرات کو، جن کے سرخیل سرسید احمد خاں تھے، یہ خیال آیا کہ ایسا دارالعلوم قائم کیا جائے جس میں مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ دُنیوی علوم بھی پڑھائے جائیں اور فارغ التحصیل ہونے والے، معاشرے میں عموماً اور کاروبارِ حکومت میں خصوصاً، اہم مقام حاصل کر سکیں۔ اس غرض سے مدرستہ العلوم علی گڑھ قائم کیا گیا۔ سرسید احمد خاں کی انگریز دوستی اور علومِ جدیدہ سے مرعوبیت کے باعث مدرستہ العلوم علی گڑھ میں دینداری پر دُنیاداری کا پہلو غالب آ گیا۔...... سرسید اپنے نظریات میں اتنے متشدد تھے کہ وہ ان کے خلاف کسی کو پر مارنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ سرسید کے خلوصِ نیت اور جذبۂ قومی ہمدردی کے باوجود سرسید کے تقریباً سبھی دوستوں نے سرسید کی طبیعت کی مطلق العنانی کا شکوہ کیا ہے۔...... سرسید کی اس خودسری کے باعث ان کے آخری دَور میں ان کے قریب ترین دوست (مثلاً مولانا حالی، مولوی سمیع اللہ، محسن الملک، وقارلملک) ان سے قدرے ناراض تھے۔

(کریسنٹ لاہور، شبلی نمبر: ص ۴۷۱ تا ۴۷۳)

سعید احمد اکبر آبادی

افکار میں مدوجزر اور انقلاب وتغیر کی کیفیت:

سرسید کا جذبہ اصلاح صادق اور بڑا مخلصانہ تھا۔ ان میں بڑا سچا جوش تھا، ولولہ

تھا، عزم تھا، بڑے ذہین اور محنتی تھے، تحریر کی قوت بے پناہ تھی، دھن کے پکے اور ارادہ کے مضبوط تھے لیکن بایں ہمہ اوصاف ان میں بڑی خامی یہ تھی کہ:

۱۔ انہوں نے علوم اسلامیہ کا مطالعہ اور ان کا اکتساب نہ انہیں مقصود بالذات سمجھ کر کیا تھا اور نہ باقاعدہ کیا تھا۔ اس بنا پر ان کا مذہبی وجدان آگے چل کر نہ ان کے تعقل پر غالب آسکا اور نہ تفلسف کے دلدل سے ان کو بچا سکا۔

۲۔ انہوں نے علوم جدیدہ اور خاص طور پر فلسفہ جدیدہ کا بھی مطالعہ دقت نظر سے نہیں کیا تھا ورنہ یہ اور نہیں صرف امانوئل کانٹ کی کتاب ''تنقید عقل محض'' کا بھی وہ غور وفکر کے ساتھ مطالعہ کر لیتے تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ تہذیب نو، افکار جدید اور فلسفہ و سائنس سے مرعوب اور جمہور علمائے اسلام کے مسلک سے منحرف ہوکر اسلامی حقائق کی غیر معروف و متداول توجیہہ و تاویل کرنے پر مجبور ہوتے۔

اس بنا پر سرسید کی اسلامی فکر میں خود پختگی اور استواری پیدا نہیں ہو سکی۔ علوم جدید کا اور تہذیب نو کا ان پر جتنا دباؤ زیادہ پڑتا رہا اسی کے مطابق ان کے افکار اور بعض مسائل کی نسبت ان کی رائے میں مدوجزر اور انقلاب و تغیر ہوتا رہا۔ چنانچہ خطبات احمدیہ، جو ولایت میں اور تفسیر اور بعض اور رسائل سے پہلے لکھے گئے تھے، ان کے اور تفسیر کے بعض مشترک مضامین و مقالات کا ایک ساتھ مطالعہ کیجئے، آپ کو یہ فرق اور انقلاب و تغیر صاف نظر آئے گا۔ خطباتِ احمدیہ سرسید کی بڑی معرکتہ الآرا مذہبی تصنیف ہے اور اس کو انہوں نے جس خلوص، محنت اور جوش وخروش کے ساتھ لکھا ہے، بے شبہ وہ لائق تحسین و آفرین ہے۔ اگرچہ آزاد خیالی اس میں بھی ہے لیکن صرف اس قدر کہ وہ اقوالِ شاذہ کو مسلک جمہور کے بالمقابل اختیار کرتے چلے جاتے ہیں، اور طرز استدلال و فکر کے اعتبار سے زیادہ سے زیادہ معتزلی کہے جا سکتے ہیں، لیکن ان کی یہ آزاد خیالی ان کی تفسیر میں اپنے شباب کو پہنچ گئی ہے اور انہوں نے بعض مسائل مثلاً حیات شہدا، حضرت عیسیٰ کا بن باپ کے پیدا ہونا، قرآن مجید میں مختلف انبیا کے جو معجزے بیان کئے گئے ہیں وہ اور حضرت عیسیٰ کا رفع آسمانی، ابلیس اور ملائکہ، استرقاق اور تعدادِ ازدواج، میراث وغیرہا اور ان کے علاوہ بعض اور مسائل میں جو

راہ اختیار کی ہے وہ بالکل الگ اور سب سے جدا ہے۔ اس میں سلف تا خلف علمائے حق اور اشاعرہ، ماتریدیہ یا معتزلہ، مقلد یا غیر مقلد کوئی ان کا شریک اور ساتھی نہیں ہے، اور اگر خطبات احمدیہ کو سرسید کے اصلی خیالات وافکار کا مرقع مانا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ خود سرسید بھی اپنے ہم خیال نہیں ہیں سرسید نے اگر علوم اسلامیہ ودینیہ کی تحصیل با قاعدہ اور عالمانہ طور پر نہیں کی تھی، جس کا اعتراف مولانا حالی کو بھی ہے، تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر انہوں نے ڈاکٹر اقبال وامثالہٗ کی طرح فلسفہ جدیدہ کا بھی مطالعہ کیا ہوتا اور انہیں معلوم ہوتا کہ خود یورپ کے مفکرین میں عقلیت محضہ کے خلاف زبردست رجحانات پائے جاتے ہیں تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی کہ معجزات کے سرے سے منکر ہی ہو جاتے اور حضرت عیسیٰؑ کو بن باپ کے تسلیم ہی نہ کرتے۔

(نگار کراچی، سرسید نمبر ۲، [۱۹۷۱ء]: ص ۱۶۰ تا ۱۶۲)

ڈاکٹر سلامت اللہ

مغرب زدہ علی گڑھ:

علی گڑھ شروع شروع میں جدیدیت کے سیلاب میں بہہ گیا اور کافی مدت تک اس پر مغرب زدگی طاری رہی اور بعد میں فرقہ واریت غالب ہوگئی۔

(ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم: ص ۵۸)

ڈاکٹر سید سلمان ندوی

علی گڑھ میں انگریزوں کا غلبہ:

سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا کی کوششوں کے باوجود علی گڑھ میں انگریزوں کا غلبہ رہا۔ مسٹر بیک، آرچبولڈ، آرنلڈ اور ماریسن نے اگرچہ مسلمان طلبہ کی تعلیم وتربیت پر بڑی توجہ دی لیکن وہ اپنے ثقافتی اثرات وہاں چھوڑ گئے۔ میری یہ رائے ہے، خواہ آپ اسے میری ذاتی رائے سمجھیں، کہ دینیات کی فیکلٹی قائم ہو جانے کے باوجود دنیاوی تعلیم دینی تعلیم پر غالب رہی۔

(تہذیب الاخلاق لاہور، مارچ ۱۹۹۸ء: ص ۴۷)

پروفیسر سلیم احمد

مغربی تہذیب سے پہلی نظر کا عشق:

سر سید اور حالی عہدِ جدید کے امام بھلے کو ہوں لیکن ..... وہ اپنی تہذیب کی حقیقت سے چنداں واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ خیر، ممکن ہے کہ اس کا جواز یہ ہو کہ وہ اس تہذیب کو رد کرنا چاہتے تھے اس لئے اس کا جاننا ان کے لئے ضروری نہیں تھا لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ جس تہذیب کو قبول کرنا چاہتے تھے اس سے بھی ان کی واقفیت بس واجبی سی تھی۔ مغربی تہذیب سے ان کا عشق پہلی نظر کا عشق تھا۔ وہ اس تہذیب کے چار سو سالہ سفر کے ایک محدود دور سے محدود طور پر واقف ہوئے اور اسے دل دے بیٹھے۔ اس تہذیب کی روح انجام کار اسے کہاں لے جائے گی، اس کا انہیں کوئی اندازہ نہیں تھا۔ وہ اس مخصوص دور میں اس کی عقل پرستی، افادہ پرستی، فطرت پرستی سے مرعوب اور متاثر ہوئے، لیکن آج اگر وہ زندہ ہوتے اور یہ دیکھتے کہ یہ تہذیب خود اپنے دیوتاؤں کو ایک ایک کر کے مسترد کر رہی ہے تو انہیں سخت حیرانی ہوتی اور شاید مایوسی بھی۔

(روایت (۱) لاہور: ص ۳۶۴)

پروفیسر ڈاکٹر سلیم اختر

متوسط طبقہ کی دوغلی ذہنیت:

سر سید کی تعلیمات سے سب سے زیادہ نئے ابھرتے ہوئے متوسط طبقہ نے فائدہ اٹھایا۔ ان کی جاگیریں نہ لٹیں اور بزرگ قتل نہ ہوئے اس لئے انہوں نے آسانی سے انگریزی حکومت کو قبول کر کے خود کو حالات کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہی نہ کیا بلکہ انتہا پسندی میں بعض لوگ تو انگریزوں سے بھی بڑھ کر انگریز بن گئے۔ وہ متوسط طبقہ جو اَب تک بے جڑ تھا، اب اسے سرکاری ملازمت کی صورت میں جو تحفظ ملا وہی زندگی میں اس کی جڑ قرار پایا۔

اکثریت نے تو اپنی وضع، ملازمت اور وفاداری کے لئے جواز مہیا نہ کئے اور خود کو خاموشی سے حالات کے حوالہ کر دیا، جب کہ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہ تھی جنھوں نے منافقت سے کام لیتے ہوئے متوسط طبقہ کی اس دوغلی ذہنیت کا ثبوت دیا جس کی بنا پر جو کرتے ہیں اسے برا بھی سمجھتے ہیں لیکن اس کے لئے جواز بھی تلاش کرتے ہیں۔

(نگار کراچی، اکبرالہ آبادی نمبر ۱۹۶۹ء: ص ۱۷۸)

مغرب پرستی سے وابستہ غیر ضروری تصورات:

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں پر کیا بیتی، وہ کس طرح سے احساسِ شکست کی پیدا کردہ خودترسی کی دلدل میں پھنسے دروں بینی کا شکار تھے، اسی صورت حال میں سرسید کے فعال کردار اور مصلحانہ مساعی سے سب آگاہ ہیں لہٰذا اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں، البتہ جسے میں نے فعال کردار اور مصلحانہ مساعی کہا ہے دراصل یہی باعث نزاع تھی۔ سرسید کے معاصرین کے لئے روایات و مسلّمات اور عقائد و تصورات کی لچھمن ریکھا اُلانگنا آسان نہ تھا۔ سرسید ہر معاملہ میں درست نہ تھے، چنانچہ بدلے سیاسی حالات اور بالخصوص آزادی کی تحریکوں میں شدت نے مغرب پرستی سے وابستہ ان کے تصورات اور انگریزی حکومت کا برخوردار بن کر رہنے کی تلقین کو غیر ضروری ثابت کر دیا جیسے یہ کہنا:

> ''تمام ہندوستان کے باشندوں کی، اور بالتخصیص مسلمانوں کی، خیر و عافیت اس میں ہے کہ سیدھی طرح انگلش گورنمنٹ کے سایۂ عاطفت میں اپنی زندگی بسر کریں اور خوب سمجھ لیں کہ مذہب اسلام کی یہی ہدایت ہے کہ جن کی ہم رعیت ہو کر اور مستامن ہو کر رہتے ہیں ان کے ساتھ وفادار رہیں اور ان کی بدخواہی نہ اپنے دل میں لائیں، نہ بدخواہوں کے ساتھ شریک ہوں''......

اسی سے یہ نکتہ اجاگر ہوتا ہے کہ کسی بھی مفکر، دانشور، مصلح کی ہر بات ہر وقت درست ثابت نہیں ہو سکتی...... مسلّم نظریات اور پختہ تصورات وقت کے سمندر میں حباب آسا ثابت ہوتے ہیں۔

(مسلک ملتان، سرسید نمبر ۲۰۰۰ء: ص ۲۰۶)

سلیم منصور خالد

توازن برقرار رکھنے میں ناکامی:

سر سید مرحوم فطرت پرستی اور خرد افروزی کے اس درجہ قائل تھے کہ انہوں نے معجزات انبیا اور احادیث رسول میں بیان کردہ بہت سی باتیں عقل عام کی بنیاد پر مسترد کر دیں۔ ایسا فیصلہ دیتے وقت کہیں تو ان کا لہجہ سخت تکلیف دہ ہوتا ہے، مثلاً پیدائش عیسیٰ، آتش نمرود، قربانی، زم زم، معراج، جنت دوزخ وغیرہ۔ بلاشبہ انہوں نے بہت سے امور میں اسرائیلیات اور وضعی احادیث کو ماننے سے انکار کیا مگر ''نیچریت'' کے جوش میں وہ توازن برقرار رکھنے میں ناکام رہے۔ اس طرح ان کی تحریروں کی زد مسلمات اور متفق علیہ امور پر بھی پڑی......

سر سید مرحوم نے الٰہیات اور دینیات پر قلم اٹھانے کے لئے واقعی بڑی محنت کی مگر افسوس کہ ان کا زاویہ نظر درست نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامیان ہند کے اجتماعی ضمیر نے ان کی قومی خدمات کا تو کھل کر اعتراف کیا مگر مرحوم کے مذہبی افکار کو قبول نہیں کیا۔ اب ان کے مذہبی افکار کا بار بار سامنے لانا اور انہیں مذہبی ریفارمر کے طور پر مثال و سند بنانا کارعبث ہے۔ مناسب یہی ہے کہ ان کا تذکرہ ان کے قومی کارناموں تک محدود رکھا جائے۔

(ترجمان القرآن لاہور، جولائی ۱۹۹۹ء، ص ۷۸)

ذہنی مرعوبیت کے ہاتھوں کج فہمی کی پرچھائیاں:

تفسیر میں سید احمد خاں کے وسیع المطالعہ ہونے اور یادداشت میں بے پناہ ہونے کا قدم قدم پر ثبوت ملتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ شاہ ولی اللہ کی تحریریں ان کے قلم کو روکتی ہیں اور گاہے سید صاحب ان کے استدلال کی دیوار سے اپنا سر پٹختے ہیں۔ اسی طرح عیسائیت پر ان کا مطالعہ اپنی وسعت کے اعتبار سے بڑا قابلِ رشک ہے۔ اس زمانے تک سامنے آنے والی مذہبی تحقیقات کو بھی انہوں نے بغور پڑھا، جہاد کے جواز اور حکمت پر بھی کھل کر لکھا۔ ان کا معذرت خواہانہ رویہ بے جواز ہونے کے باوجود ان کی انتخاب کردہ راہ کا خواہی نا خواہی ایک لازمی

جز وتھا۔ تفسیر کے مطالعہ کے دوران میں مصنف کا بدنیت ہونا تو ظاہر نہیں ہوتا البتہ ذہنی مرعوبیت کے ہاتھوں کج فہمی کی پرچھائیاں بار بار پڑتی دکھائی دیتی ہیں۔

(نقطۂ نظر اسلام آباد، ستمبر ۱۹۹۷ء ص ۳۰)

سید سلیمان ندوی

خوبیوں کے ساتھ ساتھ سرسید کی ایک بڑی کمزوری:

سرسید میں ساری خوبیوں کے ساتھ ساتھ ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ اپنے ہم نشینوں سے آمنا وصدقنا کے سوا کوئی اختلاف رائے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا نتیجہ ان کی اور مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کی، جو اُن کے دلی دوست اور معاون تھے، وہ لڑائی ہے جس میں سرسید نے ڈوئل تک لڑنے کا چیلنج دے دیا تھا۔

(بحوالہ ''سرسید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک کے ناقدین ...''، ص ۲۷۸)

مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریز ہو جانے کی تجویز:

مسلمانوں کی موجودہ تمدنی و معاشرتی بیماریوں کا علاج ایک سرسید کے نزدیک یہ تھا کہ مسلمان مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریز ہو جائیں۔

(شبلی نامہ، ص ۷۷)

نقالی کی زندگی، تنگدستی کا ذریعہ:

سرسید کا نیک نیتی سے یہ خیال تھا کہ کالج کے طلبہ میں بلند ہمتی اور بلند خیالی پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انگریزی طور وطریق اور وضع قطع اختیار کریں تا کہ ان میں حاکمانہ رُوح پیدا ہو، مگر یہ خیال کرتے وقت ان کے ذہن سے یہ بات اتر گئی کہ شیر کی کھال اوڑھ کر کوئی شیر نہیں بن سکتا۔ دوسرا نقصان اس کا یہ ہوا کہ حاکم قوم سے ملنے کے جنون میں وہ اپنی ہی قوم سے دُور سے دُور تر ہوتے گئے۔ تیسری بات یہ ہوئی کہ حاکم قوم کے طور وطریق کی نقالی میں ان کی زندگی کا سروسامان اتنا گراں ہو گیا کہ قوم کے کام کے نہیں رہے اور وہ تعلیم جو

قوم کی دولت مندی کی خاطر اُن کو دی گئی تھی، وہ اس نقالی کی بدولت تنگدستی کا ذریعہ بن گئی جس کی وجہ سے وہ قوم کی امدادواعانت کے قابل نہ رہے ۔

(بحوالہ "سرسید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک کے ناقدین"، ص ۱۸۳۔۱۸۴)

پروفیسر شان محمد

دوقومی نظریے کا بانی ہونے کا الزام:

مؤرخین کا ایک طبقہ سرسید احمد خاں کو دوقومی نظریہ کا بانی اور تحریک پاکستان کا روح رواں تصور کرتا ہے کہ محمد علی جناح نے بیسویں صدی میں وہ حاصل کر لیا جس کی داغ بیل سرسید نے انیسویں صدی میں ڈالی تھی۔ سرسید نے مسلمانوں کے دماغ میں علیحدگی کا بیج بویا اور جناح نے اسے تقویت دی اور مسلمانوں کے لئے ایک ملک تراش لیا۔

(فکر ونظر علی گڑھ، سرسید نمبر ۱۹۹۲ء: ص ۱۵۱)

سرسید کی درجنوں تقاریر ہیں جن میں انہوں نے ہندو اور مسلمانوں کو ایک ہی قوم تصور کیا۔ انہوں نے نہ تو فرقہ وارانہ تقاریر کیں، نہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف اکسایا اور نہ ملک کے بٹوارے کی بات کی اور نہ مسلمانوں کے لئے سروس میں ریزرویشن مانگا اور نہ انتخاب جداگانہ کو ہوا دی بلکہ اس بات کی نصیحت کرتے رہے کہ مسلمان اپنے اندر صلاحیت پیدا کریں تاکہ وہ ملک کو ترقی کی راہوں پر لے جائیں۔ ۱۸۸۵ء میں جب انڈین نیشنل کانگرس بنی تو سرسید نے اس کی مخالفت کی، اس لئے نہیں کی کہ وہ ہندوؤں کی جماعت تھی بلکہ اس لئے کہ وہ قبل از وقت تھی ۱۹۲۸ء کے بعد ہندوستانی سیاست نے زبردست کروٹ لی۔ نہرو رپورٹ نے مسلم لیگ کے نظریہ انتخاب کو تسلیم نہ کیا اور اس سے لیگ اور کانگرس کے درمیان خلیج پیدا ہوگئی۔ جناح نے اقلیتوں کے حقوق پر زبردست بحث کی اور جب نیشنل کنونشن نے ان کی دلیل مسترد کر دی تو انہوں نے ہمیشہ کے لئے کانگرس کو خیر باد کہہ دیا اور لیگ میں ایک نئی روح پھونکی۔ اس وقت تک سرسید اور علی گڑھ تحریک پر کسی نقاد نے دوقومی نظریے اور نہ ہی تخلیق پاکستان کا لیبل لگایا لیکن جب جناح نے ایک الگ ملک کی مانگ کی تو سرسید اور جناح کے

خیالات میں بڑی مناسبت بتائی گئی اور جناح کو سرسید کا جانشین قرار دیا گیا۔ لیکن ایک گہرے مطالعہ کے بعد یہ دونوں الزامات ماند پڑ جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے لئے ایک الگ ریاست کا قیام علامہ اقبال کی دین ہے سرسید اور جناح کے خیال میں زمین آسمان کا فرق تھا ...... اس لئے سرسید کا تخلیقِ پاکستان سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہے۔ (ایضاً: ص ۱۵۴ تا ۱۵۶)

کچھ نقاد سرسید کو تخیل پاکستان کا بانی بھی تصور کرتے ہیں، لیکن یہ درست نہیں ہے۔ وہ قوم پرست تھے اور زندگی بھر ہندو مسلم اتحاد اور ''ہندو مسلم ایک قوم'' کا سبق دیتے رہے تخیل پاکستان سرسید کے سیاسی رجحانات کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ انہوں نے ہندوستان کو ہمیشہ اپنا گھر سمجھا۔ اور وہ اکثریت (ہندوؤں) سے اتنے خائف نہ تھے کہ اس کے لئے وہ ہندوستان کا بٹوارہ چاہتے، اور نہ ہی انہوں نے مسلمانوں کو سیاسی اعتبار سے ہندوؤں سے الگ قوم تصور کیا۔ نظریۂ پاکستان دو قومی نظریہ کی تخلیق ہے۔ تحریک پاکستان کے مطالعہ سے یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ نظریہ پاکستان علامہ اقبال کے نظریات ملی اور مسٹر جناح کے سیاسی رجحانات کی تخلیق ہے ...... پاکستان کے تخیل کا سہرا حضرت علامہ اقبال اور جناح کے سر ہے اور اس کی تخلیق اسی سیاسی کشمکش کا نتیجہ ہے جو ۱۹۴۰ء سے تقسیم تک جاری رہی۔ سرسید کا اس سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔

(سرسید تاریخی و سیاسی آئینے میں: ص ۱۰۴ تا ۱۰۶)

سرسید کی کوئی ایسی تقریر نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ وہ ہندو اور مسلمانوں کو دو الگ الگ قومیں تصور کرتے ہوں یا ان کے دائرہ تخیل میں یہ تصور ہو کہ حالات کچھ اس طرح رخ پلٹیں گے کہ آنے والے دور میں سرزمینِ ہند میں دو الگ الگ مملکتیں بن جائیں گی۔ (ایضاً: ص ۱۰۳)

رجعت پسند رویہ:

سرسید کا نظریہ رجعت پسند تھا۔ ایسا جھلکتا ہے کہ وہ یہ سوچتے تھے کہ سیاسی اختیار صرف امرا اور رؤسا کے ہاتھ میں ہی رہنا چاہیے۔ تعجب ہے کہ مغربی اثرات نے اُن کے اس رجحان میں کیوں تبدیلی پیدا نہ کی! اُنہوں نے نہ صرف کونسلوں کے منتخب شدہ ممبروں کی توسیع

کی مخالفت کی بلکہ کانگرس کی دوسری مانگ ، کہ سول سروس کا امتحان انگلستان کی
ہندوستان میں بھی ہوا کرے، کی مخالفت کی ۔اس تقریر میں اُنہوں نے کہا:

''ہندوستان کی شریف قومیں ہندوستان کے ادنیٰ درجہ کے شخص کو، جس کی جڑ بنیاد سے
وہ واقف ہیں، اپنی جان و مال پر حاکم ہونا پسند نہیں کریں گے''۔

یہ جملے بھی سرسید کے اس خیال کی تائید کرتے ہیں کہ سیاسی اختیارات صرف اُمرا، رؤسا کے
ہاتھ میں رہیں اور وہ نیچے طبقے پر حکومت کرتے ہیں۔ (ایضاً: ص ۷۷۔۷۸)

غیر مسلم طلبہ سے خاص حسن سلوک:

سید کا کالج مسلمانوں کے لئے مخصوص طریقے پر کھولا گیا تھا، مگر اس کے دروازے
ہندوؤں کے لئے بند نہ تھے۔ اعداد و شمار، جو اکٹھا ہو سکے ہیں، ان میں ہمیشہ ہندو طلبہ کی تعداد
تو مسلمان طلبہ کے برابر رہی یا ان سے زیادہ۔ جب کبھی غیر مسلم طلبہ کالج چھوڑتے تو سید کو
افسوس ہوتا وہ غیر مسلموں کو متوجہ کرنے کے لئے اپنی جیب خاص سے ان کو وظیفہ دیتے
اور اس کا تذکرہ جلد بار گزٹ میں کرتے۔ (ایضاً: ص ۹۸۔۹۹)

پروفیسر شاہ محمد وسیم

ہندو مسلم عیسائی ایک قوم کا پیغام:

آج جب کہ فرقہ واریت سر اُٹھا رہی ہے اور اکثر فرقہ وارانہ کشیدگی اور کہیں کہیں
فسادات ہماری روایتی رواداری پر ضرب لگا رہے ہیں، سرسید کے حکیمانہ الفاظ فضاؤں میں
گونجتے ہیں کہ'' یاد رکھو کہ ہندو، مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی
بھی جو اس ملک میں رہتے ہیں اس اعتبار سے سب ایک قوم ہیں''۔ (لیکچر مدرسہ گورداس پور
پنجاب) آج اس پیغام کی معنویت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ اور کوئی انکار کرے گا بھی
کیوں؟ کہ اس میں ملک و قوم کی بھلائی ہے اور ترقی کا راز مضمر ہے۔ اسی لئے پنڈت جواہر لال
نہرو نے یہ اعلان کیا کہ'' وہ (سید احمد خاں) ہندوؤں کے خلاف یا فرقہ پرست نہیں تھے۔ انہوں

نے بار باراس پر زور دیا کہ مذہبی اختلافات کو کوئی سیاسی یا قومی اہمیت نہیں دینا چاہیے''۔اس پیغام کی معنویت اپنی جگہ آپ مسلم ہے کہ جی بے اختیار کہہ اٹھتا ہے:

''سید، تیرا انداز فکر زندہ ہے اور سلسلہ تخیل تلاش مقصد میں رواں دواں ہے کہ تو رہبروں میں سے تھا''۔

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، مارچ اپریل ۱۹۹۸ء ص ا د)

شاہ نواز فاروقی

سرسید تحریک کا منفی اثر:

ہمارے لبرل حضرات ایک جانب تو اس بات پر ماتم کرتے ہیں کہ برصغیر کا مسلم معاشرہ انتہائی روایت پرست اور قدامت پسند تھا اور اس کی یہ روایت پرستی اور قدامت پسندی سرسید کی عظیم کوششوں کے باوجود بھی قائم رہی لیکن دوسری جانب وہ برصغیر کی پوری ملت اسلامیہ کو سیکولر قیادت کے پیچھے اور سیکولر آئیڈیل کے لئے مارچ کرتے ہوئے دکھاتے ہیں۔ آخر یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ سوال کے صرف دو ہی جوابات ممکن ہیں۔ایک یہ کہ یہ پورا تھیس (Thesis) ہی غلط ہے اور دوسرا یہ کہ مسلمانوں کو دکھایا کچھ اور گیا اور جدوجہد کسی اور آئیڈیل کے لئے کی گئی۔

......تحریک خلافت، خلافت عثمانیہ کے خاتمے۔کے فوراً بعد بکھر کر رہ گئی اور اس کے اثرات بھی تیزی سے زائل ہوگئے، البتہ اس کے برعکس سرسید کی تحریک مسلمانوں کو فکری طور پر ضرور تقسیم کرنے کا ذریعہ بنی۔یہ تقسیم سرسید کے زمانے سے آج تک چلی آ رہی ہے اور اس نے برصغیر کے مسلمانوں کی قوت کو بے پناہ نقصان پہنچایا ہے۔

(کالم بعنوان ''برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کا قیمہ''،روزنامہ انصاف لاہور، ۱۰ اپریل ۲۰۰۱ء)

شاہد حسین رزاقی

جمال الدین افغانی کا سرسید کی مخالفت کا سبب:

سید احمد خاں کچھ تو حالات و مصالح سے مجبور تھے اور کچھ انگریزوں سے ان کی

مرعوبیت اور وفاداری نے انہیں مجبور کر دیا تھا کہ وہ انگریزوں سے مفاہمت ومصالحت کر
ان کی خوشنودی و سرپرستی حاصل کرنا مسلمانوں کی بہتری اور بقاوترقی کے لئے ضروری تر
کرنے لگے تھے۔ لیکن اپنے اس مقصد کے حصول کی خاطر وہ انتہائی حدود سے بھی گزر گئے
سید جمال الدین افغانی جیسا عظیم حریت پسند، برطانوی سامراج کا دشمن، اصول وعقائد
شیدائی، اسلام کا فدائی اور بے باک مجاہد ایسی مصلحتوں کو برداشت نہ کرسکتا تھا جو تحریف قرآن
تک کو گوارہ کر لینے میں مضائقہ نہ سمجھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سرسید کی شدید مخالفت کی اور
دہریت کے خلاف ایک رسالہ لکھنے کے علاوہ دو مضامین بھی لکھے جن میں سرسید اوران کے رفقا
بہت لے دے کی ہے۔

(سید جمال الدین افغانی، حیات وافکار: ص ۷۸۔۷۹)

ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی

سابق کتب سماوی میں تحریف لفظی سے انکار:

مسلمانوں کے خیال میں سابق کتب سماوی میں لفظی ومعنوی تحریف ہو چکی ہے اور
اب وہ اعتبار کے لائق نہیں ہیں۔ ان کی کوئی بات بطور سند نہ پیش کی جاسکتی ہے اور نہ تسلیم کی
جاسکتی ہے۔ سرسید اس خیال کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ تحریف معنوی تو مانتے ہیں لیکن اُن کا دعویٰ
ہے کہ رسول اکرمؐ کے عہد مبارک میں بھی یہ کتب سماوی اسی حالت میں تھیں جیسی کہ اب
ہیں تاریخی حقائق کی روشنی میں عیسائی دنیا یا اس کی حمایت میں سرسید کا یہ دعویٰ کہ قدیم و
جدید عہد نامہ میں تحریف لفظی نہیں ہوئی ہے، بڑا محل نظر معلوم ہوتا ہے۔

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۹۸ء: ص ۷۹۔۸۰)

شرافت حسین مرزا

تاریخ کی کتاب میں انقلابیوں کا تمسخر:

''سرکشی ضلع بجنور'' ان کے جس نقطۂ نظر کو پیش کرتی ہے، وہ انگریز دوستی اور حکومت

کی خیر خواہی ہے۔قومی نقطۂ نظر سے یہ کتاب لکھی ہی نہیں گئی۔اس میں جا بجا قومی رہنماؤں، آزادی کے جاں نثاروں، ضلع کے مقتدر اور بااثر حضرات اور قابلِ احترام شخصیتوں کا ذکر سرسید نے جن الفاظ اور جس انداز سے کیا ہے، محض وہی اس کا کافی ثبوت ہے۔مثلاً نواب محمود خاں کے لئے ہر جگہ نامحمود خاں لکھا ہے۔پھر حرام زادہ، بدمعاش، بدذات، مفسد، نمک حرام، کم بخت جیسے الفاظ اس ضلع کے باشندوں کے نام کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں، انقلابیوں کا تمسخر اڑایا گیا ہے جب کہ انگریز حکام اور ان کے ساتھیوں کی تعریف کی گئی ہے اور انگریز حکام کے لئے صلاحیت بہادر، آقا، دام اقبالہم وغیرہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ان کے نقطۂ نظر کا نچوڑ کتاب کا ''خاتمہ'' ہے جس میں وہ صاف صاف لفظوں میں انگریزی حکومت کی برکتوں کا اعتراف کرتے ہیں۔

(سرکشی ضلع بجنور مرتبہ شرافت حسین مرزا:ص ۷۵)

ڈاکٹر شمس تبریز خاں

عقل پر کلی بھروسہ کرنے کی غلطی:

ان کی مذہبی پالیسی عقلیت کی اساس پر مبنی ہے۔ان کی کوشش تھی کہ اسلام کو اپنے معاصرین کے ذہنی سانچے اور عقلی سطح کے لئے قابل قبول بنا کر پیش کریں تاکہ وہ یورپ کے نئے عقلی معیاروں کے مطابق اور قابل فہم ثابت ہو اور صدیوں کی وہ آویزش ختم ہو جو صلیبی جنگوں سے چلی آرہی ہے۔یہاں سرسید سے وہی غلطی ہوئی جو عقل پر کلی بھروسہ کرنے والوں سے ہوتی آئی ہے۔کانٹ اور اس جیسے دوسرے مفکرین اور ہمارے علما میں اشعریؒ و غزالیؒ، ابن تیمیہ اور مجدد الف ثانیؒ نے بڑے مدلل انداز میں لکھا ہے کہ انسانی عقل کی پرواز و رسائی لامحدود نہیں بلکہ کائناتی حقائق اور غیبیات کے ادراک کے سلسلے میں بہت ناقص اور مشتبہ واقع ہوئی ہے اور اس میں انسانی جذبات، خواہشوں، تجربات و مزعومات کی دخل اندازی بھی ہوتی رہتی ہے اس لئے وہ مذہبی یا دنیوی معاملات میں بے عیب، بے داغ اور مکمل معیار نہیں اور حقائق کے ادراک کے لئے وحی والہام، شعور و وجدان اور تاریخی تجربات کا سہارا ضروری

ہے سرسید کی عظیم قومی و تعلیمی خدمات کے پورے قدر واعتراف کے باوجود ایک حرف
شکایت زبان پر آ ہی جاتا ہے کہ علمائے کرام کو اعتماد میں لے کر اگر دینی و دنیوی تعلیم کا ایک
جامع نظام و نصاب بھی اُن کے پروگرام میں ہوتا تو ہماری تعلیمی واجتماعی زندگی کا نقشہ کچھ
بہتر ہوتا اور ملت میں دین و دنیا کی وہ تفریق و تقسیم نظر نہ آتی جو آج ملت اسلامیہ کی بدنصیبی
نمایاں سبب بن گئی ہے۔ اس کے ساتھ تفسیر قرآن کے سلسلے میں حد سے زیادہ خود رائی اور بے
پروائی اور مسلمہ عقائد اور غیبی امداد کی انفرادی تاویل ان کی ایسی جسارت تھی جس کے لئے اللہ
تعالیٰ سے انہیں معاف کرنے کی دعا ہی کی جاسکتی ہے۔ سرسید کی مذہبی بے اعتدالیوں پر ان کے
معتقدین میں حالی اور محسن الملک سے لے کر ڈاکٹر سید عبداللہ اور پروفیسر آل احمد سرور تک نے
گرفت کی ہے اور انہیں غیر ضروری بتایا ہے۔

(فکر و نظر علی گڑھ، شمارہ اول ۱۹۹۳ء، ص ۵۰)

شمیم احمد

یک طرفہ استدلال کے شکار ناقدین:

سرسید کے تمام ناقدین عموماً یک طرفہ استدلال کے شکار رہے ہیں۔ اگر ان سے
اختلاف رکھتے ہیں تو اس حد تک کہ انہیں سرے سے کوئی قابلِ ذکر آدمی ہی نہیں سمجھتے اور اگر
اتفاق رکھتے ہیں تو پھر ان کو رحمۃ اللہ علیہ کے درجہ تک پہنچا دیتے ہیں......ان ناقدین میں سب
سے زیادہ افسوس ناک ذہنیت ان حضرات کی ہے جو آج تک سرسید کی فکر سے ہر اختلافی امر کا
جواز پیش کرتے رہتے ہیں۔ یہ جواز پیش کرنے کی بیماری ایسی مہلک ہے کہ اس سے سوائے
منافقت کے اور کچھ برآمد نہیں ہوتا۔ ان حضرات کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر ایک غلطی یا تضادِ فکر کو
تسلیم کر لیا جائے تو اس سے کون سی قیامت برپا ہو جائے گی اور کون سی آفت ٹوٹ پڑے گی!

(۲+۲=۵: ص ۲۱-۲۲)

فکرِ سرسید کی کامیابی میں سرکاری مصلحتوں کا دخل:

سرسید کا طرزِ فکر چونکہ برطانوی سیاست اور حکومت کے لئے زیادہ سودمند تھا اس

لئے اس نے پوری قوت سے اس کے اثر ونفوذ کو پھیلنے کے مواقع بہم پہنچائے اور ہر ممکن امداد کی۔ سرسید کی طرز فکر کو کامیابی کی دلیل بنانے والے حضرات اگر ایمان داری سے اس پوری تحریک کے پس منظر کا مطالعہ کریں تو انہیں خود یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس طرز فکر کی کامیابی میں نظریہ کی صداقت کو بہت کم اور اس دور کی صاحب اقتدار قوت اور حکومت کی مصلحتوں اور امداد کا بہت بڑا دخل تھا جس کا ثبوت اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ سرسید کی مخالفت صرف محض (ترقی پسند ادیبوں کے نقطۂ نظر سے) ملاؤں اور دینی اداروں کے مدرسوں اور بقول سرسید ''قل اعوذیوں'' کی طرف سے نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کی شدید مخالفت اس طبقہ کی طرف سے ہوئی تھی جس نے سرسید کی طرح خود مغربی تعلیم اور انگریزی حکومت کو ہندوستان کے لئے ایک نعمت قرار دیا تھا، اور یہ سب سرسید کے ہم عصر اور ان کے شریک کار قرار دئے جا سکتے ہیں۔
(ایضاً:ص ۳۸)

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اگر کسی نظریہ کی پشت پناہی کوئی صاحب اقتدار طبقہ یا حکومت کر رہی ہو تو اس کے مقابلے پر ایسے افراد کی کاوشیں، جو حکومت کے مفاد کے خلاف اور اس کے مقاصد کے لئے مضر ہوں، یقیناً کس مپرسی کے عالم میں سسک سسک کر دم توڑ دیتی ہیں۔ سرسید کو انگریزی حکومت جس لئے استعمال کر رہی تھی اس کا مقصد ذہنی غلامی کو ایک صاحب کردار اور جرأت مند قوم میں اس طرح پیدا کرنا تھا کہ اس کی تمام انفرادی قوتیں مفلوج ہو کر رہ جائیں، اس لئے برٹش گورنمنٹ نے اس مہم میں ہر اس تحریک کی پشت پناہی کی جس کا مقصد حکومت سے مرعوبیت اور مغرب کی برتری ثابت کرنا ہو۔ (ایضاً:ص ۴۳-۴۴)

ایک نظامِ خیال میں کسی دوسرے کی قلم لگانے کے تباہ کن نتائج:

سرسید احمد خاں...... تبدیلی تو لائے تھے اسلام کے نام پر، اسلام کی سربلندی کے لئے، مگر سو سال کے اندر ہی اندر ستر فی صد مسلمان اسلامی شعائر سے نجنت ہو گئے۔ دیکھا آپ نے، خواہشات کیا ہوتی ہیں اور نتائج کیا برآمد ہوتے ہیں! دراصل کسی نظام خیال میں کسی دوسرے نظام خیال کی قلم لگانا اس کو ہمیشہ کے لئے برباد کر دینے کے مترادف ہے، خواہ آپ نے کتنی ہی نیک خواہشات کے ساتھ یہ کام انجام دیا ہو۔ سرسید پر آپ جتنا غور کیجئے گا،

عبرت حاصل کرنے کے مواقع آپ کو اتنے ہی ملیں گے۔ (ایضاً: ص ۲۵۶)

ہماری آزادی کے قاتل ہمارے ہی ہیرو:

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کیا واقعی جنگِ آزادی تھی؟ اگر ہم میں سے ایک آدمی
لئے بھی وہ واقعی تحریک آزادی تھی تو میں دریافت کرنا چاہوں گا کہ آج بھی ہماری یونیورسٹیو
کالجوں اور اسکولوں میں وہ نصاب کیوں رائج ہے جس میں تحریک آزادی کو غدر کہنے وا
سے بغاوت قرار دینے والے اور غلامی پر فخر کرنے والوں کو ''قومی ہیروز'' بنا کر پیش کیا جا
ہے؟ کیا وہ مصلحتیں آج بھی ہمارے معاشرے کا تقاضا ہیں جو ۱۸۵۷ء میں ان ''ہیروز''
پیدائش کا سبب بنی تھیں؟ ہماری ہر نسل اس تضاد اور خوئے غلامی کو اگلی نسل میں منتقل کرتی
ہے۔ اگر آج پاکستانی معاشرہ باطنی تضاد کا شکار ہے تو یہ کس کا قصور ہے؟ کیا ہم یہ نہیں
رہے کہ آزاد پاکستان میں جدید ادب کے اور جدید شعور کے علم برداروں کی تحریروں،
تقریروں میں، قوم کی رہنمائی کرنے والے مدعیوں کے قومی بیانات میں انگریزوں کی غلامی
طرف بلانے والوں، اس پر قناعت کرنے والوں اور پوری قوم کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے
انگریزوں کی نقالی پر فخر کرنے والوں کو آج بھی قومی ہیرو قرار دیا جا رہا ہے؟ یہ وہی خوئے غلا
نہیں تو کیا ہے جس نے نوکر شاہی ذہنیت کو ایک نعمت غیر مترقبہ قرار دیا تھا؟ کیا ہم نے کبھی
سوچا کہ آج بھی سچائی کی تلاش کرنے والی اکا دکا آوازوں کے تقابل میں ہمارے قومی معما
اساتذہ، دانش ور، اہل قلم، صحافی اور سیاست دان ان افراد کے دفاع میں کیوں شب و روز
مصروف ہیں جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کو غدر اور بغاوت قرار دیا تھا؟

ہماری بدنصیبی دیکھئے کہ ہم میں ایسے ادیب بھی موجود ہیں جو دنیا بھر کی آزادی کی
تحریکوں کے والہ و شیدا ہیں اور جو اپنی تحریروں اور تقریروں میں مغربی استعمار اور ان کے استحصا
پر مٹھیاں بھینچ بھینچ کر گرجتے اور برستے نظر آتے ہیں، جو آزادی کے لئے قربانیوں، ایثار کرنے
والوں اور حق و انصاف کی آواز بلند کرنے والوں کی دہائیاں دینے میں کوئی بخل محسوس نہیں کرتے
مگر وہ دوسری طرف آزادی کے قاتلوں، غلامی کے حامیوں کو یہ کہہ کر سراہتے ہیں کہ اس کے بغیر
ترقی کا شعور پیدا نہیں ہو سکتا تھا، یعنی انہیں جو چیز مداحی پر مجبور کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر یہ ''ہیروز''

پیدا نہ ہوئے تو وہ بھی پیدا نہ ہوتے۔ شاید ہی دنیا میں کوئی ایسی بدقسمت قوم ہو جس نے غلامی پر فخر کرنے والوں کو اپنا ہیرو قرار دیا ہو۔ مگر ان دانش وروں کا مسئلہ یقیناً ہمارے لئے زیادہ قابل فہم ہے۔ جس طرح ان کی وفاداریاں پاکستان سے باہر ممالک سے وابستہ ہیں اور جس کی وجہ سے انہیں پاکستان کی آزادی داغ داغ اجالا نظر آتی ہے، اسی طرح ۱۸۵۷ء کے ''قومی ہیروز'' کی وفاداریاں بھی لندن سے وابستہ تھیں۔ مجھے جس بات پر حیرت ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کا دم بھرنے والوں اور اشتراکیت کے مرغان دست آموز بھی سب ایک بات پر متفق ہیں کہ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقائے کار کا طرز عمل واحد مثبت طرز عمل تھا کیا ہمیں اپنے اس طرز عمل میں کوئی تضاد اور منافقت نظر نہیں آرہی ہے؟ ہم بیک وقت دو متضاد چیزوں کو کیسے قبول کر لیتے ہیں؟ یہی ہمارا قومی المیہ ہے۔

(زاویہ نظر ص ۳۰ تا ۳۲)

شمیم حنفی

مطالعہ سرسید میں مثبت اور منفی رویے:

سرسید کے مطالعے میں اب تک جو رویے ہمارے سامنے آئے ہیں، اُن میں بالعموم ایک طرح کی انتہا پسندی ملتی ہے، مثبت اور منفی دونوں طرح کی۔ سرسید کے تصورات کی تشکیل میں جن عناصر کا عمل دخل رہا، بے شک ان کی نوعیتیں کثیر ہیں، ان میں ایک ساتھ معنی کی کئی سطحیں تلاش کی جا سکتی ہیں، اسی لئے سرسید کی بہت سی باتوں کو متنازعہ بھی سمجھ لیا گیا۔ ایک حلقہ تو سرسید کے ان عقیدت مندوں کا ہے جو سرسید کے تصورات کو تنقید سے یکسر ماورا اور اُن سے اختلاف کی ہر دیانت دارانہ کوشش کو بھی بے ادبی سمجھتے ہیں۔ اس حلقے کی طرف سے سرسید کے تصورات کی وضاحتیں تو سامنے آئیں لیکن اُن کے تصورات کے علمی تجزیے سے سروکار بہت کم رکھا گیا۔ علاوہ ازیں سرسید کی شخصیت میں جو عظمت، ہمہ گیری، دردمندی اور صلابت ملتی ہے اُس کے پیش نظر یہ سوچنا کہ سرسید سے ''اختلاف'' کا جواز سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا، ایک طرح کی سادہ لوحی ہے۔ اسی طرح سرسید کے بعض نظریات کو اُن کے حقیقی تاریخی تناظر سے

الگ کر کے دیکھنا اور پھر اُن کی حدوں کی نشان دہی کرنا بھی محض ہٹ دھرمی ہے۔ مذہب، تعلیم، تہذیب، معاشرت، سماجی فکر کا کون سا شعبہ ایسا ہے جہاں ایک سے زیادہ رویوں کی سمائی ممکن نہ ہو۔ ہونا یہ چاہیے کہ ان تمام شعبوں کا جائزہ انسانی تصورات کے بدلتے ہوئے آداب کی روشنی میں لیا جائے اور اس سلسلے میں کسی ایک موقف کو حتمی اور قطعی نہ سمجھ لیا جائے۔ سنجیدہ اختلافات اسی ذہنی بیداری، کشادگی سے پیدا ہوتے ہیں۔ سر سید کے سب سے قریبی رفقا میں بھی ایسے اصحاب شامل تھے جو بہت سی باتوں میں سر سید سے سو فی صدی متفق نہیں تھے۔ بعضوں نے تو سر سید پر کھل کر اعتراضات بھی کئے لیکن سر سید کے احترام میں اس سے کوئی کمی نہیں آئی۔

(جامعہ دہلی، جولائی تا دسمبر ۱۹۹۸ء: ص ۸۔۹)

ڈاکٹر شوکت اللہ خاں

انگریز نواز بننے میں خاندانی پس منظر:

سر سید کا خاندان مغلیہ دربار سے براہ راست منسوب تھا اس لئے مغل بادشاہوں کی بگڑتی ہوئی حالت کا اسے اچھی طرح علم تھا اور وہ اس کے اثرات کی زد میں تھا۔ سر سید کے والد میر تقی کی حیات کے دوران ہی مغلیہ دربار سے ملنے والی تنخواہ میں کافی کمی واقع ہوگئی تھی۔ ذاتی معاملات کے علاوہ اس کا سبب تنخواہوں میں کانٹ چھانٹ کیا جانا تھا جو بادشاہ کی نہایت محدود آمدنی کا فطری نتیجہ تھی۔ ۱۸۳۸ء میں میر تقی کے انتقال کے بعد یہ آمدنی مزید کم ہوئی، سر سید کی والدہ کو گھٹی ہوئی تنخواہ کا ایک حصہ ہی مل سکا۔ میر تقی کے انتقال کے بعد مغل دربار سے ملی ہوئی جائداد بھی ہاتھ سے نکل گئی۔ مغل بادشاہ کی خراب مالی حالت اور میر تقی کے انتقال نے سر سید کے لئے ایسی صورت حال پیدا کی کہ جس نے انہیں مغل بادشاہوں کے تئیں اپنے رشتوں کی نوعیت کے بارے میں غور کرنے پر مجبور کر دیا ..... وہ ایک دور اندیش اور عملی انسان تھے۔ مغلوں کی تیزی سے بدلتی ہوئی حالت اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے عروج اور روز افزوں اقتدار نے

انہیں اپنے زاویہ نظر اور رشتوں کو از سرِ نو متعین کرنے کی تحریک بخشی۔ والد کے انتقال کے بعد انہوں نے کمپنی کی سروس کا پختہ ارادہ کیا۔ اہل خاندان مغلیہ دربار سے قطع تعلق کے حق میں نہ تھے مگر سرسید کا ارادہ مصمم تھا، غور و فکر کا نتیجہ تھا۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی ملازمت پیشہ خاندان کے لئے ملازمت کے بغیر گزر بسر کرنا ممکن نہیں۔ سرسید کے سامنے اہم سوال یہی رہا ہوگا کہ وہ کس کے تحت ملازمت کریں؟ مالی بحران کا شکار، وظیفہ خوار، بے بس بادشاہ کی یا کہ سیاسی طور پر مستحکم، فوجی اعتبار سے کہیں زیادہ طاقت ور اور مالی اعتبار سے کہیں زیادہ مضبوط ایسٹ انڈیا کمپنی کی؟ یہ سوال وفاداری میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ روزگار سے بھی جڑا تھا۔ شاہی مقربین کے لئے گرتے ہوئے شاہی درخت کا سایہ ناکافی تھا...... سرسید کی نظر میں انگریزی حکومت دوام حاصل کر چکی تھی۔ اس کی مخالفت سیاسی لحاظ سے غلط اور نقصان دہ ہوتی۔ اس کی حمایت دوراندیشی کا تقاضا اور فوائد کا وسیلہ تھی، اسی لئے انہوں نے انقلاب کو سرکاری نظر سے دیکھا۔ انہیں یقین تھا کہ جن کا ماضی مغل نواز تھا وہ نقصان میں رہیں گے اور جن کا مستقبل برطانیہ نواز تھا وہ فائدہ اٹھائیں گے۔

(جامعہ نئی دہلی، جولائی تا دسمبر ۱۹۹۸ء: ص ۱۹۷۔۱۹۸)

سرسید کا ذہن غدر سے پہلے ہی انگریز نواز ہو چکا تھا۔ بجنور میں غدر کے واقعات کا تجزیہ ان کی انگریز نوازی کی سوچ کا تسلسل ہی معلوم ہوتا ہے۔ انہیں یقین تھا کہ صرف انگریز ہی حکومت کے اہل ہیں اور حکمرانی کے زیور سے مرصع ہیں...... عوام کو سرکار سے جوڑنے کی سرسید کی فکر اور کوشش ۱۸۵۷ء سے قبل اور خود غدر کے دوران وجود میں آ چکی تھی۔ غدر کے بعد مسلمانوں کو برطانوی حکمرانوں کے قریب لانے کی ان کی حکمت عملی ان کے سابقہ فکر و عمل کا تسلسل ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انگریزوں سے مسلمانوں کی دوستی اور اتحاد کے اصول کی تشکیل میں سرسید اور ان کے خاندان کی مغلیہ دربار سے قربت، مغل بادشاہ کی تباہ حالی، ذاتی زندگی پر اس کے اثرات، برطانوی حکمرانی کے جگمگاتے سورج اور اس کے استحکام پر اُن کے یقین کے ساتھ ساتھ ان کے مستقبل نواز انداز فکر کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ (ایضاً: ص ۱۹۹۔۲۰۰)

ڈاکٹر شوکت سبزواری

محدود مذہبی مطالعہ:

سرسید کی تربیت اگرچہ مذہبی ماحول میں ہوئی، انہیں اس زمانہ کے امیرزادوں کی طرح فارسی و عربی کی تعلیم دی گئی لیکن وہ عربی کے متبحر عالم اور اسلامی علوم وفنون کے ماہر نہ تھے۔ ان کا مذہبی مطالعہ بہت محدود تھا۔ فن کی بعض اچھی کتابیں جو عام اہل علم کی دسترس سے باہر تھیں، ان کی نظر سے نہ گزری تھیں۔ اُن کی تحریروں میں قرآن اور حدیث کو چھوڑ کر علمائے دین کی کتابوں کے حوالے بہت کم ملتے ہیں۔ انہوں نے اختلافی مسائل پر بحث کرتے ہوئے اس دِقّت نظر، جرح وقدح اور عالمانہ موشگافی سے بھی کام نہیں لیا جو اس زمانہ کے اہل علم کا شیوہ تھا۔ ۱

(برگ گل کراچی، سرسید نمبر [نقشِ ثانی]: ص ۳۰۰)

مغربی معاشرت اختیار کرنے کا مشورہ اور اس کے مضر اثرات:

انہوں نے مغربی معاشرت اختیار کرنے کا جو مشورہ مسلمانوں کو دیا اور مغرب کی ہر ئی چیز پر ٹوٹ کر گرے، وہ کسی طرح مناسب نہ تھا۔ یہ اس کا اثر ہے کہ آج ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ مغرب سے اس قدر مرعوب ہے کہ اسے اپنی ہر قومی روایت حقیر نظر آتی ہے۔ (ایضاً: ص ۳۰۱)

سرسید کی نیک نیتی میں شبہ نہیں، ان کی تجویز معقول سہی لیکن انہوں نے اپنی تجویز کی حدود کا پوری طرح خیال نہیں رکھا۔ انہوں نے مسلمانوں کے لئے جو نسخہ تجویز کیا اس میں مریض کے مزاج کی رعایت نہیں رکھی۔ انہوں نے مریض کو اتنی سرد دوائیں دیں اور اتنی بڑی مقدار میں کہ اس سے نمونیہ کا اندیشہ پیدا ہوگیا۔ سرسید ایک مصلح ضرور تھے مگر وہ یہ بھول گئے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے مسلمان ''کرمک نادان'' کی طرح تھے، تقریباً سو سال کی سیاسی غلامی نے ان کے قومی شعور کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے، وہ اپنی بصیرت کھو چکے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مغربی تہذیب و معاشرت اور علوم وفنون کی چمک کی تاب نہ لا سکیں اور اس پر اس طرح

نوٹ کر کے رکھ دیں کہ ان کی کوئی ہستی ہی نہ رہے۔

(نگار کراچی، اکبرالہ آبادی نمبر ۱۹۶۹ء، ص ۲۰۷)

سرسید کے زمانے میں مغرب پرستی کا جو دروازہ کھل چکا تھا، وہ آج تک کھلا ہوا ہے اور اس کے مضر اثرات آج بھی (جب کہ پاکستان وجود میں آچکا ہے) پوری قوم کے مذہبی و ملی شعور اور اسی کے اجتماعی کردار کو گھن کی طرح کھائے جا رہے ہیں۔ آج ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کی اکثریت کا یہ حال ہے کہ اسے اپنے مذہب سے کوئی لگاؤ نہیں، اپنی تاریخ سے ہمدردی نہیں، اپنی روایات سے محبت نہیں، اور ہو بھی کہاں سے جب اسے ان سب سے واقفیت ہی نہیں! اپنی زبان، ادب اور تہذیب کے لئے اس کے دل میں کوئی جگہ نہیں۔ وہ مغرب کے علمی کارناموں سے مرعوب ہے، اس کی معاشرت پر ریجھا ہوا ہے اور اس کی تہذیب کا سب سے بڑا قدردان ہے۔ اس قومی انتشار کی ذمہ دار وہ روایت ہے جس کا آغاز سرسید کے زمانے سے ہوا۔ اس کے مقابلے میں ہندو کو دیکھئے، اس نے مغربی علوم و فنون سے اپنے ذہن کو جلا دی اور اپنی ہزار ہا سال پرانی تہذیب کو حیات نو دینے کی فکر میں لگ گیا۔ (ایضاً ص ۲۰۹)

راجہ شیر زمان

تہذیب کے علم بردار کی اپنی تہذیب کی مثال:

...... وہ بشمول تعلیم کے ایسی پالیسی پر عمل پیرا تھے جس سے انگریز استعمار کو تقویت ملے اور ہندوستانی ان کے غلبہ کو ذہنی لحاظ سے اور شعوری طور پر تسلیم کر لیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے مغربی تہذیب اختیار کرنے کی تلقین کی، انگریزوں کو مہذب اور ہندوستانیوں کو غیر مہذب ثابت کیا تاکہ حکمرانوں کے ذلیل کرنے والے رویہ کو وہ اپنے غیر مہذب ہونے کے ناطے سے درست سمجھ کر اُف تک نہ کریں اور خود ان کے ظلم و ستم اور زیادتیوں کو برضا و رغبت قبول کرتے جائیں کیونکہ جب تک غیرت اور قومی حمیت کی حس تک عوام میں ختم نہ کر دی جائے اس وقت تک وہ وفادار رعایا نہیں بن سکتے، اس لئے وہ ہندوستانیوں کو بار بار یہ باور کراتے رہے کہ آپ پر غیر ملکی حکمران اللہ تعالیٰ نے اس لئے لا کر بٹھائے ہیں کہ وہ اخلاقی پستی او

رتہذیب کی گراوٹ کی وجہ سے جانوروں جیسے ہو گئے ہیں، اس لئے اب انہیں یہ قوم تہذ
دے کر مہذب بنانے کے لئے آئی ہیں، اس لئے ان کا آنا اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ یہ تہذیبِ
تہذیب کا نعرہ بھی انہوں نے انگریز کی پالیسیوں کی تائید میں کیا۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ
تہذیب یافتہ بنائے جانے والے عام لوگ نہ تھے بلکہ امرا اور زعما تھے جن کو زیرنگیں کرنا حکومت
کی پالیسی کا محور تھا چنانچہ نئی تہذیب کی ترویج کی کوششوں کے سلسلے میں انہوں نے جہاں
چند ایک بادشاہ زادوں کے کبوتر پالنے، طوطے اڑانے اور بٹیرے لڑانے کے حوالہ سے غیر ملکی
حکمرانوں کی آمد کو خدا کی رحمت ثابت کیا، وہاں انہیں کلبوں میں ناچنے اور شراب پینے والے
عیاش حکمرانوں میں کوئی تہذیبی برائی نظر نہیں آتی تھی۔ ان کے اپنے مہذب ہونے کا اظہار اس
طرح ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد کو نمک حرامی، بدمعاشی اور حرام زدگی سے تعبیر کرتے ہیں۔

(سرسید، جناح، مشرقی: ص ۱۶۔ ۱۷)

فکرِ سرسید سے منحرف علیگ حضرات کا جذبۂ حریت:

تعلیم یافتہ طبقہ نے آزادی کے لئے جو جدوجہد شروع کی، اس کا تمام سہرا سرسید
کے سر ڈالنا کسی طور پر بھی درست نہیں۔ اگر یہ منطق یا دلیل دی جائے کہ اگر علی گڑھ سکول کی
بنیاد نہ رکھی جاتی تو مسلمان تعلیم سے بہرہ رہتے اور زمانہ کے ساتھ نہ چل سکتے تو کانگرس کی بنیاد
ایک انگریز نے رکھی تھی، اس کو بھی آزادی کا ہیرو ماننا پڑے گا۔ یہ جماعت جو اس نے اپنے
مقاصد کے لئے قائم کی تھی بعد میں انگریزی راج کے خاتمہ کے لئے سرگرم عمل ہوگئی اور اپنے
بانی کی فکر سے منحرف ہوگئی۔ اور یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ جو نوجوان علی گڑھ میں داخل
ہوئے ان میں بیشتر ایسے تھے جنہوں نے انگریز کی غلط عادات و اطوار کو اپنایا۔ مذہب سے
بیگانگی، اپنی زبان، تہذیب و تمدن سے متنفر ہونا اور زبانی کلامی بحثیں، کاغذی انجمن سازی،
نمود و نمائش وغیرہ کی روش اپنالی جو آزادی تو کجا، غلامی اور پستی کی طرف لے جانے والے
اعمال ہیں جو انگریز کے مفاد میں تھے۔ مگر درخت کا ہر پھل میٹھا نہیں ہوتا، اس نرسری سے ایسے
بھی ہونہار فرزند پیدا ہو گئے جنہوں نے انگریزی تعلیم ضرور حاصل کی مگر اپنی قومی حمیت کو ترک
نہ کیا اور انگریز سے مرعوب ہونے کی بجائے ان کو آنکھیں دکھانے کی روش اختیار کرنی شروع

کردی جس میں مولانا محمد علی جوہر وغیرہ شامل تھے، اور سرسید کے ہم نوائی مفکرین کی نصیحت، پند کو بالائے طاق رکھ دیا۔ الغرض سرسید کی پالیسی بیس سال تک ہی چل سکی جب مسلمان سیاست سے الگ رہے مگر جذبۂ حریت کو زیادہ دیر تک سرسید کے فکر و فلسفہ کے زیر اثر معطل رکھنا ممکن نہ تھا۔ (ایضاً ص ۲۷)

پروفیسر شیر محمد گریوال

مسلمانوں کو اسلام سے دور لے جانے میں سرسید کا کردار:

سرسید کا تمام تر نظام فکر نقائص سے مبرا نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سرسید نے مسلمانوں کے ذہن تبدیل کرنے یعنی اُنہیں اسلام سے دور لے جانے میں وہ کردار ادا کیا جو عیسائی مشنری صدیوں میں نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی تمام تر جدیدیت مسلمانوں کو قرآن کے سائے تلے نہ رکھ سکی۔ اس کا سرسید کو خود بھی افسوس تھا۔ اسلام اور عیسائیت میں مطابقت پیدا کرنے کی سعی بھی بے سود رہی۔ سرسید کی قرآن اور بائیبل کی تفسیریں کوئی سند حاصل نہ کر سکیں اور اُن کے ''خطبات احمدیہ'' کو بھی تاریخی اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔ لوگ آج بھی ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کو ہی بطور حوالے کی کتاب کے پڑھتے ہیں جس کے جواب میں سرسید نے یہ خطبات لکھے تھے۔ سرسید دراصل معتزلہ کی روایات کے پرچارک تھے، معتزلہ بھی ناکام ہوئے اور سرسید بھی۔

(المعارف لاہور۔ اپریل ۱۹۹۳ء: ص ۶۶)

ڈاکٹر صدیقہ ارمان

لغزشیں:

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سرسید تحریک کا ردعمل محض چند رجعت پسند علما کی ضد تھی یا مشاہیر کا شوقِ خود آرائی۔ اس کا سب سے پہلا سبب تو یہ ہے کہ مخالفین میں سے بیشتر وہ لوگ تھے جو کسی نہ کسی منزل پر سید صاحب کے شریک کار رہے مثلاً مولوی سمیع اللہ، نواب محمد اسمٰعیل شبلی

نعمانی ہی بخش شرر وغیرہم۔ نواب محسن الملک نے بھی بعض نظریات وعقائد سے قطعی اختلاف کیا جبکہ وہ سید صاحب کے سب سے بڑے حامی و مددگار رہے۔ دوسرا سبب اس سے بھی زیادہ قوی ہے کہ مخالفین میں سے کوئی بھی جاہل، بے علم یا ناواقف محض نہیں تھا بلکہ اپنے عہد کے متاز علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ نہ ہی یہ لوگ بدخواہ قوم تھے، احکام الٰہی کی تبلیغ و تدریس کے ذمہ داروں میں ان کے نام شامل تھے۔ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ سید صاحب نے اعتدال کی راہ کوئی مقامات پر ترک کر دیا اور انتہائی اقدام کو ترجیح دی۔ یہ بھی اپنی جگہ ایک بڑی حقیقت ہے کہ موصوف نے ان معاملات میں مداخلت کی جواُن کے دائرہ کار میں آ گئے مگر ان کی دسترس سے باہر تھے، مشرق اور مغرب کے مزاج کو ہم آہنگ کرنا چاہا جو بعض بنیادی اختلافات کی بنا پر ممکن ہی نہیں، اپنے اخلاص کے زعم میں بہت سے ایسے نزاعی مسائل میں الجھ گئے جن سے صرفِ نظر بہتر ہوتا، گوکہ دشوار۔

(سرسید تحریک کا ردعمل: ص ۱۴)

مخلص رفیقوں سے بھی ردِّعمل میں انتہا پسندی:

بہ ایں ہمہ سید صاحب کے لب ولہجہ کو درست قرار دینا ان کی لغزشوں سے چشم پوشی کے مترادف ہوگا، اس لئے کہ یہاں مخالفت اسی نوعیت کی نہیں جیسی کہ اب تک مختلف اطراف سے ہوتی رہی تھی، بلکہ یہ ان نفوس کی جانب سے تھی جو تحریک کی ابجد سے سرسید کے ہمدم رہے۔ مخالفتوں، مخاصمتوں اور اتہامات کے وار انہوں نے بھی سہے اور سید صاحب کے حوصلوں کو مضبوط کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ رہا۔ خود سید صاحب نے ان حضرات کی محبت، ان کی خدمات، ان کے اخلاص و بے ریائی اور ان کی وفاداریوں کا اقرار بھی کیا اور تحسین بھی کی۔ ایسے حضرات نے اگر کسی مسئلے پر اختلاف کیا تھا تو سید صاحب کو اتنی ہی سنجیدگی اور غیر جذباتی انداز سے غور کرنا چاہیے تھا۔ یہ ان جیسے باوقار آدمی کے لئے بہتر ہوتا اور مذکورہ حضرات کی خدمات کے صلہ میں ردعمل کا بھی یہی تقاضا تھا۔ یہاں موصوف کا جذباتی رویہ کہ فرانس جا کر ڈوئل لڑنے کی دھمکی دینا یا مقامات مخصوصہ سے ان کے کندہ ناموں کو مٹانے کا ارادہ یا ذکر کرنا جذباتی رویہ ہے اور اتنے ''بڑوں'' کے جذباتی رویے ہی ان کی لغزش بن جاتے ہیں۔ (ایضاً ص ۱۱۵)

سرسید کی تاویلوں کے رد میں جرأت مند تحریریں:

سید احمد نئے دور کی وکالت کے زعم میں دوسری حد کو چھونے کے مرتکب ہوئے کہ قرآن کے بعض بنیادی احکامات کی تاویل نئے زمانے سے ہم آہنگ کرنے میں خود کو حق بجانب تصور کرنے لگے۔ اس کشاکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفین نے اپنے اختلاف کا آغاز اسی مفروضہ پر کیا کہ سید احمد مسلمان نہیں رہا۔ اس مفروضہ میں جان اس وقت پڑی جب سید صاحب نے ملائک، معجزات، افلاک، شیطان کے علیحدہ وجود وغیرہ سے انکار کر کے اس کی مختلف تاویلیں پیش کیں۔ اس میں دو آرا نہیں ہو سکتیں کہ یہ سید احمد کی ایسی لغزشیں ہیں جن پر کوئی مفاہمت نہیں ہو سکتی اور ان کے رد پر جتنی بھی تحریریں وجود میں آئیں وہ نہ صرف حق ہیں بلکہ اپنے دور کے تناظر میں بہت بڑی جرأتیں ہیں اور اس بات کی دلیل بھی ہیں کہ چودہ سو سال کے عرصہ میں کبھی وہ دور نہیں آیا جب ''مسلمان'' نے یہود و نصاریٰ کی طرح اپنی ''کتاب'' میں ''تحریف'' کی راہ کو ہموار ہونے دیا ہو۔ (ایضاً: ص ۳۱۸)

انگریزی تہذیب سے مرعوبیت:

دینی مسائل کے علاوہ کچھ اختلافات سماجی اور تہذیبی نوعیت کے تھے جن میں سرفہرست انگریزی تہذیب سے مرعوبیت ہے۔ سید صاحب کے بہت سے اقوال و اعمال یہ ثابت بھی کرتے ہیں کہ وہ انگریز کو تہذیبی، تمدنی، علمی، اخلاقی اور معاشی اعتبار سے دنیا کی موجودہ اقوام میں بہترین قوم تصور کرتے تھے۔ لندن کا سفر نامہ اور قیام لندن کے زمانے کے خطوط بالخصوص ان کے اس رجحان کے گواہ ہیں۔ دیگر تحریروں میں بھی ایسے رجحانات مل جاتے ہیں جو یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ سید صاحب اس قوم سے بہر حال مرعوب تھے۔ ''اسباب بغاوت ہند'' سے لے کر ''تہذیب الاخلاق'' کے آخری دور تک کی تحریریں اس بات کی شاہد ہیں کہ انگریز قوم کے لئے وہ ایک نرم سا گوشہ رکھتے تھے جو بہر حال کبھی پوشیدہ نہ رہا۔ اس کی وجوہ کچھ بھی ہوں لیکن چونکہ سید صاحب اس مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں ان کا کوئی قول اور فعل ان کی ذات تک محدود نہ رہا تھا بلکہ ان کا ہر لفظ اور عمل ردعمل کی کسوٹی پر کسا جاتا تھا کیونکہ

اس کی حیثیت ذاتی نہیں ،قومی سطح کی تھی اس لئے ان کا یہ نرم سا رویہ ہمیشہ مورد الزام

(ایضاً ص ۳۲۶)

صفدر امام قادری

جدید تعلیم کی توسیع میں فکر سرسید کی حدود:

مسلمانوں میں جدید تعلیم کی توسیع کے حوالے سے سرسید کی خدمات بلاشبہ غیر معمولی اور بیش قیمت ہیں لیکن یہ سوچنا درست نہیں کہ صرف سرسید کے اثر سے مسلمانوں میں جدید تعلیم کو فروغ حاصل ہوا۔ اس معاملے میں سب سے زیادہ اہمیت اس عہد کے تاریخی دباؤ کی ہے کیونکہ ایک ساتھ سینکڑوں طرح کی کوششیں اس زمانے میں یہاں وہاں ہو رہی تھیں۔ مسلمانوں میں سرسید کے بغیر بھی جدید تعلیم کو بہر طور پھیلنا تھا۔ سرسید نے تعلیم کے لئے ملا۔ عام میں اگر چہ حدیں قائم نہیں کیں لیکن اُن کی ترغیب اور ترجیح بالعموم اعلیٰ اور متوسط طبقے کے لئے رہی۔ نئے مواقع کے حصول میں ان طبقوں کی سوجھ بوجھ برحق، لیکن یہ دیکھنے کی ضرورت بھی ہے کہ سرسید کہیں خود بھی بعض تحفظات کے اسیر تو نہیں ہو گئے تھے؟...... دیکھنا یہ چاہئے، سماج کے سب سے بڑے غیر تعلیم یافتہ اور ترقی کے مواقع سے محروم طبقے یعنی خواتین کی تعلیم کے تعلق سے سرسید کیا سوچتے تھے اور اس معاملے میں ان کا مجموعی رول کیا ہے؟...... بہت سے پرانے ذہنی تحفظات کی پرچھائیں سرسید کی ان تاویلات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ بات کھل کر ہے کہ وہ کس طرح معاملات کو سامنے سے ہٹا کر پیچھے کی طرف دھکیل دیتے ہیں اور عورتوں کی حالت کو اطمینان بخش تصور کر لیتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سرسید جیسے بیدار مغز اور روشن خیال تعلیمی مفکر نے عورتوں کی آئندہ ترقیوں اور امکانات کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ ایجوکیشن کمشن کو انہوں نے یہ صلاح بھی دی تھی کہ اسے مزدوری پیشہ افراد کی تعلیم پر غور کرنے کی یکسر ضرورت نہیں، آج ان کا یہ قول بھی ہمیں نئے سرے سے ان کے تصورات کے جائزے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ ضرور ہوا کہ سرسید کی وفات کے فوراً بعد ہی کم از کم عورتوں کی تعلیم کے معاملے میں سرسید کے رفقا نے سرسید کے بتائے ہوئے راستوں سے خود کو الگ کر لیا

اور علی گڑھ میں تعلیم نسواں کی تحریک شروع ہوگئی سرسید کے اعتراضات کو پس پشت ڈال کر آخر کار مسلم ایجوکیشن کانفرنس نے ۱۹۰۰ء میں یہ انقلاب آفریں تجویز منظور کرلی کہ ''مسلمان لڑکیوں کی توسیع معلومات وترقی تہذیب کے لئے ایسا سہل نصاب تیار کیا جائے جس میں دینیات کے علاوہ ابتدائی حساب، تاریخ، جغرافیہ، طبیعیات اور اخلاق کی تعلیم ہووے''۔ غرض کہ سرسید کی عظیم الشان خدمات اور ان کے تصورات کی قدر وقیمت کے اعتراف کے باوجود ہمارا خیال ہے کہ تاریخ کے عمل اور انقلابات کی روشنی میں آج بھی ان کے محاسبے کی ضرورت ہے۔ سرسید کے بعد آنے والوں نے ان کی روشن خیالی، دور بینی اور حقیقت شناسی سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس عرفان کا تقاضا ہے کہ کہ ان کی فکر کی حدود کو بھی سمجھا جائے۔ بالفرض مسلم ایجوکیشن کانفرنس نے سرسید کے بعد بعض معاملات میں ان سے الگ ایک راہ نکالنے کی جسارت نہ کی ہوتی تو آج ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیمی اور سماجی حالت کیا ہوتی؟ مسلمان عورتوں کی تعلیم کا نقشہ کیا ہوتا؟ یہ سوالات ہمیں اپنے ماضی کو ایک نئے زاویے سے سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں۔

(جامعہ دہلی، جولائی تا دسمبر ۱۹۹۸ء، ص ۲۹۶ تا ۳۰۵)

ضیاء الحسن فاروقی

سرسید کے عزائم کا المیہ:

سرسید احمد خاں نے مدرسۃ العلوم کے قیام کے ساتھ ہی ایک آزاد مسلم یونیورسٹی کے قیام کا خواب بھی دیکھا تھا، لیکن انسان خواہ کتنا ہی نصب العین اپنے سامنے رکھے اور خواہ کتنا ہی دلکش ودلفریب خواب دیکھے، ضروری نہیں کہ اس نصب العین کی تکمیل یا اس خواب کی تعبیر اس کے سوچے ہوئے نہج کے مطابق ہی ہو۔ سرسید مرحوم کے عزائم کا المیہ یہی تھا کہ ''علی گڑھ'' اپنی تمام بڑائیوں، خوبیوں اور کامرانیوں کے باوجود ان کے خواب کی سچی تعبیر نہ ثابت ہو سکا۔

(مولانا ابوالکلام آزاد — فکر ونظر کی چند جہتیں، ص ۳۸)

مسلمانوں کی عملی زندگی میں قدیم وجدید کی تفریق:

ہمارے خیال میں علی گڑھ کی کمزوری یہ تھی کہ اس نے جدید تہذیب کو بغیر کسی نقد اور جانچ کے اپنا لینا چاہا، اگر چہ اس کے بانی نے تعقل اور تفکر کی راہ دکھا دی تھی جس پر استقامت کے ساتھ غور وفکر کا سلسلہ جاری رہتا تو تعلیم یافتہ مسلمانوں کی عملی زندگی میں قدیم جدید کی وہ تفریق پیدا نہ ہوتی جو انجام کار تہذیب اسلامی کی حقیقی نشاۃ ثانیہ کی راہ کا سنگ گراں بن گئی۔ اقبال نے مسلمانوں کے اس تہذیبی بحران کا راز پالیا تھا لیکن دیگر اسباب کے علاوہ سیاست کی ہنگامہ آرائیوں میں اقبال کا مذہبی فکر دب کر رہ گیا اور مولانا آزاد کے مذہبی تہذیبی فکر کو، جو اصلی علی گڑھ تحریک کی توسیع تھی، علی گڑھ نے اس لئے قبول نہیں کیا کہ سیاست میں اس کا مسلک علی گڑھ والوں سے مختلف تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کا یہ بڑا المیہ ہے کہ ان کا تعلیم یافتہ متوسط طبقہ، جس کی سیاسی قیادت کو ایک خاص مرحلے پر علما اور صوفیا کی ایک بڑی تعداد نے تسلیم کر لیا تھا، مذہبی معاملات میں تو قدامت پسند رہا لیکن تعلیم وتہذیب میں اس نے یہ حوصلہ کیا کہ ترقی پسند کہلائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے اس طبقے کی اجتماعی شخصیت میں، جسے قائدانہ کردار ادا کرنا تھا، ایک قسم کا دورخا پن پیدا ہو گیا جو آج تک ان کی مذہبی، تہذیبی اور سیاسی، غرض پوری اجتماعی زندگی کا اہم مسئلہ بنا ہوا ہے۔

(اسلام اور عصر جدید نئی دہلی، جنوری ۱۹۹۵ء، ص ۱۲-۱۳)

ضیاء الدین لاہوری

تذکرہ ہائے سرسید میں تضاد اور بد دیانتی:

مطالعہ سرسید کے دوران بعض ایسے مقامات آتے ہیں جہاں قاری سخت الجھن میں پڑ جاتا ہے۔ وہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ مضمون نگار یا مؤلف کی زیر مطالعہ باتوں پر یقین کرے یا اس کی کسی دوسرے موقع کی متضاد تحریر کو سچ مانے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی خاص مسئلے کے ضمن میں سرسید کے کارنامے کے طور پر بیان کردہ اس کا تجزیہ درست ہے یا اس کارنامے کے

رز میں سر سید کا بیان قابلِ قبول ہے۔ جب وہ قومی نقطہ نظر سے لکھی گئی تاریخ کی باتوں کا سر سید کے اقوال و اعمال کے ساتھ موازنہ کرتا ہے تو انہیں ایک دوسرے کی ضد پا کر پریشان ہو جاتا ہے۔ میں اپنے تعلیمی نصاب کے شکار اس معصوم قاری کی بات نہیں کر رہا جو ہمارے موجودہ تعلیمی ماحول میں مخصوص حلقوں کی ہر بات تسلیم کرنے پر مجبور ہے، میرا مطلب اس قاری سے ہے جو مطالعہ کرتے ہوئے اپنے ذہن سے، ہاں -- اپنے ذہن سے، سوچتا ہے اور موضوعات سے متعلق سیاق و سباق کو بھی مدنظر رکھتا ہے۔ مگر چونکہ وہ بھی تعلیمی نصاب کی تکمیل کے مراحل سے گزر کر اس مقام تک پہنچا ہے اور یوں اجتماعی ذہنی ڈھلائی کے غیر محسوس عمل کے زیر اثر بھی رہا ہے اس لئے آزادانہ سوچ کے آغاز میں اس کی پریشانی ایک قدرتی امر ہے۔ یہ کیفیت اسے اصل ماخذ کی ورق گردانی پر آمادہ کرتی ہے اور تمام حالات پر غور کر کے وہ بالآخر حقائق تک پہنچ ہی جاتا ہے۔ اس کے برعکس نصاب زدہ قاری اس تردد میں پڑنے کی زحمت گوارا کرنا ضیاع اوقات سمجھتا ہے اور کولھو کے بیل کی مانند موجودہ نصاب کے کھونٹے کے گرد چکر لگاتے رہنے ہی کو فخر سمجھتا ہے۔ سہل پسندی اسے تحقیق کی طرف متوجہ نہیں کرتی۔ اگر وہ اپنا نام خود ساختہ دانش وروں کی فہرست میں شامل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کا تعصب مزید قوی ہو جاتا ہے
۔اس صورت میں اس کے سامنے بے شک حقائق کا انبار لگا دیا جائے تو اس کا تعصب مزید قوی
ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اس کے سامنے بے شک حقائق کا انبار لگا دیا جائے، وہ اپنے تعصب کو ذہن سے نہیں نکالتا بلکہ رٹے رٹائے جملوں سے ان پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ سر سید احمد خاں کی شخصیت اور ان کے افکار پر بے شمار مقالے لکھتا ہے، کتابیں تالیف کرتا ہے مگر ان کی اہم تصانیف کا مطالعہ تو کجا، انہیں ہاتھ لگانے کی بھی نوبت نہیں آنے دیتا کیونکہ اس موضوع پر جو کچھ اس کے ذہن میں پختہ ہو چکا ہے وہی اس کا علم اول تا آخر ہے۔ وہ اسے ہی مکمل سمجھتا ہے اور مزید مطالعے کو اپنی توہین سمجھتا ہے لہٰذا اس کی تمام ''تخلیقات'' الفاظ کے الٹ پھیر سے گھوم پھر کر ایک ہی مخصوص نکتے پر آن جمع ہوتی ہیں۔ اس کا محدود علم ہی اس کی دانش وری کی بنیاد ہے اس لئے وہ حقائق قبول کر کے اپنی دانش وری کو داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ اسے خدشہ ہوتا ہے کہ اس طرح اسے اپنی سابقہ تحریروں کا رد کرنا پڑے گا اور اس کی ''قدر و قیمت''

نہیں رہے گی۔ حقائق کو قبول نہ کرنے کے سبب اس کی تحریروں میں تضاد جنم لیتا ہے مگر وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی لاعلم رہنے ہی میں اپنی ''عافیت'' سمجھتا ہے یا پھر ''میں نہ مانوں'' کی گردان الاپتا رہتا ہے۔

(نقش سرسید: ص ۱۶۱۔۱۶۲)

سرسید کے متروک خیالات پر ان کی شخصیت کی تعمیر کا شوق پورا کرنا، ان کے اصل افکار پر پردہ ڈالنا اور نقاب کشائی ہو جانے کی صورت میں الفاظ کے مطالب کو خواہ مخواہ کھینچ تان کر اپنے مطالب سے ہم آہنگ کرنا، ایک موقع کے بیان کو کسی دوسرے موقع سے منسوب کر کے اس سے خود ساختہ نتائج اخذ کرنا، سیاق و سباق کے بغیر سرسید کی تحریروں سے چند فقرے منتخب کر کے غلط صورتِ حال تخلیق کرنا یا اقتباس پیش کرتے ہوئے درمیان میں سے کوئی اہم فقرہ حذف کر دینا سرسید کے شیدائیوں کا محبوب مشغلہ ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر بعض افراد تو اپنے ممدوح کے دفاع کی خاطر ان کی تحریروں میں تحریف کا بھی ارتکاب کرتے ہیں۔

(ایضاً ص ۱۷۶)

خود ہی قاتل اور خود ہی نوحہ گراں

بدگمانی وہ غلط خیال ہے جو دل میں کسی وجہ سے دوسرے کے خلاف پیدا ہو جائے۔ یہ بدگمانی نہیں، حقیقت تھی اور انگریزوں کے لئے ڈھکی چھپی بات نہ تھی کہ مسلمانوں نے اس لڑائی (۱۸۵۷ء) میں بھرپور حصہ لیا تھا۔ جب ایک فریق دوسرے کا براہ راست نشانہ بنے تو اس مقابل کے عزائم کو بدگمانی کیونکر خیال کر سکتا ہے؟ دراصل انگریز مسلمانوں سے اس لئے خائف تھے کہ یہ قوم اس ملک پر سینکڑوں سال حکمران رہنے کے باعث خود کو حکومت کا حق دار اور اہل سمجھتی تھی۔ انہیں خدشہ تھا کہ مسلمان ان کے لئے کسی وقت بھی خطرہ بن سکتے ہیں۔ مسلمانوں کا اس جنگ میں پیش پیش ہونا اور دہلی کے مغل دربار کو اس کا مرکز بنانا اس بات کا سب سے بڑا ثبوت تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ظلم و جور اور خوف و ہراس ان کی صلاحیتوں کی راہ میں عارضی طور پر تو رکاوٹ بن سکتے ہیں مگر انہیں مکمل طور پر ختم نہیں کر سکتے۔ بالآخر ان کے دور اندیش دماغ نے سوچا کہ اگر یہ کام مسلمانوں ہی میں موجود اپنے با اعتماد خیر خواہوں کو سونپ دیا

جائے تو دیر پا ثابت ہوگا۔ پس انہیں ایسے باصلاحیت ''شرفا'' کی تلاش ہوئی جو قوم کے ہمدرد بن کر ان کے دلوں سے حکومت کی خواہش اور انگریز مخالف جذبات نکال سکیں۔ اس مقصد کے لئے سرسید نے اپنی خدمات رضا کارانہ پیش کیں اور وفادار ٹولے کے چند ''نیک نام'' افراد کو ساتھ لے کر مسلمانوں کو امن کی تلقین کرتے ہوئے انگریزوں کی وفاداری کا درس دینے لگے۔ ان کی تحریروں اور تقریروں میں جذبات کا سخت عمل دخل رہا۔ ان میں قوم کے نوحے بھی شامل تھے اور روشن مستقبل کی امیدیں بھی۔ شاید سرسید کے شیدائی اس حکمتِ عملی کی وضاحت نہ کر سکیں کہ پہلے اپنے ہی گھناؤنے کردار سے مسلمانوں کو تباہی و بربادی کے کنارے پہنچایا جائے اور پھر ان کا ہمدرد بن کر رونے دھونے کا دھندا شروع کر دیا جائے۔ (ایضاً: ص ۱۴۳)

انگریز پرستی کا عمل اور ''وقت کا تقاضا'' کی راگنی:

سرسید کی انگریز پرستی کا عمل ان کے آخری سانس تک جاری رہا۔ قومی فلاح کے نام پر ان کے تجویز کئے گئے تمام تعلیمی، سماجی اور سیاسی منصوبوں میں یہ نقش نمایاں طور پر موجود ہے۔ یہ تسلیم کہ جنگِ آزادی کی ناکامی کے فوراً بعد غیر ملکی حکمرانوں کے ساتھ مفاہمت کا رویہ اختیار کرنا مصلحت وقت تھی اور ایسا ہونا ہر اس جنگ کے بعد کا مجبوری تقاضا ہوتا ہے جس میں فاتح کو مفتوح کے ملک پر مکمل کنٹرول حاصل ہو، تاہم اس صورت میں شکست خوردہ فریق کو ہمیشہ کے لئے بنیادی حقوق سے دست بردار ہونے پر آمادہ کرنا انسانیت کی تذلیل ہے اور مفتوح قوم کا اس پر آمادہ ہو جانا اس کی بے غیرتی کی دلیل ہے۔ یہ امر مدنظر رکھا جانا نہایت ضروری ہے کہ عہد سرسید ان کے انتقال ۱۸۹۸ء تک پھیلا ہوا ہے۔ ۱۸۵۷ء سے اس وقت تک چالیس سال سے زیادہ کا وقفہ ہے۔ اس دوران حالات بہت حد تک بدل چکے تھے۔ وقوعہ ۱۸۵۷ء کے منفی اثرات زائل ہو چکے تھے، کرۂ ارض کے متعدد ممالک میں بدلتے ہوئے سیاسی حالات سے متاثر ہو کر ہندوستان میں بھی آزادی کی نئی تحریکیں جنم لے چکی تھیں، سیاسی حقوق کے حصول کی جدوجہد زوروں پر تھی اور عوام بلاخوف وخطر اس میں شرکت کرنے لگے تھے مگر سرسید تادم آخر انگریزوں کی تعریف میں رطب اللساں رہے۔ وہ ان کی حکومت کے استقلال اور دوام کی دعائیں کرتے رہے اور اسے استحکام بخشنے کے لئے انہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں

وقف کئے رکھیں۔ یقین کیا جاسکتا ہے کہ اگر سرسید کا انتقال ۱۸۹۸ء کی بجائے ۱۹۴۷ء میں ہوتا تو بھی ان کی عظمت عملی یہی رہتی اور ہمارے دانش ور بھی اس کے جواز میں "وقت کا تقاضا" راگنی الاپتے رہتے۔ دراصل اندھی عقیدت انسان کے فہم و ادراک کو مکمل طور پر اپنے قبضے میں لے لیتی ہے اور اس بے بسی میں دلائل کی کوئی وقعت نہیں رہ جاتی لہٰذا ان لوگوں سے تو قبول کرنے کی توقع رکھنا عبث ہے۔ جب اس طبقہ سے کوئی جواز بن نہیں پڑتا تو بعض دوسرے مشہور لوگوں کا حوالہ دے کر کہتے ہیں کہ اس حمام میں سبھی ننگے تھے۔ سیدھی سی بات ہے کہ اس وقت کے اور نامور "شرفا" بھی انگریز پرستی کا شکار تھے تو یہ قومی خدمت کا کوئی معیار نہیں بن جاتا اور نہ اسے وقت کا تقاضا قرار دیا جاسکتا ہے۔ (ایضاً ص ۱۴۳۔۱۴۴)

طاہر نسیم

روحانی قدریں مادی قدروں کے تابع:

قدیم عقائد رکھنے والے اور روایتی مسلمان، جو دراصل اسلام کے صحیح محافظ تھے سرسید سے خوش نہ تھے، اس لئے کہ سرسید نے اپنی تفسیر القرآن میں اور دوسرے مذہبی مضامین میں اسلام اور اس کے عقائد کے متعلق عقل پسندی کا ایسا راستہ اختیار کیا جس سے مسلمانوں کے بحرِ عقائد میں عجیب قسم کا مدوجزر پیدا ہوگیا تھا۔ سرسید نے اس تفسیر میں ان مسائل کو جنہیں دورِ جدید کا مفکر اپنی فکر پر انحصار کی بنا پر نہ سمجھ سکتا تھا، فکر ہی کی بنا پر سلجھانے اور سمجھانے کی کوشش کی جس کے سبب وہ کئی جگہ لڑھک گئے۔ ..... سرسید کے خیالات کے رد میں اُن ہی کے زمانے میں تفسیر حقانی جیسی تفسیریں بھی لکھی گئیں، علما نے تقریروں اور تحریروں کے ذریعے بھی اس سیلاب کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی لیکن عقلیت اور عقل پرستی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے یقینی اور مادہ پرستی کے رجحان کو کلیتاً روکنا مشکل ہوگیا۔ سرسید احمد خاں کی تفسیر کے یک جائی خیالات و افکار ان کے ان مقالوں میں ٹکڑے ہو ہو کر ملتے ہیں جو رسالہ تہذیب الاخلاق میں چھپتے رہے۔ یہ مضامین ہنرمند صحافی کے اداریوں کی طرح جامع اور ہمہ گیر تھے، مسلمانوں کے لئے انقلاب آفریں ثابت ہوئے۔ ان مضامین نے مسلمانوں کو دینی اور روحانی

سمت سے ہٹا کر تہذیبی، تعلیمی، اخلاقی، عقلی اور مادی سمت پر ڈال دیا۔ مجموعی طور پر ان سے یہ تاثر ملتا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی اصل قدریں مادی ہیں، روحانی قدریں اس کے تابع ہیں اور وہی مذہبی عقائد وافکار درست ہیں جو عقل وفکر کی گرفت میں آجائیں۔ سرسید نے اس کے لئے ''ترقی'' کا لفظ اختیار کیا ہے۔ اسی ترقی کی اصطلاح کو پھیلا کر جدید ترقی پسندی بساط اسلام پر رقص کررہی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ بجا طور پر کہتے ہیں کہ اگر سرسید کی یہ فکری اور نیچری تحریک نہ ہوتی تو مرزائیت یا چکڑالویت یا اس نوع کی دوسری تحریکوں یا فرقوں کا وجود بھی نہ ہوتا۔

(سرسید اور اردو صحافت: ص ۱۹۳۔۱۹۴)

مسلمانوں کی تہذیب کو رگیدنے کا عمل:

سرسید نے تہذیب پرستی کی دھن میں مسلمانوں کے رسم ورواج اور طور طریقوں پر شدید حملے کئے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ مسلمانوں نے ان آداب کا جو اللہ اور اس کے رسول نے ان کو سکھائے تھے، اس دور کے معاشرے میں کلی عمل دخل نہیں رکھا تھا جس کے کئی سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی وجوہ تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں کی تہذیب کو رگیدا جائے اور مغربی تہذیب کے طور طریقوں کو فلاح دارین کا سبب بنا کر پیش کیا جائے۔ (ایضاً: ص ۱۹۶)

دین سے بے رغبتی کی ترویج:

انہوں نے مسلمانوں کے مسلمہ عقائد وحقائق پر توہمات اور باطل کی مہر لگا کر خود اپنے ہی خلاف ایک زبردست محاذ کھول دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرسید جیسا شخص، جو معاشرے کی اصلاح کی پوری پوری اہلیت رکھتا تھا، اپنی اصلاحی تحریک کو صحیح نتائج تک نہ پہنچا سکا۔ کچھ لوگ ان افکار سے گلوخلاصی کرانے میں ضرور کامیاب ہوئے جنہیں سرسید توہمات کہتے تھے، لیکن ایسے لوگ خود دین کے بارے میں بھی شکوک وشبہات میں مبتلا ہوگئے یا ان کی دین کے ساتھ محبت میں کمی پیدا ہوگئی اور وہ دین پر اس طرح ثابت قدمی سے قائم نہ رہ سکے جس طرح اندھی تقلید والا مسلمان قائم ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو زمانے کی ہوا نے جس طرف چاہا موڑا اور یہ کام ان کے اعتدال پسند اور عقل پرست ہونے کی بنا پر زمانے کے لئے کچھ زیادہ مشکل بھی ثابت نہ ہوا۔ (ایضاً: ص ۱۹۷)

سید طفیل احمد منگلوری

اصلاح معاشرت کی بحثوں کا مخالفانہ ردعمل:

سرسید نے اصلاح معاشرت کے سلسلہ میں بکثرت مضامین، کھانے اور لباس کے متعلق، شائع کئے جن میں قدیم طریقوں کا مضحکہ اڑایا جاتا تھا..... عیسائیوں کے ساتھ کھانے پینے میں چونکہ اُن کا ذبیحہ مانع تھا اس لئے سرسید نے مسلمانوں کے لئے گردن مروڑی مرغی کھانا آیات واحادیث سے جائز قرار دیا۔ جوتا پہن کر نماز پڑھنا عام طور پر معیوب تھا۔ کھڑے ہو کر پیشاب کرنا اور ڈاڑھی منڈانا گناہ سمجھا جاتا تھا، ان سب چیزوں کے جواز کو سرسید نے مذہب سے ثابت کرنے کی کوشش کی اور قبل اس کے کہ مسلمانوں کی تعلیم اور ان کی حقیقی ترقی کے لئے دوسرے ذرائع اختیار کئے جاتے، اس قسم کی بحثوں سے سرسید سے مسلمان بالعموم بھڑک گئے۔

(مسلمانوں کا روشن مستقبل: ص ۱۹۲، ۱۹۵)

مذہبی امور میں تجاوز سے شرمناک صورت حال:

مسلمانوں کے مذہب کی خصوصیت جمعیۃ اور جماعت ہے اور اُن کے ہاں انفرادی عبادت صرف مجبوری کی حالت میں کی جاتی ہے مگر سرسید مسلمانوں کے مذہبی اجتماعات سے نہ صرف علیحدہ رہتے تھے بلکہ خوشی کے مواقع پر بھی مسلمانوں کے مفلس اور جاہل ہونے کا سوگ مناتے تھے اور عید کے دن کبھی کبھی مسلمانوں کی بربادی کے متعلق مضامین لکھتے تھے جن میں روزہ رکھنے والوں اور تراویح پڑھنے والوں کا مضحکہ اُڑایا جاتا تھا..... سرسید کو عمل یا عبادت کے ذریعہ مسلمانوں کی جمعیۃ قائم رکھنے طرف توجہ نہ تھی۔ وہ ذہانیت اور ذہنیت دونوں اعتبار سے عالم مسلمانوں سے اس قدر زیادہ بلند تھے کہ مذہبی امور میں نہ صرف یہ کہ ان کے برابر کوئی شخص چل نہ سکتا تھا بلکہ اُن کے پیچھے رہ کر بھی ساتھ نہ لگ سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کے تعلیمی مشن کے ساتھیوں اور دوستوں میں سے، بجز ایک دو کے کوئی ان کی مذہبی اصلاح کے کام سے متفق نہ

تھا بدقسمتی سے مذہبی امور میں تجاوز کرنے سے ان کی مخالفت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ علما اور مشائخ کے ساتھ کشاکش میں دونوں طرف دماغی توازن باقی نہ رہا اور سرسید نے اس زمانہ کے علما سے گزر کر تمام قدیم مفسرین کی روایات کو لغو اور بیہودہ قرار دیا اور انہیں علمائے یہود کا نہ صرف مقلد بلکہ اُن سے ایک قدم آگے بڑھا ہوا بتایا اس کشاکش نے ایک ایسا لٹریچر پیدا کر دیا تھا جو دونوں کے لئے شرمناک تھا۔ اس سے بظاہر فریقین کو اور دراصل کل قوم کو نہایت نقصان پہنچا۔ علما کے اعتراضات سے سرسید کی تعلیمی تحریک عام مسلمانوں کے نزدیک مشتبہ ہوگئی اور سرسید کے اعتراضات سے علمائے متقدمین اور متاخرین کی وقعت سرسید کے متبعین کے دلوں سے اُٹھ گئی۔ مسلمانوں کا ماضی ان کی نظروں میں تاریک ہوگیا۔ ان امور سے علمائے دین کا اثر قوم پر سے اٹھ گیا اور حکام وقت کو مسلمانوں کی کل جماعت سے اندیشہ کی کوئی بات باقی نہ رہی جس کی انہیں عرصہ دراز سے تمنا تھی۔ یہ حالت پیدا ہو جانے کے بعد سرسید کی تعلیمی تحریک نے مجوزہ مدرستہ العلوم کی شکل اختیار کر لی۔ (ایضاً ص ۱۹۶ تا ۱۹۸)

پروفیسر ظفر احمد نظامی

کانگرس مخالف سرگرمیاں اور ''سر'' کا خطاب:

نیشنل کانگرس کے پہلے دو اجلاسوں میں جو تجاویز منظور کی گئی تھیں ان میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ فوجی اخراجات میں تخفیف کی جائے، وائسرائے اور گورنروں کی کونسلوں میں توسیع ہو اور منتخب نمائندوں کا اضافہ کیا جائے اور سول سروس کے امتحانات ہندوستان میں بھی ہوں۔ لکھنؤ میں منعقدہ محمڈن ایجوکیشنل کانگرس سے خطاب کرتے ہوئے سرسید نے ان تینوں مطالبات کو مسترد کر دیا اگرچہ ان مطالبات کی حمایت میں وہ پہلے پیش پیش تھے۔ انہوں نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا اصل سبب یہی قرار دیا تھا کہ کمپنی نے ہندوستان کے لوگوں کو انتظامی اور قانون ساز مجالس سے دور رکھا تھا۔ انہوں نے سریندر ناتھ بنرجی کے اس مطالبے کی بھی زبردست حمایت کی تھی کہ سول سروس کے امتحانات کا مرکز ہندوستان میں بھی قائم ہو لیکن چونکہ وہ اب نیشنل کانگرس کے پلیٹ فارم سے کئے گئے تھے، سرسید نے ان کی شدید مخالفت کی۔ اسی

اجلاس میں سرسید نے بنگالیوں کی بھی مذمت کی جو اس نیشنل کانگرس کے قیام کے سلسلے میں ...
پیش رہے تھے۔ ان کی اس تقریر کو مسٹر تھیوڈور بیک نے نمک مرچ لگا کر ملک کے ...
اخبارات میں شائع کرایا تا کہ اس کی تشہیر میں کمی نہ رہ جائے۔ سرسید کو اپنے خیالات کی ...
اور نیشنل کانگرس کی مخالفت کرنے کے لئے بہت سے ہم نوا مل گئے جن میں راجپوتانہ میں ...
جنرل کے ایجنٹ سرلیپل گریفن اور صوبہ ہائے متحدہ کے لیفٹیننٹ گورنر سرآک لینڈ کالون ...
شامل تھے۔ بعد ازاں اُن میں وائسرائے لارڈ ڈفرن کا اضافہ بھی ہوگیا جنہوں نے خود ...
کانگرس کے قیام کے سلسلے میں بڑی مثبت کوششیں کی تھیں۔ انگریزی اخبارات پاینیر ...
ٹائمز نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ سرسید کو نیشنل کانگرس کے خلاف اظہار خیال کے سلسلے میں
حکومت کی تائید حاصل تھی کیونکہ لکھنؤ میں تقریر کرنے کے بعد تیسرے ہی دن نئے سال کے
اعزازات کی فہرست میں سرسید کا نام بھی شامل تھا جس میں اُنہیں نائٹ ہڈ سے نوازا گیا تھا۔
ایک ہندوستانی اخبار نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

''سرسید ہمارے دشمنوں کے آلہ کار بن گئے ہیں۔ جن خیالات کا انہوں نے اظہار کیا ہے وہ یکسر ہندوستانی نوکر شاہی کے خیالات ہیں۔ ان کی لکھنؤ کی تقریر نے ان کی نیک نامی پر سرے سے پانی پھیر دیا ہے۔ نائٹ ہڈ اور آرڈر آف دی ایمپائر کے اعزازات انہیں بروقت ملے ہیں۔ یہ سرسید ہی جیسے لوگوں کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔ ان کا نام آج تمام ہندوستانیوں میں نشان ملامت بن گیا ہے.....''

(جامعہ نئی دہلی، جولائی تا دسمبر ۱۹۸۸ء، ص ۲۱۸۔۲۱۹)

سرسید کی کانگرس مخالف سرگرمیاں جاری رہیں اور انہوں نے ہر سطح پر اپنی مہم کو
کامیابی سے ہم کنار کرنے کی کوشش کی۔ انہی کوششوں میں ایک آخری کوشش دسمبر ۱۸۹۳ء میں
''محمدن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا'' کے قیام سے منسوب کی جاسکتی ہے۔
اس کے مندرجہ ذیل تین مقاصد تھے:

ا۔ انگریز قوم اور حکومت کے سامنے مسلمانوں کے نقطہ نظر کو پیش کرنا اور ان کے
سیاسی مفادات کا تحفظ کرنا۔

۲۔ عام سیاسی ایجی ٹیشن سے مسلمانوں کو دور رکھنا اور

۳۔ برطانوی حکومت کو مستحکم اور سلطنت کی سالمیت کو قائم رکھنے والی تدابیر کو تقویت پہنچانا اور ہندوستان میں امن کو برقرار رکھنے کی کوشش کرنا اور لوگوں میں وفاداری کے جذبات کو فروغ دینا۔ (ایضاً: ص۲۲۶)

ڈاکٹر ظفر حسن

مغربیت، عقلیت، نیچر کا شکار

سرسید ایک پرخلوص اور ولولہ انگیز شخصیت کے حامل تھے جنہوں نے مسلمان قوم کی تعلیمی ترقی میں ایک اہم رول ادا کیا لیکن مذہبی امور میں بے جا مداخلت کر کے اسلام کی چند اہم روایتوں اور حقیقتوں کو غلط رنگ میں پیش کیا۔ اس کے نتیجے میں نئی نسل ایک حد تک پریشان ہوگئی کیونکہ ان کی اسلام میں "نیچر" سے متعلق تمام مغربی یا خود ساختہ مفروضے منطق اور دلیل کے دسیلوں سے داخل کرنے کی کوشش بے جا اور مہمل تھی...... سرسید "عقل" پر کچھ زیادہ ہی انحصار کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ محض عقل اور انسان میں سوچنے کی صلاحیت ہی انسان کو ایک اچھی زندگی بسر کرنے کے لئے کافی ہے۔ سرسید کے ان خیالات کو کئی حضرات نے بڑھا چڑھا کر آگے چلانے کی کوشش کی جن میں مولوی چراغ علی اور سید امیر علی کے نام پیش پیش ہیں۔ دراصل یہ لوگ غالباً اسلام کو انگریزوں کی نکتہ چینی اور مغرب کے مضر اثرات سے بچانا چاہتے تھے لیکن بدقسمتی سے یہ کام انجام دینے کی بجائے وہ خود مغربیت، عقل پسندی اور جدیدیت کا شکار ہو کر رہ گئے۔

(سرسید اور حالی کا نظریۂ فطرت: ص۸۹)

سرسید نے قرآن شریف اور دین کے حقائق کو سمجھنے کے لئے جو معیار سے مستعار لئے تھے، وہ خود مغرب میں ریزہ ریزہ ہو چکے تھے، اور سرسید کے افکار کی بنیاد کتنی کمزور اور ناپائیدار تھی۔ (ایضاً: ص۲۱۴)

سرسید نے "فطرت" کا جو تصور پھیلانا چاہا وہ اسلامی علوم میں کہیں نظر نہیں آتا۔

(ایضاً: ص۲۲۳)

سرسید کو ہر وقت اور ہر لحہ مغرب سے آوردہ نیچر کی لت کچھ ایسی پڑی کہ وہ چاہتے تھے
ہر شعبہ زندگی کو، چاہے وہ دینی ہو یا دنیاوی، آسمانی ہو یا روحانی، اپنے نام نہاد نظریہ فطرت
قدرت، قانون قدرت اور نیچر کا سہارا لئے بغیر ذرا بھی آگے نہ بڑھ سکے۔ (ایضاً: ص ۲۶۷)

یہی وہ فطرت کے مغربی تصورات ہیں جن کی بنا پر جمال الدین افغانی نے سرسید کو
دہریہ قرار دیا۔ ذار صاحب فرماتے ہیں کہ "دراصل سرسید کی نیچریت سطحی تھی تا کہ نوتعلیم یافتہ
طالب علموں کی توجہ حاصل کر سکیں تا کہ وہ کسی تعصب کا شکار نہ ہوں"۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا
ہے کہ اگر سرسید کے گمراہ کن تصورات کو بالائے طاق بھی رکھیں تو انہوں نے نئی نسل کو راہ
راست پر لانے کے لئے ایک ڈرامہ گھڑ رکھا تھا...... سرسید اس بات پر مصر تھے کہ روایت اور
سند کے برعکس تمام تر انحصار عقل پر ہونا چاہیے۔ سرسید نے یہ یاد نہ رکھا کہ قرآن شریف نے از
"ایمان بالغیب" کا مطالبہ کیا ہے...... عہد وکٹوریا کے نظریہ کے زیر سایہ تو سرسید رہتے ہی تھے
انہوں نے ڈاروِن کے نظریۂ ارتقا کو بھی بغیر کسی تامل کے قبول کیا۔ سرسید کو یقین تھا کہ انسان
کائنات کے کیمیائی عوامل کے تحت پیدا ہوا ہے۔ (ایضاً: ص ۲۷۶)

سرسید نے اپنے دوستوں کی بھی نہ سنی اور مغرب سے مستعار لئے ہوئے تصور
فطرت کو فکر کے ہر شعبے اور زندگی کے ہر معاملے میں آخری معیار قرار دے کر اس کی رو سے
مسلمانوں کے علوم اور معاشرت پر تنقید شروع کر دی۔ اس معیار کا استعمال انہوں نے تفسیر میں بھی
کیا، فقہ میں بھی اور معاشرتی اور ادبی مسائل میں بھی۔ اگر یہ بحث محض علمی ہوتی تو شاید چند
عالموں کے سوا اور کوئی اس سے دلچسپی نہ لیتا مگر چونکہ سرسید کے اندازِ فکر کی زد زندگی کے ہر شعبے
پر پڑتی تھی، اسی لئے مخالفت اور موافقت کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ (ایضاً: ص ۲۸۲)

ان کی نیت خالص بھی سہی لیکن عملی نتیجہ یہی نکلا کہ منکروں کو قائل کرنے کی فکر میں وہ
خود معنی میں تحریف کرنے لگے اور قرآن شریف ہی کو کھو بیٹھے، حالانکہ منکروں کا اصلی جواب تو
خود قرآن شریف میں موجود ہے کہ نہیں مانتے ہو تو نہ مانو، لکم دینکم و لی دین۔ اس کے
برخلاف سرسید منکروں کو جواب دیتے دیتے خود قرآن شریف کے انکار کے قریب جا پہنچے
ہیں۔ (ایضاً: ص ۲۸۷)

سرسید ہر وقت مغربی اقوام کے معاشرے سے اتنا مرعوب رہتے تھے کہ انہیں یقیناً ایک طرح کا احساس کمتری تھا۔ اگرچہ انیسویں صدی میں ہند کے مسلمان بے شک کم ہمت، شکست خوردہ اور بد دل تھے لیکن ان کی کیفیت کو وحشیانہ اور غیر مہذب کہنا اور سمجھنا سرسید کی نمایاں کمزوری تھی۔ (ایضاً:ص ۳۰۸)

سرسید نہ صرف انگریزوں سے مرعوب تھے بلکہ انگریزوں کے رسم و رواج اور طرز معاشرت ہمارے یہاں رائج کرنا چاہتے تھے۔ انگریزی معاشرے سے بالخصوص اور مغربی معاشرے سے بالعموم ان کی دل بستگی واضح تھی۔ انگریزی کالجوں کا طرز تعلیم وہ آکسفورڈ یا کیمبرج کی دانش گاہوں سے لینا چاہتے تھے تو ''تہذیب الاخلاق'' کا طرزِ تحریر انہوں نے ایڈیسن اور اسٹیل سے لینا پسند کیا۔ (ایضاً:ص ۳۱۰)

معاشرے کی اصلاح کے حق میں تو سرسید نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ اسلام رہے نہ رہے، پیٹ کی پوجا لازمی ہے...... مذہب میں انہیں عقلی باتیں کم نظر آتی تھیں جنہیں منطق کی کسوٹی پر پرکھا جا سکے۔ رفاہ عام پر زور دیتے تو مذہب کو سرسید پھیکا بنا کر ثانوی حیثیت بخشتے۔ اسی طرح مغربی طرز میں معاشرے پر زیادہ زور ہوتا ہے، قطع نظر اس کے کہ اسلام میں مذہب اور معاشرہ یک جا جڑے ہوئے ہیں۔ (ایضاً:ص ۳۱۱)

فلسفۂ نیچر سے جنم لینے والے فتنے کی کڑیاں:

مغربی تہذیب اور ذہنیت، عقل پسندی، رواداری اور ایسے ہی سرسید اور ان کے عہد کے دیگر زندگی کے بارے میں خیالات نے کچھ سیاست اور مذہب میں دلچسپی رکھنے والے افراد پیدا کر دئے جو اسلامی روایات اور شرع سے کم و بیش تجاوز کرتے رہے۔ یوں تو حکیم اجمل خاں بھی جدید تصورات اور مفروضات کی آمیزش اسلام میں دیکھنا چاہتے تھے لیکن علامہ مشرقی، ابوالکلام آزاد، پرویز اور غلام جیلانی برق اسی فتنے کی کڑیاں ہیں جس نے مغرب کے فلسفۂ نیچر سے جنم لیا۔ (ایضاً:ص ۳۳۵)

ڈاکٹر سید عابد حسین

سرکاری عہدوں کے حصول کی تعلیم سے دلچسپی:

ایم اے او کالج، جو ۱۸۷۷ء میں قائم ہوا اور ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی کے درجے تک پہنچا، نہ صرف ظاہری شکل و تنظیم کے لحاظ سے بلکہ مقصد کے لحاظ سے بھی سید صاحب کی منشا کو پورا نہیں کرتا تھا۔ سید صاحب اپنے مدرسے میں چار قسم کے تعلیم یافتہ پیدا کرنا چاہتے تھے:

(ا) وہ جو انگریزی کے ذریعے تعلیم حاصل کر کے سرکاری عہدے اور عزتیں پائیں۔

(ب) وہ جو انگریزی کے ذریعے تعلیم حاصل کر کے مغربی علوم کو اردو میں منتقل کریں۔

(ج) وہ جو اردو میں تعلیم پا کر ''لیاقت کامل'' حاصل کریں جس کا معیار انگلستان کے کالجوں کے برابر ہو، تا کہ ان کو ہر وقت اور ہر محل پر اپنے علم کی ترقی کا موقع ہو۔

(د) وہ جو عربی فارسی میں کمال حاصل کریں تا کہ مسلمانوں کے قدیم مذہبی اور تہذیبی سرمائے کو موجودہ نسلوں تک پہنچا سکیں۔

ان میں سے ا، ب اور د کی تعلیم سید صاحب خاص مقاصد کے پیش نظر چاہتے تھے جن میں سے ہر مقصد اپنی جگہ اہم مگر محدود تھا۔ عام ذہنی تعلیم کا وسیع اور اعلیٰ مقصد ان کے خیال میں صرف فریق ب حاصل کر سکتا تھا جس نے اردو میں تعلیم پائی ہو، اور یہی ان کی منشا کے مطابق کالج کے طلبہ میں فریق غالب ہونا چاہیے تھا۔ مگر مسلمانوں کے جس طبقے کی مدد سے سید صاحب نے ایم اے او کالج قائم کیا تھا اور جو بورڈ آف ٹرسٹیز پر قابض تھا، اسے صرف فریق ا کی تعلیم سے دلچسپی تھی کہ وہ انگریزی کے ذریعے تعلیم حاصل کر کے سرکاری عہدے اور عزتیں پائے چنانچہ علی گڑھ اسی طبقے کے لوگوں کی آرزوؤں اور حوصلوں کا آئینہ بن گیا۔ اس میں خوش حال خاندانوں کے لڑکے بہ قدر ضرورت جدید تعلیم حاصل کرتے تھے لیکن زیادہ زور ایسے وضع ولباس، اخلاق و آداب، کھیلوں اور ورزشوں پر دیا جاتا تھا جن کے ذریعے انگریز حاکموں کی خوشنودی اور قربت حاصل ہو سکے۔

(نگار کراچی، سرسید نمبر ۲: ص ۱۷۹)

اردو ہندی نزاع میں حقیقت پسندی کی بجائے جذباتی نقطہ نظر:

سید احمد خاں جس زمانے میں بنارس میں تعینات تھے تو انہیں معلوم ہوا کہ اردو کے معاملے میں سب ہندو اُن کے ساتھ نہیں ہیں۔ بنارس سے ایک تحریک اٹھی کہ سرکاری عدالتوں میں اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے موقوف کردینے کی کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔ سرسید کے لئے یہ ایک تکلیف دہ انکشاف تھا اور اس سے انہیں بڑا دھچکا لگا اور انہیں پہلی بار اندازہ ہوا کہ ان کے (ہندوؤں کے) اونچے اور متوسط طبقے آپس میں متحد ہو کر مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنے جداگانہ تہذیبی وجود کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ انگریزی تعلیم مسلمانوں سے پہلے شروع کرنے کی وجہ سے ہندوؤں کو سرکاری ملازمت میں بڑا حصہ ملا تھا، لیکن اردو کے سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے وہ مجموعی طور پر مسلمانوں کے مقابلہ میں نقصان میں رہتے تھے اس لئے ان میں اس خیال کا پیدا ہونا قدرتی امر تھا کہ اگر عدالتوں میں اور دفتروں میں اردو کی جگہ ہندی رائج ہو جائے تو انہیں سرکاری ملازمتوں میں زیادہ حصہ ملے گا۔ سرسید نے اسی نئی لہر کو، جو ملک کی زندگی میں اٹھ رہی تھی، حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھنے کے بجائے جذباتی نقطۂ نظر سے دیکھا، بنارس کے کمشنر شیکسپیئر سے کہا، ''اب مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام دل سے شریک نہ ہو سکیں گی''۔

(بحوالہ ''مقالات قومی سرسید سیمنار''، ص: ۹۹۔۱۰۰)

سید عابد علی عابد

عقلی تفسیر اور عقل کی نارسائی:

سرسید نے مذہبی تجدد اور اصلاح کی جو کوششیں کی ہیں، ان کے نتائج کی نوعیت محل نظر اور محا بہ النزاع ہے لیکن ان کی دیانت داری اور خلوص سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے تفسیر قرآن میں غلطیاں کی ہوں گی لیکن ان کا منشا یہی تھا کہ مغربی تہذیب اور سائنس کے انکشافات سے مسلمانوں کے دل میں عدمِ اطمینان نہ پیدا ہو جائے۔ انہوں نے قرآن مجید کی ایک خالص عقلی تفسیر کرنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے کہ بیل منڈھے نہیں چڑھ سکے کہ انسانی علم کی

حدود معلوم ہیں اور انسانی عقل کی نارسائی مسلم ہے۔ سائنس کے انکشافات کا دائما تغیر پذیر ہوتے رہنا مقدر ہے۔ قرآن مجید کو تازہ ترین سائنسی نظریات کی کسوٹی پر پرکھنا نہیں چاہئے، ایسا نہ ہو کہ مستقبل ان نظریات کو غلط ثابت کردے اور ہم پھر قرآن مجید کی نئی تفسیر پر مجبور ہوں۔

(برگِ گل کراچی، سرسید نمبر [نقشِ ثانی]: ص۲۱۹)

ڈاکٹر عارف الاسلام

سرسید کے نظریہ قومیت کی مختلف توجیہات:

سرسید احمد خاں کے سیاسی نظریات کے سلسلے میں مختلف نقطۂ نظر پائے جاتے ہیں۔ ایک طبقہ فکر سرسید کے سیاسی نظریات کو نیشنل کانگرس کے نظریات سے ہم آہنگ سمجھتا ہے اور اس کے ثبوت کے طور پر چند تقاریر اور اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ دوسرا طبقہ سرسید کو دوقومی نظریہ کا بانی قرار دیتا ہے۔ ایک تیسرا طبقہ ایسا بھی ہے جو سرسید کے سیاسی نظریات کو دوقومی نظریہ کے قریب تو مانتا ہے لیکن وہ ان کے اس نظریہ کو انگریزوں کی کرشمہ سازی خیال کرتا ہے۔ اس نظریہ کو خاص طور سے محمڈن کالج کے مشہور پرنسپل بیک کا نظریہ سمجھا جاتا ہے اور یہ طبقہ خیال کرتا ہے کہ سرسید کا یہ نظریہ بیک صاحب کے زیر اثر قائم ہوا۔ ایک چوتھا طبقہ ایسا بھی ہے جو سرسید کے اصلی نظریات سے واقف ہونے کے باوجود برائے مصلحت ان کے چند اقتباسات اور تقاریر سے یہ تاثر دینے کی کوششوں میں لگا رہتا ہے کہ جیسے سرسید اور نیشنل کانگرس کے خیالات میں مکمل ہم آہنگی تھی۔ آزادی کے بعد علی گڑھ پر یہی طبقہ حاوی رہا۔

(مقالات قومی سرسید سمنار: ص۲۶)

سرسید کے خیالات کا مسخ:

بنگالی کانگرسیوں نے سرسید کے انتقال کے بعد مولانا آزاد سے ''الہلال'' کا اجرا کرایا اور ''الہلال'' نے بھی وہی باتیں دہرائیں جو بنگالی اخبارات پہلے سے لکھتے آئے تھے۔ بس اتنا فرق ہو گیا کہ اب قرآن کی آیتیں اور احادیث کا استعمال بھی سرسید کے خیالات کے خلاف کیا جانے لگا۔ ہر دلیل اور ہر خیال پر قرآن کی آیت چسپاں کی جانے لگی۔ یہ رسم بعد کو اور

بڑھی۔ جمیعتہ العلماء ہند کا یہ شعار بن گیا کہ اس نے کوئی بات خدا اور رسول کا استعمال کئے بغیر نہیں کہی۔ ہمیں حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ خود ہمارے دانشوروں نے آزادی کے بعد سرسید کے خیالات کو مسخ کیا کہ ایک مشہور تاریخ داں نے اپنی کتاب ''سرسید اور علی گڑھ تحریک'' میں مولانا مدنی اور سرسید کے سیاسی نظریات کو بھی ہم آہنگ قرار دیا...... یہ اگر مصلحت ہے تب بھی علمی فریب ہے یا اپنے خیالات اور نظریات کو غلط طریقے سے مشتہر کرنا ہے۔ جو جیسا ہے اس کو ویسا ہی لکھنا ضروری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سرسید نے اپنی کچھ تقاریر میں ہندو اور مسلمانوں کو ایک قوم بھی بتایا ہے اور یہاں تک کہا ہے کہ ہندوستان میں رہنے کے سبب ہم سب ہندو بھی کہے جا سکتے ہیں، لیکن یہ سب تقاریر قیام کانگرس سے پہلے کی ہیں۔ اس وقت تک قوم کا لفظ سیاسی معنوں میں مستعمل نہیں تھا لہٰذا اس کی تشریح میں جانے کی ضرورت بھی نہ تھی لیکن قیام کانگرس سے انتقال تک ان کی تمام تحریریں ان کے قومی نظریے کی صاف نشاندہی کرتی ہیں۔

(ایضاً ص ۷۷)

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

مغربی معاشرت کی شیفتگی:

مسلمانوں میں مغربی معاشرت کی شیفتگی سرسید مرحوم کی بدولت پیدا ہوئی۔ یہاں اس سے بحث کی ضرورت نہیں کہ اس سے ان کا کیا منشا تھا اور ان کا یہ خیال کن مصالح پر مبنی تھا لیکن یہ بلا آئی اُنہی دنوں اور اُنہی کی بدولت، مسلمانوں کو اسراف کا ایک اور بہانہ مل گیا۔ اس معاملہ میں سرسید کے سب سے بڑے اور اول معتقد اور خلیفہ نواب محسن الملک تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسروں پر بھی وہی رنگ چڑھ گیا۔

(چند ہم عصر: ص ۱۲۳)

نقالوں کا طائفہ:

سرسید کی غرض یہ تھی کہ باہم میل جول اور ربط وضبط بڑھے، باہمی نفرت اور بدگمانی

رفع ہواور ایک دوسرے کے خیالات سے واقف ہوں۔ان کا منشا یہ تھا کہ ہمارا تعلق انگریزوں سے حاکم ومحکومانہ نہیں، دوستانہ ہونا چاہیے۔اسی خیال سے انہوں نے لباس میں تبدیلی اور انگریزی طرز معاشرت بھی اختیار کیا۔ جہاں تک میں نے انہیں دیکھا ہے، ان میں انگریزی طرزِ معاشرت معمولی تھی..... مگران کے بعض پیروؤں نے اس معاملے میں بڑا غلو کیا۔اس میں پیش پیش نواب محسن الملک تھے۔حیدرآباد میں کوئی ان کا ٹھاٹھ دیکھتا۔فرنیچر انگلستان سے لائے تو اس کے رکھ رکھاؤ اور صفائی کے لئے ایک انگریز بھی لیتے آئے۔حیدرآباد سے آنے کے بعد یہ شوق دھیما پڑ گیا تھا لیکن بہت سے سویلین اور بیرسٹر وغیرہ اپنی طرز معاشرت میں صاحب بہادر تھے۔انگریزی تعلیم اور انگریزی طرز معاشرت کی وجہ سے ہماری قوم میں نیا طبقہ بن گیا تھا جسے ''نقالوں کا طائفہ'' کہنا زیادہ نامناسب نہ ہوگا۔ان میں نقل ہی نقل تھی۔ان حضرات کو عام مسلمانوں سے، بلکہ متوسط الحال شرفا سے بھی کوئی ربط اور اُنس نہیں رہا تھا۔

(سید احمد خاں،حالات وافکار:ص ۳۲۔۳۳)

علی گڑھ--ظاہر روشن، باطن دھندلا:

کالج یونیورسٹی ہوگیا ہے،عمارتوں کا سلسلہ لامتناہی ہوتا جارہا ہے،علوم وفنون کے شعبے بڑھتے چلے جارہے ہیں،طلبہ کی تعداد کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے، لائق پروفیسروں کا ایک خاص گروہ موجود ہے، ظاہری شان وشوکت بھی کچھ کم نہیں بلکہ پہلے سے بہت زیادہ ہے، یہ سب کچھ ہے لیکن روح نہیں، ظاہر شاندار اور روشن ہے لیکن باطن دھندلا ہے، پہلے یہ اردو ادب کا آستانہ تھا اور اب یہ اس کا مزار ہے۔

(خطبات عبدالحق:ص ۳۵۲)

رسولِ اکرمؐ کے خلاف ''ناقابلِ برداشت دریدہ دہنی'' کرنے والے کی تعریف:

سوامی دیانند سرسوتی نے اپنی کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' میں اسلام اور بانی اسلام کے خلاف ''ناقابلِ برداشت دیدہ دہنی'' سے کام لیا ہے جس نے ہندو مسلمانوں میں سخت منافرت پھیلادی تھی،لیکن جب سوامی جی کا انتقال ہوا تو سرسید نے ان کی وفات پر بڑا آرٹیکل لکھا اور ان کے اصلاحی کاموں کے بے حد تعریف کی جسے پڑھ کر حیرت ہوتی تھی۔یہ ہے ایک

سچے اور پکے مسلمان کی بے تعصبی اور رواداری۔ یہ ایک نہیں ایسی ان کی بیسیوں تحریریں ہیں۔

(سید احمد خاں، حالات وافکار: ص ۸۵)

ڈاکٹر عبدالحق حسرت کاسگنجوی

انتہا پسندی کا توڑ سر سید مخالف تحریک:

سر سید تحریک ایک طوفان کی طرح اُٹھی، خس وخاشاک کے ساتھ بعض پرانی اقدار کو بھی اکھاڑ پھینکا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک گروہ اور پیدا ہو گیا جو سر سید کی اس طوفانی اٹھان پر اتنی ہی سخت تنقید کرتا تھا۔ بظاہر تو یہ تحریک سر سید کی مخالفت ہی نظر آتی تھی لیکن جب ہم غور سے مطالعہ کرتے ہیں تو علم ہوتا ہے کہ اس کی شدید ضرورت تھی، بلکہ اسے بھی سر سید تحریک کا ہی ایک حصہ سمجھنا چاہیے۔ اگر اس شدید طوفان کی شدید مخالفت نہ ہوتی تو انتہا پسندی اپنی انتہا پر ہوتی۔

(ادب، علمی اور فکری زاویے: ص ۳۲)

عبدالحمید صدیقی

در بغل تیر و کماں کشتۂ نخچیر شدیم:

ایک مسلمان چونکہ زندگی کا ایک خاص نقطۂ نظر اور ایک متعین اسلوب حیات رکھتا ہے اس لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ مسلمان رہتے ہوئے اپنی انفرادی یا اجتماعی زندگی کے کسی گوشہ میں کوئی ایسی چیز اصولاً گوارا کرلے جو اُس کے اساسی تخیل سے متصادم ہو...... یہی و ہ اصل سبب ہے جس کی بنا پر مسلم قوم کے بہی خواہوں نے انگریزی نظام تعلیم کی مخالفت کی تھی۔ وہ ترقی کے دشمن نہ تھے، انہیں مغربی علوم وفنون سے بھی کوئی پرخاش نہ تھی، انہیں انگریزی زبان سے بھی بحیثیت ایک زبان کے کوئی نفرت نہ تھی۔ وہ اگر مخالف تھے تو اس بات کے تھے۔ اس نظام تعلیم کو جوں کا توں اپنا لیا جائے اور اس قوم کے نوجوانوں کے سامنے تعلیم کا مقصد سوائے روٹی کمانے کے اور کوئی نہ رہے۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ ان حضرات کے خدشات بالکل صحیح ثابت ہوئے اور سر سید کا یہ خواب کہ ''فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس

ہ میں ہاتھ میں اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر'' خواب ہی رہا، شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔ علی گڑھ نے نہ تو مذہبی نقطۂ نظر سے کبھی قابل رشک شہرت حاصل کی اور نہ وہ عام علمی احیاء کا مرکز بن سکا۔ اس ادارے کے مقاصد خواہ کتنے ہی نیک اور بلند ہوں مگر اس کی عملی افادیت صرف اسی قدر تھی کہ وہ مسلمان نوجوانوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں سرکاری ملازمتوں کے لئے تیار کردے۔ اس کا نتیجہ جو ہونا تھا، وہی ہوا۔ اساتذہ اور طلبہ میں مادیت اور ظاہر پرستی پیدا ہوئی۔ سرسید کا خیال تھا کہ علی گڑھ والے اسلام کی شاندار روایات کے وارث ہوں گے اور اسلام پر غیر مسلموں نے جو اعتراض کئے ہیں ان کا دندان شکن جواب دیں گے لیکن یہاں عالم یہ تھا:

در بغل تیر و کماں، کشتۂ نخچیر شدیم

(میکالے کا نظریۂ تعلیم: ص ۴۳-۴۴)

حافظ عبدالرزاق

قرآن کے الفاظ سے انگریزی تہذیب کی ترویج کا کام:

مادہ پرستانہ مغربی تہذیب و جاذبِ توجہ بنانے کے لئے ...... سرسید نے قرآن حکیم کی مادہ پرستانہ تفسیر لکھنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اس میں آپ نے عربی گرائمر اور روز مرہ محاورہ کا ایسا مذاق اڑایا کہ اس کی مثال گزشتہ تیرہ صدیوں میں کہیں نہیں ملتی۔ ان کے انداز تفسیر کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ الفاظِ قرآن سے معانی اخذ کرنا رجعت پسندی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں اپنی پسند کے معانی داخل کرنا مفسر اور ماڈرن مفسر کا اصل کمال ہے تاکہ قرآن سے انگریزی تہذیب کی برتری ثابت کرنے اور اسے پھیلانے کا کام لیا جاسکے۔ اس سلسلے میں سرسید نے نبی کریمؐ کے صحابہ کرام جو حضورؐ کے براہ راست شاگرد تھے، ان پر وہ پھبتیاں کسیں کہ خدا کی پناہ۔ اس طرح انگریز پر ثابت کردیا کہ مسلمان وہ قوم ہے جو اپنے دین اور اپنے نبی کے خاص شاگردوں کے متعلق ایسے معاندانہ خیالات رکھتی ہے۔

(لغزشیں: ص ۱۹-۲۰)

سرسید کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ قرآن کو رسولؐ سے جدا کر کے مغربی عینک سے دیکھا جائے، مغرب کے دماغ سے سوچا جائے اور قوم کو اس حاصل مطالعہ اپنانے کی ترغیب دی جائے۔ اپنی عقل اور اپنے مادہ پرستانہ علم کی روشنی میں قرآن کی تفسیر لکھ کر قوم کا رخ اس طرح موڑا جائے کہ قرآن لانے اور سمجھانے والا اُن کی نگاہ سے اوجھل ہو جائے اور زندگی کے ہر پہلو میں صرف مغربی معیار اُن کے سامنے آئے۔ (ایضاً: ص ۳۰)

عبدالرزاق مجددی

معنوی ارتداد کا سب سے بڑا داعی:

سرسید احمد خاں تحقیق و انصاف کی عدالت میں معنوی ارتداد کے سب سے بڑے داعی تھے۔ سرسید احمد خاں کے ارتداد کو اصلاح کا نام دینا، یہ کہاں کا انصاف ہے؟..... برصغیر کے وہ کون سے آدمی تھے جو گھٹنے ٹیک کر ملکہ برطانیہ کو سجدہ کر کے اس کے ہاتھ چومتے تھے؟ اور یہ وہ زمانہ تھا جب خلافت عثمانیہ تار تار ہو چکی تھی، ہندوستان کی علمی عظمت کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا تھا، امت مسلمہ کے خون کو شیر مادر کی طرح ہضم کیا جا رہا تھا، ایسے ہی وقت میں لندن کو قبلہ کہنا، یہ سرسید احمد خاں کے ارشادات میں سے ہے..... برصغیر کی سیاسی شخصیات جتنی بھی گزری ہیں جن کا کچھ نہ کچھ تعلق علم و قلم سے رہا ہے وہ سرسید احمد خاں کے افکار و نظریات سے متفق نہیں، چہ جائیکہ علمائے ربانیین۔ سلمان رشدی، عاصمہ جہانگیر، مصر کے مشہور و معروف ادیب اور عربیت کے بے نظیر استاد ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری میں اور سرسید احمد خاں میں کوئی فرق نہیں۔

(القاسم، نوشہرہ، ستمبر ۲۰۰۰: ص ۳۶۔۳۷)

عبدالسلام

مذہب میں ترمیم و تنسیخ کی کوشش:

سرسید نے غلطی یہ کی کہ اپنا پروگرام بہت وسیع مرتب کر ڈالا۔ وہ مسلمانوں کے ہر شعبۂ زندگی پر چھا گئے۔ انہوں نے ایسے کام بھی شروع کر دئے جس کے وہ اہل نہ تھے۔ شروع

شروع میں لوگ سرسید کے اصلاحی خیالات کی قدر کرتے تھے لیکن جب وہ مذہب میں بھی مداخلت کرنے لگے تو لوگ خاموش نہ رہ سکے۔ اس زمانے کے بااثر مسلمان تین گروہوں میں منقسم تھے۔ ایک گروہ مغرب کی ہر بات قبول کرنے کے لئے آمادہ تھا۔ وہ حکام کا تقرب حاصل کرنے کے لئے خود کو انہی کے رنگ میں رنگ ڈالنا چاہتا تھا۔ اس گروہ کو اپنا مذہب تو عزیز تھا مگر مذہب سے یہ بیگانہ تھا اس لئے یورپ کے معترضین کے جوابات دینے سے قاصر تھا۔ اس نے جواب دینے کی کوشش کرنے کے بجائے مذہب میں ترمیم و تنسیخ کرنی شروع کردی، مذہب کو توڑ مروڑ کر سائنس اور فلسفہ سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں مذہب مسخ ہوکر رہ گیا۔ اس گروہ کے نزدیک سب سے اہم چیز مصلحت وقت تھی، بادِ مخالف کا مقابلہ کرنے کے بجائے ہوا کے رخ کے مطابق پڑ جانے کا قائل تھا۔ اس گروہ کے قائد سرسید تھے جو اپنے زمانے میں سب سے جدید تھے۔

(برگِ گل کراچی سرسید نمبر ۵۵-۱۹۵۴ء ص ۴۷)

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

سرسید کے مقاصد تعلیم پس پشت:

سرسید علی گڑھ یونیورسٹی کے بارے میں جو تصور ذہن میں جمائے ہوئے تھے، ان کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر''۔ ان کی تعلیمات کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ مغربی علوم حاصل کئے جائیں، لیکن اس کے ساتھ ہی طلبہ میں ایمانِ کامل اور صحیح دینی تربیت کو رواج دیا جائے۔ لیکن اس پیمانے سے ناپئے تو معلوم ہوگا کہ علی گڑھ یونیورسٹی اپنے مقاصد میں زیادہ کامیاب نہیں ہوئی۔ سرسید کے ارادے کچھ اور تھے اور عملاً کچھ اور ہوا۔ ایک مفکر کے تخیل اور اس تخیل کی عملی صورت میں زیادہ فرق غالباً اس وجہ سے ہوا کہ علی گڑھ کالج کا سب سے اہم عملی مقصد ایسے طلبہ کی نشو و نما ہوگیا جو فتح مند قوم کے علوم و فنون اور زبان حاصل کرکے ملکی حکومت میں حصہ لے سکیں، اور سرسید کے جو مقاصد اس اہم ترین مقصد کے متبائن

تھے، پس پشت ہو گئے۔

(سرسید احمد خاں مؤلفہ عبدالسلام خورشید: ص ۶۴)

عبدالعزیز خاوری

سرسید کے دو رُخ:

سرسید احمد خاں کے دو رُخ ہیں۔ایک وہ جو ہمدردِ قوم کی حیثیت سے معروف ہے اور دوسرا وہ جس نے ان کی زندگی میں علمائے ہند کو اتنا سیخ پا کیا کہ دہلی، لکھنؤ، رام پور اور بھوپال وغیرہ کے علما نے ان پر کفر کے فتوے لگائے۔اس کی وجہ ان کے وہ مضامین تھے جو انہوں نے اپنی تفسیرِ قرآن اور تہذیب الاخلاق میں لکھے مثلاً......

☆ حضور ﷺ کے پاس جبریلؑ نہ آتے تھے بلکہ ان کے دل میں یہ بات پیدا ہو جاتی تھی کہ کوئی شخص کھڑا میرے ساتھ باتیں کر رہا ہے،

☆ فرشتوں اور جنات کا کوئی وجود نہیں،

☆ جنت یا دوزخ خوشی یا غمی کا نام ہے، باقی جو کچھ ان کے متعلق بیان ہوا وہ لوگوں کو سمجھانے کے لئے ہے،

☆ حضرت سلیمان علیہ السلام غبارے میں اُڑتے تھے،

☆ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جوار بھاٹے کی وجہ سے سمندر پار کیا،

☆ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر نہیں اٹھائے گئے......

سرسید کی تحریروں نے آنے والے مفکرین کو بھی متاثر کیا اور اُن کے بعد کئی اصلاح پسندوں نے احادیث پر عدمِ اعتماد کا اظہار کیا اور اجتہاد کے ختم ہو جانے کو اسلام میں جمود سے تعبیر کیا، گویا کہ اسلام ایک مبہم اور گول مول مذہب ہے اور ہر آنے والا شخص اس کی شرح اپنے ڈھب سے کر سکتا ہے۔

(اسلامی فرقے: ص ۳۲-۳۴)

عبدالغنی فاروق

نصابی مضامین میں قرآن وسنت سے متصادم مواد کی موجودگی:

سرسید احمد خاں مرحوم کے اردو کی مختلف کتابوں میں پانچ مضامین شامل تھے۔ان کے عنوان ہیں: امید کی خوشی، آدم کی سرگزشت، گزرا ہوا زمانہ، قومی اتفاق اور ایک لیکچر۔ بدقسمتی سے ''امید کی خوشی'' کے سوا باقی چاروں مضامین میں ایسا مواد تھا جو قرآن وسنت کے واضح عقائد ونظریات سے متصادم تھا اور سیکولرزم، مادہ پرستی، اندھی بہری نیشنلزم اور تنگ نظری کا درس دیتا تھا ''آدم کی سرگزشت'' مکالمے کے انداز میں ایک کہانی ہے۔ایک لڑکا اپنے دادا سے انسان کی تخلیق کے بارے میں سوالات کرتا ہے اور دادا جواب دیتا ہے اس کہانی میں تخلیق آدم، فرشتوں، شیطان، سجود ملائک اور شجر جنت، ہر چیز کی ایسی تعبیر کی گئی ہے جو قرآنی تعلیم اور چودہ سو سال کی اسلامی تعبیر کے صریحاً خلاف ہے...... بدقسمتی سے ''گزرا ہوا زمانہ'' والی کہانی میں بھی سیکولر قسم کی دنیادارانہ قوم پرستی کا درس ملتا ہے اور عبادات وللٰہیت کے جذبے سے کیے ہوئے نیک کاموں کا واضح استخفاف نظر آتا ہے...... اس کہانی میں خدا بیزار مادیت پر مبنی قوم پرستی کا درس دیا گیا ہے اور عبادات کے معاملے میں کج بحثی کا انداز اختیار کیا گیا ہے ..... ''قومی اتفاق'' میں بلاشبہ فرقہ پرستی سے بالاتر ہو کر اتفاق واتحاد کا درس دیا گیا ہے مگر دینی نقطۂ نظر سے اس میں متعدد باتیں محل نظر ہیں۔اس میں عیسائیت سے متاثر ہو کر خدا کو ''روحانی باپ'' اور مسلمانوں کو اس کا ''بیٹا'' قرار دیا گیا ہے، ختم نبوت کے انکار کا اشارہ ہے، مذہب کو ہر انسان کا پرائیویٹ معاملہ قرار دیا گیا ہے اور قرآن وسنت سے یکسر متصادم اعمال کا ایک بالکل اجنبی معیار دیا گیا ہے۔

(جنگ لاہور، ۲۲ دسمبر ۱۹۸۱ء)

پروفیسر عبدالقادر خاں

اپنے عہد کی سب سے متنازعہ شخصیت:

سرسید اپنے عہد کی سب سے متنازعہ شخصیت تھے، لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ قیام

پاکستان کے بعد لکھی جانے والی تاریخ میں سرسید ایک اتنی ہی غیر متنازعہ شخصیت بن کر سامنے آئے جتنے وہ اپنے دور میں متنازعہ رہے۔اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پاکستان کی تاریخ پر جن مسلمان مصنفین نے قابل ذکر کتابیں لکھیں وہ یا تو علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے یا مغربی افکار ونظریات سے اسی حد تک متاثر اور مرعوب تھے جتنا علی گڑھ کا تعلیم یافتہ طبقہ۔ پاکستان کا سیاسی تاریخ مرتب کرنے والا دوسرا بڑا گروہ مغربی مصنفین کا تھا جن کے لئے سرسید کے انتہائی آزاد خیالی پر مبنی نظریات، اور دین اور سیاست کی علیحدگی کے بارے میں ان کا سیکولر نقطہ نظر بہت جاذب توجہ بھی تھا اور مفید مقصد بھی۔

(مطالعہ پاکستان:ص۵۰)

ڈارون کے نظریۂ ارتقا کا قرآن سے ثبوت!

سرسید مذہب کو خالص مغربی عقلیت کی میزان میں تولنے کے قائل تھے۔انہوں نے معجزات، معراج، جنت، دوزخ، ملائکہ اور شیطان کے متعلق قرآنی احکام کی اس انداز میں تاویل کی کہ مسلمان اہل علم کے نزدیک ان کی یہ تعبیر انکار کے درجے تک پہنچتی تھی، اور اسلام کی تیرہ سو سال کی تاریخ میں اس سے پہلے ایسی تعبیر کی کوئی مثال موجود نہیں تھی۔انہوں نے قرآنی احکام کو کھینچ تان کر مغربی افکار ونظریات کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی، مثلاً انہوں نے ڈارون کے نظریہ ارتقا کو قرآن سے ثابت کیا۔ (ایضا:ص۵۱)

دوقومی نظریے کا خالق کون؟

جہاں تک دوقومی نظریے کا تعلق ہے، محض اس بنیاد پر کہ سرسید نے پہلی مرتبہ مسلمانوں کے لئے ''قوم'' کا لفظ استعمال کیا، انہیں دوقومی نظریے کا خالق قرار دینا مشکل ہے۔دوقومی نظریہ ایک نظام حیات اور بنیادی عقیدہ ہے، محض تین لفظوں کا مجموعہ نہیں۔سرسید نے جس بنیاد پر مسلمانوں کو ایک الگ قوم قرار دیا وہ ایک منفی بنیاد تھی، یعنی اردو کے بارے میں ہندوؤں کا متعصبانہ رویہ۔وہ دوقومی نظریہ جس کی بنیاد پر پاکستان وجود میں آیا، ایک مثبت حقیقت تھا۔ (ایضا:ص۵۲)

ان حقائق کو سامنے رکھا جائے تو سرسید کے افکار اور دوقومی نظریہ میں کوئی معنوی
مطابقت تلاش کرنا بھی بہت مشکل ہو جاتا ہے، کجا یہ کہ انہیں دوقومی نظریے کا بانی تسلیم کیا
جائے دوقومی نظریہ خود خالقِ کائنات کی تخلیق ہے اس لئے یہ بحث بے سود ہے کہ دوقومی
نظریئے کا بانی کون تھا۔ زیادہ سے زیادہ جس سوال کا جواب تلاش کیا جا سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ
کون سی شخصیت ہے جس نے ہندوستان میں دوقومیت کے عقیدے کی تجدید اور احیا کا فریضہ
سب سے پہلے انجام دیا تو اس کا جواب یقیناً حضرت مجدد الف ثانیؒ ہوگا، سرسید احمد خاں نہیں۔
پھر یہ حقیقت بھی قابل توجہ ہے کہ سرسید احمد خاں نے دوقوموں کا نام تو ضرور لیا، ان کے لئے
کسی الگ مملکت کے قیام کی بات کہیں نہیں کی۔ اس کے جواب میں دو باتیں کہی جاسکتی ہیں۔
اول یہ کہ حضرت مجدد نے بھی ایسی کوئی تجویز پیش نہیں کی تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ حضرت مجدد کا
عہد مسلمانوں کی حکمرانی کا دور تھا اس لئے ان کے پیش نظر پورے ہندوستان کو اسلامی سٹیٹ
بنانا تھا، کسی الگ ریاست کا سوال ہی اس وقت تک پیدا نہیں ہوا تھا۔ پھر کہا جا سکتا ہے کہ سرسید
کے دور میں یہ بات بہت قبل از وقت تھی تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ سرسید ہی کے دور میں سید
جمال الدین افغانی برصغیر ہند، افغانستان اور روسی ترکستان میں مسلمانوں کی علیحدہ قومی
ریاست کے قیام کا ایک خاصا واضح نقشہ پیش کر چکے تھے۔ (ایضاً: ص ۵۳)

ڈاکٹر عبدالقیوم

سرسید سے مخالفت کا باعث -- انگریزوں کا سیاہ نامہ اعمال:

سرسید نے جس رہ و رسم آشنائی کی ابتدا کی تھی اس کی ضرورت کا احساس ہم آج
کر رہے ہیں، لیکن سرسید کا یہی میل جول ان کی مخالفت کا باعث بھی تھا جس کو اہل ہند، خاص کر
مسلمان، اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور وہ اس نفرت میں حق بجانب بھی تھے کیونکہ انگریزوں
کا نامہ اعمال بہت سیاہ تھا جنہیں کوئی قوم بھلا نہیں سکتی ہے۔

(برگ گل کراچی، سرسید نمبر ۵۵-۱۹۵۴ء، ص ۲۹۳)

عبدالقیوم حقانی

انگریز کے خود کاشتہ پودے:

غلام احمد (قادیانی) اور سرسید احمد خاں (علی گڑھی) انگریز کے دو خود کاشتہ پودے تھے۔ دونوں انگریزوں کے خادم اور دین کے ہادم تھے۔ انگریز سرسید احمد خاں سے بھی وہی کام لینا چاہتے تھے جو غلام احمد قادیانی سے لیا۔ دونوں انگریزی مشن کی تکمیل میں ایک دوسرے سے آگے تھے مگر غلام احمد سید احمد خاں سے بڑھ کر چالاک تھے اس لئے وہ آگے نکل گئے مگر کام، باتیں، عقائد، نظریات، تحریرات، دین کی تعلیمات سے بغاوت اور بیخ کنی میں سید احمد خاں بھی غلام احمد قادیانی سے پیچھے نہیں تھے۔ تاہم ایک مکتب فکر سید احمد خاں کو محسن، مخلص، انقلابی، ایک عظیم ہیرو تسلیم کرتا ہے بلکہ کچھ کج فہم تو اسے معبودِ باطل کا درجہ دے بیٹھے ہیں۔

(محرف قرآن سرسید احمد خاں، ص ۱۰)

ڈاکٹر سید عبداللہ

دو سیّدوں کی اصلاحی تحریکوں میں فرق:

سرسید کا عقیدہ یہ تھا کہ مذہب کو علوم جدیدہ کی روح اور ان کے اصول سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ اس معاملے میں سرسید کی اصلاحی تحریک اس اصلاحی تحریک سے بالکل مختلف تھی جس کے علم بردار حضرت سید احمد، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا عبدالقدوس گنگوہی وغیرہ تھے۔ ان کا نصب العین تزکیہ روحانی اور تصفیہ باطنی تھا۔ سرسید کا نصب العین خالص عقلی اور علمی تھا۔ ان دونوں میں جو فرق ہے، وہ ظاہر ہے۔

(سرسید احمد خاں اور اُن کے نامور رفقا، ص ۲۴)

تعلیمی کوششوں میں مخالفت کی بنیاد:

تعلیم میں سرسید کے خیالات تجدد کی ہمہ گیر شہرت کے باوجود کچھ زیادہ جدید نہ

تھے۔ سائنس کی ترغیب اور انگریزی زبان کی تعلیم اگرچہ اس زمانے کے اعتبار سے ...
انقلاب انگیز خیالات تھے مگر حق یہ ہے کہ وہ تعلیم کے معاملے میں اتنے انقلابی نہ تھے جتنا ...
سمجھ لیا گیا ہے۔ عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سرسید انگریزی تعلیم پھیلانا چاہتے تھے اور ملک ...
بعض دوسرے عناصر، خصوصاً علما، انگریزی تعلیم کو مذہباً ناجائز سمجھتے تھے، مگر یہ رائے منصفانہ
نہیں۔ انصاف یہ ہے کہ اس معاملے میں علما کو اختلاف سرسید کے مذہبی عقائد سے یا
انگریزی تمدن سے تھا، ان کو انگریزی تعلیم سے اختلاف نہ تھا لیکن چونکہ سرسید انگریزی تہذیب
پھیلانے والے تھے اس لئے یہ معاملہ الجھ کر رہ گیا اور بہت سے مغالطے پیدا ہو گئے۔ سرسید
انگریزی تعلیم پھیلانے میں حق بجانب تھے مگر انگریزی تمدن کے متعلق ان کے خیالات تعلیمی
منصوبوں سے کچھ اس طرح گھل مل گئے تھے کہ اختلاف بالکل قدرتی تھا۔ (ایضاً: ص ۲۶)

تفسیر سرسید کا اثر پرویز اور قادیانی پر:

سرسید کی دوسری دینی تصانیف کی طرح یہ تفسیر بھی مقبول نہیں ہو سکی، مگر اس سے انکار
نہیں کیا جا سکتا کہ اس تصنیف نے آگے چل کر تحریک مطالعہ قرآن اور عام افکار دینی پر بڑا اثر
ڈالا۔ مجموعی لحاظ سے سرسید کے نام سے کوئی جماعت یا فرقہ منسوب نہیں مگر ان کا دینی نظریہ
ٹکڑے ٹکڑے ہو کر مختلف اسلامی فرقوں کے عقائد کا جزو بن گیا ہے، چنانچہ ان کے بہت سے
خیالات جدید مدرسہ ہائے فکر، خصوصاً احمدیت اور اہل قرآن وغیرہ، کے نظام میں جگہ پا گئے
ہیں۔ (ایضاً: ص ۳۲)

قوی ترین مخالفانہ ردعمل، —تصوراتِ اقبال:

سید صاحب کی دوسری کتابوں کی طرح اس تفسیر نے دینی بحث و نظر کو روحانی سمت
سے ہٹا کر عقلی سمت کی طرف متوجہ کیا ہے اور اس رجحان کو ترقی دی ہے کہ زندگی کی مادی قدریں
ہی قابل اعتنا ہیں، باقی جو کچھ ہے ضمنی ہے۔ سرسید کے اس نقطۂ نظر سے ان کے اپنے رفقا نے
بھی اختلاف کیا، چنانچہ مولوی چراغ علی کے سوا ان کے اکثر ہم کار شبلی، محسن الملک، نذیر احمد،
مولوی سمیع اللہ وغیرہ ان سے الگ رائے رکھتے تھے۔ سرسید کے اس نقطۂ نظر کا قوی ترین

مخالفانہ ردعمل علامہ اقبال کے تصورات کی صورت میں ہوا جن کی بنیاد اس خیال پر ہے کہ حقائق کا کامل ادراک عقل سے نہیں بلکہ وجدان اور حاسۂ مذہبی ہی سے ممکن ہے۔ (ایضاً: ص ۳۲۔۳۳)

موجودہ دور میں فکرِ سرسید کا اثر:

سرسید کے دینیاتی افکار آج (خود علومِ طبعی کے موقف کے بدل جانے کی وجہ سے) اگرچہ اپنا اثر بہت کچھ کھو چکے ہیں مگر دینی تصورات میں عقلی تجزیہ کی تحریک آج بھی جاری ہے اور اس میں سرسید کے شعوری یا غیر شعوری اثرات آج بھی نظر آ رہے ہیں، بلکہ نیاز فتح پوری اور غلام احمد پرویز وغیرہ بعض عقائد میں سرسید سے بھی کچھ قدم آگے ہیں۔ قیامِ پاکستان کی بنیاد اگرچہ دینی ہے مگر مذہب کے مادی اور دنیاوی رخ کی اہمیت (جس پر سرسید نے بہت زور دیا تھا) روز بروز بڑھ رہی ہے۔ (ایضاً: ص ۲۶۴)

مذہب کی افادیت میں ''نیچر'' کی مزاحمت:

سرسید نے عقل پسندی کے متعلق اپنے خیال کی بنیاد نیچر کے قوانین پر رکھی اور اسی بنا پر ان کے زمانے کے لوگوں نے انہیں نیچری کہا۔ سرسید کی عقلیت ان کی نیچریت پر مبنی ہے۔ اس سے ایک جھگڑا یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ مذہب کو قوانینِ فطرت کی روشنی میں پرکھنے سے بہت سے مراحل ایسے آتے ہیں جہاں مذہب کی افادیت ثابت نہیں ہو سکتی اور نہ ثابت کی جا سکتی ہے۔

(لطیفِ نثر: ص ۷۴)

حمیتِ دینی کے لئے مضر تفسیری کوششیں:

..... ہندوستان میں سرسید احمد خاں اور اُن کے رفقا نے تو حد کر دی..... کہ قرآن مجید کو اپنی صداقت ثابت کرنے کے لئے مغربی خرافات کا پابند کر دیا۔ اس کے علاوہ سرسید کا اندازِ فکر انگریزی استعمار کے مقابلے میں مفاہمتی بلکہ بعض صورتوں میں بے حد مصلحت کوشانہ تھا، اس لئے ان کی تفسیری و دینی کوششیں حمیتِ دینی کے لئے مضر ہی ثابت ہوئیں۔

(خدام الدین لاہور، ۲۶ ستمبر ۱۹۷۵ء)

عبداللہ بٹ

غیر شعوری طور پر برطانوی سامراج کے ہاتھوں میں آلۂ کار:

سرسید نے جو بیج بویا، اس کی فصل برطانوی حکومت کی وفاداری کی شکل وصورت میں ہمارے سامنے آئی۔ یہ ٹھیک ہے کہ مغربی تعلیم کے تعارف سے سرسید نے مسلمانوں میں ذہنی انقلاب پیدا کیا مگر وہ غیر شعوری طور پر برطانوی سامراج کے ہاتھوں میں آلۂ کار بن گئے۔ وہ مغربی تعلیم کی برائیوں کی روک تھام کا کوئی انتظام نہ کر سکے۔ انہوں نے مسلمانوں کو سیاسی زندگی میں اپاہج اور ناکارہ بنادیا۔

(ابوالکلام آزاد: ص ۱۲۶)

عبدالمجید سالک

اسلام کے متعلق ہمیشہ معذرت آمیز طرزِ بیان:

سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا کے اندازِ تحریر میں ایک بات اہلِ علم کو ہمیشہ کھٹکتی رہی کہ وہ اسلام کے متعلق ہمیشہ معذرت آمیز طرزِ بیان اختیار کرتے تھے اور ہر حالت میں اسلام کو مغربی علوم وخیالات کے مطابق ثابت کرنے کے درپے رہتے تھے۔ بلاشبہ وہ بعض حالات و کیفیات سے بھی مجبور ہوں گے لیکن اصل وجہ وہی تھی کہ دین اسلام اور اس کے فلسفے کے متعلق ان حضرات کا علم ناقص تھا۔

(مسلم ثقافت ہندوستان میں: ص ۱۴۳)

عبیداللہ سندھی

غیر محدود جھوٹ:

پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں ہندوستان کے مسلمان زعمانے کیا کچھ قربانیاں نہیں دیں! محمد علی کو دیکھو، ابوالکلام آزاد کو دیکھو، حسین احمد اپنے استاد اور مرشد کے ساتھ مالٹا میں قید

کردیا جاتا ہے۔ ہم وطن چھوڑ کر کابل جاتے ہیں، اپنی بساط کے مطابق سردھڑ کی بازی لگادیتے ہیں۔ جنگ ختم ہونے کے بعد امرت سر میں جلیانوالہ باغ کا خونی واقعہ ہوتا ہے۔ ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت، تحریک عدم تعاون اور سول نافرمانی کی تحریک اس زورشور سے اٹھتی ہے کہ صرف ہندوستانی مسلمانوں میں سے ہزارہا آدمی جیل جاتے ہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے زبردست شہنشاہیت کے خلاف ہندوستانی مسلمان اٹھتے ہیں، یہ کتنی بڑی ہمت و جرأت کا کارنامہ ہے اور اس میں ہمارے عوام نے کیا کیا قربانیاں نہیں دیں! ..... (دھوکا باز مؤرخین کی نظر میں) یہاں نہ شاہ ولی اللہ ہوئے نہ شاہ عبدالعزیز، نہ یہاں سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید نے جہاد کیا۔ اور ہاں، دارالعلوم دیوبند قسم کی بھی ہندوستان میں کوئی چیز نہ تھی، مولانا قاسم کا بھی یہاں وجود نہ تھا، بس سرسید احمد خاں تھا اور ان کا کالج! خدا کا خوف کرو، جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ جو کچھ انگریز نے کہا وہ مان لیا اور لگے قوم کی تاریخ لکھنے! ..... خدا سے ڈرو۔ ہندوستانی مسلمان کی سیاست صرف انگریز کی وفاداری ہی نہیں رہی، وہ شکست کھا کر بھی انگریز سے لڑتا رہا ہے، تھوڑے بہت اسلحہ سے بھی لیکن فکری، تہذیبی اور جماعتی جنگ اس نے برابر جاری رکھی اور انگریز کے سامنے اس نے کبھی ہتھیار نہیں ڈالے۔ آخر ملت کی یہ بھی تاریخ ہے، اسے تم کیوں بھول گئے؟ یہ دھوکا کب تک چلے گا۔

(افادات وملفوظات: ص ۶۵ تا ۶۸)

ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی

قرآن وحدیث کی معذرت خواہانہ تعبیر وتشریح کا فتنہ:

سرسید کی تمام خوبیوں اور جملہ کارناموں کے باوجود یہ کہنے دیجئے کہ تجدد کی بنیاد آپ نے ہی رکھی ہے۔ قرآن وحدیث کی معذرت خواہانہ اور مرعوبانہ ذہن کے ساتھ تعبیر وتشریح کا فتنہ آپ ہی کے تفسیری مباحث سے شروع ہوا ..... سن ستاون کی جنگ آزادی سے پہلے آثار الصنادید لکھتے ہیں تو سید احمد شہید اوران کی تحریک جہاد کی دل کھول کر تعریف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ یہ تحریک اس لئے برپا کی گئی تھی کہ دین کا کلمہ بلند ہو اور ترویج اسلام ہو ..... لیکن یہی

سرسید مرحوم جب انگریزی تہذیب اور انگریزی حکومت سے سمجھوتہ کی پالیسی پر اُترتے ہیں
اپنی تفسیر اور تہذیب الاخلاق کے مضامین میں یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ اسلام میں اصلاحی،
تبلیغی جہاد ہے ہی نہیں، یہاں تو صرف دفاعی جہاد ہے حالانکہ یہ سب جانتے ہیں کہ سید شہید
تحریک جہاد دفاعی نہیں بلکہ اصلاحی و اقدامی تھی۔

(تاریخ دعوت و جہاد، ص ۲۱۴، ۲۱۳)

تحریک علی گڑھ کی بنیادی خامی:

اس یونیورسٹی سے بحیثیت مجموعی خادم دین و ملت کیوں نہ پیدا ہوئے اور اس تحریک
نے سرکاری ملازمین پیدا کرنے پر ہی اکتفا کیوں کیا؟ کیوں نہ ایسے طلبہ یہاں سے فارغ ہوئے
جو اسلام کا علم لے کر اٹھتے اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا کام انجام دیتے؟ اس کی وجہ اس کے سوا
کچھ نہیں کہ یہاں تحریک میں بنیادی خرابی موجود تھی جس سے مطلوبہ مقاصد حاصل نہ ہوئے
تھے۔ مغربی علوم وفنون کو جوں کا توں بغیر تنقید و تجزیہ قبول کرلیا گیا جس کی وجہ سے طلبہ مغربی افکار
پر ایمان لاتے چلے گئے اور علوم اسلامیہ کی آمیزش بھی کی گئی تو اس طرح کہ جدید تعلیم اور جدید
تربیت کے ساتھ اسے کوئی مناسبت ہی نہ تھی۔ اساتذہ بھی اکثر خدا بیزار اور متفرنج تھے جو اپنے
قول و عمل اور افتاد و کردار سے اسلام کی تصویر پیش کرنے کی بجائے غیر اسلام کی نمائندگی کرتے
رہے۔ فلسفہ وہ پڑھایا گیا جو کائنات کے مسئلہ کو خدا کے بغیر حل کرنا چاہتا ہے، اس سائنس کی تعلیم
دی گئی جو معقولات سے منحرف اور محسوسات کی غلام ہے۔ تاریخ، سیاسیات، معاشیات، قانون
اور تمام علوم عمرانیہ کی وہ تعلیم دی گئی جو اپنے اصول سے لے کر فروع تک اور نظریات سے لے کر
عملیات تک اسلام کے نظریات اور اصول عمران سے یکسر مختلف تھے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ حالی، جو
سرسید کے زبردست مداحوں میں سے ہیں، علی گڑھ کی تعلیم سے آخری وقت میں مایوس ہوگئے
تھے۔ وقار الملک، جو سرسید کے رفقائے کار میں سے تھے، سرسید کی اس تعلیمی پالیسی سے ناراض
تھے۔ (ایضاً ص ۲۱۸)

دو جہاتی تصورِ قومیت:

سرسید مرحوم کے تصور قومیت پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ عام طور سے مسلمان

قلمکاروں نے انہیں متحدہ قومیت کا علمبردار قرار دیا ہے۔ بعض ایسے مسلمان مصنفین بھی ہیں جن کی تحقیقات نے ان کے تصور قومیت کو فرقہ وارانہ رنگ دے دیا ہے جبکہ بعض لوگوں نے ان کی تحریروں میں ابہام، ژولیدگی اور تضاد بیانی بھی دریافت کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سرسید مرحوم کا تصور قومیت دو جہاتی ہے۔ اس کی ایک جہت تمدنی وثقافتی اور دنیاوی ہے اور دوسری جہت تہذیبی، مذہبی اور خالص نظریاتی واصولی۔ جہاں انہوں نے غیر مسلموں کو بھی مسلم قوم کے پہلو میں شمار کیا ہے وہاں دنیاوی اور تمدنی تناظر میں انہوں نے لفظ قوم کو لیا ہے۔

(مجلہ علوم اسلامیہ علی گڑھ، مارچ ۲۰۰۱ء، ص ۱۹۹)

عتیق صدیقی

تحریک جہاد کے سیاسی کردار کو مسخ کرنے کی پہلی کوشش:

انگریزوں کے باب میں بریلوی سید کے نظریات دہلوی سید سے یک سر مختلف، بلکہ متضاد تھے۔ شاید یہ نتیجہ تھا دونوں کے مکان وزمان کے اختلاف کا۔ بہر کیف دہلوی سید نے جن انگریزوں کو ۱۸۴۵ء میں شاہان ہند کی فہرست میں شامل کر لیا تھا، اس سے چوتھائی صدی قبل انہیں ہندوستان سے نکال باہر کرنے پر بریلوی سید نے کمر ہمت کسی تھی...... اس حیلہ باز اور مکار قوم کے تسلط کو ختم کرنے کے لئے بریلوی سید نے جو تحریک جہاد شروع کی تھی، وہ ناکام رہی۔ وہ خود اور ان کے بیشتر ساتھی شہید ہوئے، لیکن ان کی شہادت کے بعد بھی کم وبیش نصف صدی تک ان کی تحریک زندہ رہی۔ تمام مؤرخ اس بات پر متفق ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں بھی ان کی تحریک کے باقیات نے نمایاں حصہ لیا۔ بغاوت کی ناکامی کے بعد بھی اس تحریک نے اپنے آخری دور میں بنگال، بہار اور شمالی ومغربی ہند کے سرحدی علاقے میں بارہ تیرہ سال تک برطانوی اقتدار کو ناکوں چنے چبوائے اور دہلوی سید کی اس تحریک کے لئے وبال جان بنی رہی جو بغاوت کی ناکامی کے بعد شروع ہوئی تھی اور جس کے مقاصد ان کے پیش رو تحریک سے یک سر متضاد تھے...... یہ بھی قابل ذکر ہے کہ سید احمد شہید کی تحریک کے سیاسی کردار کو مسخ کرکے پیش کرنے کی پہلی کوشش بھی سرسید ہی نے کی۔ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب ''ہمارے ہندوستانی

مسلمان'' پر تبصرہ کرتے ہوئے سرسید نے سید احمد شہید کی تحریک کا دائرہ مذہبی اصلاح اور سکھ دشمنی تک محدود کردیا۔

(سرسید احمد خاں، ایک سیاسی مطالعہ: ص ۱۷،۱۹)

اسباب بغاوت ہند کا ''مبینہ'' کارنامہ:

''اسباب بغاوت ہند'' کے بارے میں گزشتہ ایک صدی میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اسے سرسید کے کارناموں میں شمار کیا گیا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی ترتیب و تالیف کے حقیقی محرکات کا تجزیہ کرنے سے ارادی یا غیر ارادی طور پر اغماض برتا گیا ہے۔ یہ حیرت ناک ہے کہ کسی کا بھی ذہن اس حقیقت کی طرف منتقل نہ ہو سکا کہ ''اسباب بغاوت ہند'' کے اندراجات اس نئی برطانوی حکومت کی پالیسی کے عین مطابق تھے جو اپنی پیش رو ایسٹ انڈیا کمپنی کو مطعون کرنے کے درپے تھی۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ''اسباب بغاوت ہند'' کو سرکاری حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ حالی کی روایت کے مطابق اس کتاب کے ''سرکاری طور پر متعدد ترجمے ہوئے، انڈیا آفس میں اس کا ترجمہ ہوا، گورنمنٹ آف انڈیا میں اس کا ترجمہ ہوا، پارلیمنٹ کے بعض ممبروں نے بھی اس کا ترجمہ کیا'' ...... یہ بھی قابل ذکر ہے کہ ''اسباب بغاوت ہند'' کے انگریزی ترجمے کی اشاعت سے پہلے لارڈ کیننگ گورنر جنرل اور مسٹر بارٹل فریر نے، جو کونسل کے ممبر تھے، اس۔ کے مضمون کو محض خیر خواہی پر محمول کیا تھا۔ (ایضاً: ص ۳۹)

اسباب بغاوتِ ہند کی تالیف کے محرکات کو اگر وسیع تر تحقیق کا موضوع بنایا جائے تو یہ بیان مبالغے پر مبنی نظر آئے گا کہ اس کتاب کو ''توپ کے منہ کے سامنے بیٹھ کر ایک ملازم سرکار نے لکھا تھا''۔ (ایضاً: ص ۴۲)

برطانیہ دوستی سے برطانیہ پرستی تک:

سرسید کی برطانیہ دوستی کے ڈانڈے یقیناً برطانیہ پرستی سے مل جاتے تھے لیکن اس کا منبع حُبِ برطانیہ کو قرار دینا ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ مدرستہ العلوم کو، جس کا دوسرا نام محمڈن اینگلو اورینٹل کالج ہوگیا تھا، سرسید کی برطانیہ دوستی کا قطب مینار کہنا غلط نہ ہوگا لیکن اس قطب مینار کی تعمیر

بھی، خود ان کے نقطہ نگاہ کے مطابق، قومی و ملکی بھلائی کے منصوبے پر مبنی تھی ...... اسی جذبے کے تحت تاج سے ''وفاداری بشرط استواری'' ہی کو وہ اصل ایمان میں جانتے تھے اور یہ ان کی ارادی کوشش تھی کہ مدرستہ العلوم کا ہر طالب علم پکا برطانیہ پرست بن جائے اور برطانوی پرچم ہی کو اپنا قومی نشان سمجھے۔ سرسید کی یہ برطانیہ پرستی آج ہمیں کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ اس دور میں سب ہی اس حمام میں ننگے تھے۔ (ایضاً: ص ۳۱۳)

نقالی کا نتیجہ:

سرسید کے باب میں محسن الملک سے زیادہ کوئی اور مستند راوی نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے لاہور کے عام جلسے میں سرسید کا تعلیمی نظریہ بیان کرتے ہوئے نہایت واضح الفاظ میں کہا تھا کہ:

> ''سرسید مسلمانوں کا ایسا طبقہ پیدا کرنا چاہتے تھے جو از روئے مذہب مسلمان ہو، از روئے خون و رنگ ہندوستانی ہو مگر باعتبار مذاق، رائے اور فہم کے انگریز ہو''۔

میکالے نے یہی بات مدرستہ العلوم کے وجود میں آنے سے نصف صدی قبل انگریزی تعلیم کے جواز میں گورنر جنرل کی کونسل میں کہی تھی کہ ہندوستانیوں کا ایک ایسا طبقہ وہ پیدا کرنا چاہتا ہے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہو مگر مذاق، رائے، اخلاق اور فہم کے اعتبار سے انگریز ہو۔ اپنے اسی نظریے کے تحت سرسید نے مدرستہ العلوم مسلمانان کو آکسفورڈ اور کیمبرج کے سانچوں میں ڈھالنے اور ہر بات میں ان کی نقل اتارنے کی کوشش کی تھی ...... اس ظاہری نقالی کا افسوس ناک نتیجہ تعلیمی معیار کی گراوٹ کی شکل میں سامنے آیا، چنانچہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی رپورٹ کے مطابق ۱۸۸٦ء میں:

> ''مدرستہ العلوم علی گڑھ کا نتیجہ امتحان سب سے بدتر رہا۔ اس کالج سے آٹھ طالب علم بی اے کے امتحان میں گئے تھے، پانچ مسلمان اور تین ہندو۔ ان میں سے صرف دو شخص سید کرامت علی اور ولایت حسین نے آرڈینری امتحان بی اے پاس کیا، باقی سب فیل ہوگئے۔ اس سے زیادہ اور کیا بدتر نتیجہ کسی کالج کے لئے ہوسکتا ہے''۔ (ایضاً: ص ۱۷۴۔۱۷۵)

عزیز الرحمٰن جامعی

مسلمانوں کو دانشِ فرنگ کی تدریس:

ہندوستان کی قومی زندگی میں سرسید نے مسلمانوں کو دانشِ فرنگ کا سبق پڑھایا اور شاہین بچوں کو خاک بازی کا ایسا سبق دے گئے کہ پھر علی گڑھ یونیورسٹی کی آغوشِ عافیت کوش سے نکلنے والے نوجوان انگریز کی غلامی کے نشے میں مست ہو کر نکلتے رہے۔ تحریکِ حریت میں ہر ہر قدم پر انگریز کی غلامی کو حقِ غلامی کو ادا کرنا علی گڑھ کے فرزند ارجمند کا کام تھا۔

(رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی: ص ۲۱۵)

عقیدت اللہ قاسمی

سرسید کے نام پر علما سے بیزار کرنے کا سلسلہ:

اسلام مخالف طاقتیں اپنا بھرپور زور اس بات پر صرف کر رہی ہیں کہ جس طرح بھی ممکن ہو، مسلمانوں کو دینِ اسلام سے دور اور متنفر و بیزار کر دیں اور اس کا طریقہ ان کی نظر میں وہی ہے جو اسپین، بخارا، تاشقند اور سمرقند وغیرہ میں آزمایا جا چکا ہے کہ مسلمانوں کو علمائے اسلام سے بیزار کر دیں، کیونکہ جب تک ...... یہ سخت جان قوم اسلام سے جڑی رہے گی اس کے اتحاد کا شیرازہ بکھر نہ سکے گا، اس کے اندر سے قومی غیرت وحمیت ختم نہ ہوگی۔ افسوس کہ مسلمانوں کی صفوں میں گھس کر کالی بھیڑیں اسلام دشمن طاقتوں کے اس مشن کی تکمیل دوسرے طریقوں کے ساتھ ساتھ سرسید احمد خاں کا نام لے کر اور ترقی کا نعرہ لگا کر کرتی ہیں...... تاریخی حقیقت تو یہ ہے کہ دینی مدارس سے تعلق رکھنے والے حق پسند علما نے سرسید یا کسی اور کی انگریزی تعلیم کی تحریک کی کبھی مخالفت نہیں کی۔ جن لوگوں نے سرسید کی تعلیم کی تحریک کی مخالفت کی وہ دینی مدارس سے تعلق رکھنے والے مولوی نہیں، خود سرسید احمد خاں کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے سرکار انگلشیہ کے وفادار، نمک خوار اور معزز افسر تھے...... یہ حالات کی ستم ظریفی ہے کہ چونکہ آج کے لوگ اس زمانہ کے تعلیمی نظام اور نصاب کے بارے میں نہیں جانتے جس کے تحت علم

حاصل کرنے والا ہر شخص مولوی کہلاتا تھا (چنانچہ خود سرسید بھی ''سر'' کا خطاب ملنے سے پہلے ''مولوی'' کہلاتے تھے) اس لئے جب وہ سرسید کے مخالفوں کے ناموں کے ساتھ لفظ ''مولوی'' لکھا دیکھتے ہیں تو ایک خاص تصور اُن کے ذہنوں میں بیٹھ جاتا ہے۔ وہ آج کے زمانہ کے مسٹروں کے مقابلہ میں مولوی کہلانے والے مولوی مراد لیتے ہیں.....اور چونکہ ان لوگوں کی نظروں میں نہ ایمان وعقائد کی کوئی اہمیت ہے نہ اصل حقائق کا پتہ چلانے سے انہیں کوئی دلچسپی ہے، وہ صرف مسلم یونیورسٹی کی شکل میں ہی سرسید کو دیکھتے ہیں اس لئے اٹھتے بیٹھتے شور مچاتے رہتے ہیں کہ مولویوں نے مسلم یونیورسٹی کی مخالفت کی تھی اور انگریزی تعلیم کی وجہ سے سرسید کے خلاف کفر کے فتوے لگائے تھے جبکہ اصل مخالفین کے نام تاریخ کے اوراق میں دفن ہوکر رہ گئے اوران کے اوپر دھول کی دبیز تہ جم گئی۔

(دارالعلوم دیوبند، مارچ اپریل ۲۰۰۱:ص ۱۰۱تا۱۰۳)

ڈاکٹر عقیل احمد صدیقی

پیچیدہ اور تضادات کی حامل فکر:

سرسید کی فکر اپنے عہد کی طرح پیچیدہ بھی ہے اور اپنے عہد ہی کی طرح تضادات کی حامل بھی۔ وہ موافقین کے لئے مصلح قوم، محسنِ قوم، جدیدیت کے بانی ایک عہد ساز شخصیت ہیں جبکہ مخالفین کے نزدیک وہ لامذہب، مغرب پرست، روایت شکن، کلچر مخالف شخص ہیں۔ سرسید کی فکر میں دونوں گروہ کے لئے مضبوط دلائل موجود ہیں۔

(فکر ونظر علی گڑھ، سرسید نمبر ۱۹۹۲ء: ص ۶۵)

انتہاپسندی اور فرقہ پرستی کا الزام:

سرسید کے سیاسی خیالات بتدریج تبدیل ہوئے ہیں۔ ۱۸۸۵ء میں کانگرس کے قیام کے بعد سرسید کے سیاسی خیالات میں شدت آئی اور انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی حقوق کا شدید مطالبہ کردیا۔ یہ ان کی زندگی کے آخری دس بارہ سالوں کے خیالات ہیں جن کا سہارا لے کر ارون شوری نے سرسید پر انتہاپسندی اور فرقہ پرستی کا الزام عائد کیا

ہے۔ یہاں ہم سب کو اعتذار کا لہجہ اپنانے کی قطعی ضرورت نہیں۔ اگر یہ تصورات انتہا پسند
تھے تو سب کو مان لینا چاہیے کہ سیاسی نظریات ہمیشہ ہی کسی ملک اور معاشرے کی بنیادی
ضرورت کے تابع ہوتے ہیں۔ اگر یہ تصورات آج غلط معلوم ہوتے ہیں تو اس کی وجہ یہ
ہوسکتی ہے کہ سرسید ''پس منظر کی صحیح جانکاری'' نہ رکھتے ہوں لیکن ان تصورات کو سرسید
بنیادی نظریہ کا جزو لاینفک قرار دینا خود اپنی دانش وری کو مشکوک بنانا ہے۔ بہرحال سرسید
کسی بھی مداح کے لئے عبوری دور کے ان سیاسی خیالات کی پیش کش سے شعوری گریز یا
کی کمزوری تھامنا اس لئے خوش آئند نہیں کہ اس طرح سرسید وہ نہیں رہیں گے جیسا کہ وہ تھے
بلکہ وہ ایسے بن جائیں گے جیسا ہم ان کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ (ایضاً ص ۲۷)

علی ارشد

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک فراموش شدہ غدار:

سرسید کے درجنوں تذکرے لکھے گئے۔ کتنے ہی عالم و فاضل حضرات کے سینکڑوں
مضامین اور مقالے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے اور ہوتے رہتے ہیں لیکن کسی نے
۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں سرسید احمد خاں کے وفادارانہ (یا غدارانہ) کردار پر کوئی خاص
روشنی نہیں ڈالی ...... ہم سرسید احمد کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ''تاریخ سرکشی ضلع بجنور'' میں
حقائق و واقعات کو دیانتداری سے لکھا، اپنی وفاداریوں اور کارگزاریوں کا ذکر فخریہ انداز میں
کیا۔ واقعتہً سرسید نے تاریخ سرکشی بجنور میں بیباکی اور جرأت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہوسکتا ہے
اس ''دیدہ دلیری'' کی وجہ یہ ہو کہ جب تاریخ لکھی گئی تو انگریز بہادر کے ساتھ ان کی
وفاداری ''مسلم'' ہو چکی تھی...... ''معمولی خوشامد اور تھوڑی سی وفاداری'' کی تاویل یہ کی جاتی
ہے کہ سرسید کی بصیرت، دوراندیشی و پیش بینی نے بھانپ لیا تھا کہ اب ہندوستان میں انگریز
بہادر کا راج قائم ہو کر رہے گا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر صورت حال یہی ہے تو میر جعفر کی
''مومنانہ فراست'' کو کیا کہیں گے جس نے سرسید سے ایک سو برس قبل اس حقیقت کو جان لیا تھا۔
ہائے رے بدقسمت میر جعفر، اگر مرشدآباد میں کوئی کالج قائم کر دیتا تو آج ننگ دیں، ننگ قوم

ننگِ وطن کی بجائے سر، خان بہادر یا شمس العلما ہوتا، جس طرح آج سر سید غدار کی بجائے مصلح، نجات دہندہ اور دو قومی نظریہ کے بانی ہیں جب پوری قوم تحریک آزادی میں شکست کھانے کے بعد زخموں سے چور اور بے حال تھی تو سر سید احمد خاں یوں نمک پاشی کرتے ہیں:

''تم نے اللہ تعالیٰ کے احسانات کا شکر ادا نہیں کیا، اس کا وبال تم پر پڑا اور چند روز تغیر عملداری کر کے تم کو مزہ چکھا دیا۔ حکمتِ الٰہی اس میں یہ تھی کہ تم اب ہماری سرکار انگلشیہ کی عملداری کی قدر جانو اور اس کے سایۂ حمایت کو اپنے سر پر ظلِ ہما سے بہتر سمجھ کر خدا کا شکر ادا کرتے رہو۔''

(''الحق'' اکوڑہ خٹک، اگست ۱۹۸۶ء: ص ۵۱ تا ۵۴)

عنایت اللہ خاں مشرقی

انگریزوں کی نہایت مکروہ سازش:

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد انگریزوں کو اپنی حکومت کو مضبوط کرنے کے لئے ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو مسلمانوں کے جذبۂ جہاد کو ٹھنڈا کر کے ان کو انگریزوں کا مطیع بنائیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک ممتاز مسلمان سر سید احمد خاں کو پکڑا جو دفتر میں اُن کا ملازم تھا۔ اس کو اپنے گوں کا بنایا اور مسلمانوں کی قوم کو نامرد کرنے کے لئے اس شخص کے ذریعہ سے اسلام کے نئے نئے روپ دکھلائے۔ اُس وقت کے مولوی، سید احمد خاں کے خلاف بہت چیخے چلائے، ان پر کفر کے فتوے لگائے، ان کو ملحد اور بے دین کہا لیکن حکومت کے پشت پناہ ہوتے ہوئے مولویوں کی کون سنتا تھا۔ سید احمد خاں نے نہایت دھڑلے سے پہلے علی گڑھ سکول، پھر علی گڑھ کالج کی بنیاد ڈالی..... ایک تفسیر قرآن لکھی جو انگریزوں کے نقطہ نظر سے اسلام کی تیزی کو کند کرنے والی تھی۔ الغرض مسلمانوں کے خلاف اپنے خیر خواہوں کے اس گروہ کو تیار کرنا انگریزوں کی ایک نہایت مکروہ سازش تھی۔

(بحوالہ تذکرہ لاہور، مئی ۱۹۷۶ء: ص ۲۳)

سر سید احمد خاں نے پہلی دفعہ ہندوستان میں جہاد بالسیف کے متعلق اعلان کیا کہ وہ دین

اسلام میں منسوخ شدہ ہے اور اس مطلب کے لئے تفسیر قرآن بھی لکھی جس میں لکھا کہ انگریز کی اطاعت کا حکم قرآن میں ہے۔ یہاں تک لکھا کہ جب اسلام میں کالے کلوٹے اور شلغم جیسے سر والے حبشی کی اطاعت لازم ہے تو گورے چٹے انگریز کی کیوں نہ ہوگی۔ (ایضاً)

سرسید احمد خاں نے اس خیال سے کہ کانگرس ہندوؤں کی بنائی ہوئی شے ہے، مسلمانوں کو اس میں شامل ہونے سے ایک بڑی مدت تک باز رکھا اور حضرت سید احمد بریلوی اور حضرت اسماعیل شہید کی مجاہدانہ تحریکوں کی طرح، جو اس سے پہلے ہندوستان میں انگریزوں کی سلطنت کی بیخ بنیاد اکھیڑنے کے لئے رائج ہوئی تھیں، کانگرس کو بھی انگریزوں کے خلاف ایک تحریک سمجھ کر مسلمانوں کو اس سے الگ رکھنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان سیاست میں ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ گئے اور سرسید کی فرنگیانہ سیاست کے پیرو ہوتے گئے۔ (ایضاً)

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

مرض کے علاج میں غیر پسندیدہ شدت:

سرسید نے مولویوں سے ضرور بے زاری ظاہر کی تھی اور کوشش کی تھی کہ مذہب اسلام پر سے نادانی کی گھٹائیں دور کی جائیں لیکن بعض موقعوں پر انہوں نے غالباً مرض کی شدت کو دور کرنے کے لئے علاج میں بھی ایسی شدت برتی کہ وہ پسندیدہ نہیں ہو سکتی، مثلاً سید حسین بلگرامی کو لکھتے ہیں کہ

''میں تو ان صفات کو، جو ذات نبوی میں جمع تھیں، دو حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔ ایک سلطنت اور ایک قدوسیت۔ اول کی خلافت حضرت عمر کو ملی، دوسری کی خلافت حضرت علی وائمہ اہل بیت کو۔ مگر یہ کہہ دینا تو آسان ہے لیکن کس کو جرأت ہے کہ اس کو لکھے؟ حضرت عثمان نے سب چیزوں کو غارت کر دیا۔ حضرت ابوبکر تو صرف برائے نام بزرگ آدمی تھے۔ پس میری رائے میں ان بزرگوں کی نسبت کچھ لکھنا اور مؤرخانہ تحریرات کا زیر مشق بنانا نہایت نامناسب ہے، جو ہوا سو ہوا، جو گزرا سو گزرا''۔

(حالی کا ذہنی ارتقا: ص ۳۰۷)

سید فاروق حسین

ترقی پسندانہ جنون اور عقلی جمود:

ہم ترقی پسندی کی آڑ میں دہرے معیار کا شکار ہیں اور وہ صرف ذاتیات تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اس سے آگے ہم ذہنی ترقی کر ہی نہیں پائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سرسید کو ترقی پسند قرار دیتے ہوئے ان پر کسی بھی قسم کی تنقید کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ نہ جانے وہ کیسے ترقی پسند تھے جو قوم کو ساری عمر یہی درس دیتے رہے کہ

> ''کیا ہمارے ملک کے رئیس اس کو پسند کریں گے کہ ادنیٰ قوم یا ادنیٰ درجہ کا آدمی، خواہ اس نے بی۔اے کی ڈگری لی ہو یا ایم۔اے کی، اور گو کہ وہ لائق بھی ہو، ان پر بیٹھ کر حکومت کرے اور ان کے مال و جائداد اور عزت پر حاکم ہو؟ کبھی نہیں، کوئی ایک بھی پسند نہیں کرے گا۔ گورنمنٹ کی کونسل کی کرسی نہایت معزز ہے۔ گورنمنٹ مجبور ہے کہ سوائے معزز کے اور کسی کو نہیں بٹھا سکتی۔''

اسی طرح سرسید کے بہت سے نظریات کو مذہب سے قطع نظر کر کے سیاسی اور زمینی حقائق کی بنیاد پر پرکھا جائے اور پھر ان پر غور و فکر کیا جائے کہ وہ ہمارے قومی و سیاسی مفادات سے کس حد تک مطابقت رکھتے ہیں؟ بغیر تحقیق و تنقید کے ہر بات کو درست تسلیم کر لینا اندھی تقلید اور سطحی ذہنیت کا مظہر تو ہو سکتا ہے، روشن خیالی نہیں...... اگر واقعتاً ہم صحیح نتائج کے حصول اور مکالمے کی ترقی چاہتے ہیں تو ہمیں ایسی روش کو ترک کرنا ہوگا اور تصویر کے دونوں رُخ سامنے لانے ہوں گے۔ دوسری صورت میں ترقی پسندانہ جنون، جو کہ ایک شوق اور فیشن کی حیثیت اختیار کر گیا ہے، اس سے سطحیت کے تماشے تو اکثر دیکھنے کو مل جاتے ہیں، کوئی سنجیدہ نوعیت کی مثال سامنے نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ تمام تر دعووں کے باوجود ہم آج بھی وہیں کھڑے ہیں۔ بہر حال کسی شخصیت کے بارے میں یہ سمجھ لینا کہ اس سے کوئی کوتاہی یا غلطی سرزد نہیں ہو ہی نہیں سکتی اور وہ تنقید سے ماورا ہو گئے، یہ عقلی جمود کی نشاندہی ہے۔

(نیاز زمانہ لاہور، مارچ ۲۰۰۵ء، ص ۴)

پروفیسر فتح محمد ملک

غریب وغیور مسلمان بمقابلہ لائل محمڈنز آف انڈیا:

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سے لے کر بلادِ اسلامیہ ہند کی سیاسی ہستی کی وفات تک ڈیڑھ سو سال پر پھیلا ہوا دورایسٹ انڈیا کمپنی کے پالتو میر جعفروں اور میر صادقوں کی ملت فروشی اور غریب وغیور مسلمانوں کی سرفروشی کا عہد ہے۔ ۱۸۵۷ء میں برٹش انڈین ایمپائر کے قیام کا اعلان ہمارے ہاں ایک نئے تاریخی شعور کی سوغات بھی لایا۔ انگریزوں کے دئے ہوئے تاریخی شعور نے ہمیں ذلت اور عزت کے معیار دئے۔ اس نئے تاریخی شعور کی رو سے گزشتہ ڈیڑھ صدی کے دوران مقبول عام ہونے والی مجاہد شخصیتیں اور حریت پسند تحریکیں گردن زدنی ٹھہریں اور انہیں طرح طرح سے بدنام کرنا مؤرخ کا فرض منصبی ٹھہرا۔ سرسید احمد خاں کی کتاب ''لائل محمڈنز آف انڈیا'' کا پہلا حصہ طبقہ اشراف کی ان شخصیات کی خدمات کی خراج تحسین پر مشتمل ہے جنہوں نے ۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران قوم سے غداری اور ایسٹ انڈیا کمپنی سے وفاداری کے صلے میں جاگیریں حاصل کی تھیں۔ کتاب کے دوسرے حصے میں مجاہدین آزادی کے طرزِ عمل کو درج ذیل الفاظ میں غیر اسلامی ثابت کیا تھا:

''جہاد کا مسئلہ مسلمانوں میں دغا اور بے ایمانی اور غدر اور بے رحمی نہیں ہے جیسے کہ اس ہنگامے میں ہوا۔ کوئی شخص بھی اس ہنگامہ مفسدی اور بے ایمانی اور بے رحمی اور خدا کے رسول کے احکام کی نافرمانی کو جہاد نہیں کہہ سکتا بلکہ مسلمانوں کے مذہب کے بموجب ہماری گورنمنٹ کی عملداری میں جہاد نہیں ہوسکتا کیونکہ ہم تمام مسلمان ہندوستان کے برٹش گورنمنٹ کے امن میں ہیں، اور مستامن ان لوگوں پر جن کے امن میں ہے، جہاد نہیں کرسکتا''۔

[مقالہ نگار کے انگریزی ترجمے کی بجائے حوالے کا اصل اردو متن (ناقل)]

اپنی اسی کتاب میں سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو دو نظریاتی گروہوں میں تقسیم کردیا ہے۔ ایک طرف غریب وغیور مسلمان ہیں تو دوسری جانب سلطنت برطانیہ کے وفادار مسلمان یعنی

''لائل محمڈنز آف انڈیا'' ہیں۔ اس منطق کی رو سے یہ بات قدرتی معلوم ہوتی ہے کہ برطانوی ہند کے قیام کے نتیجہ میں غریب وغیور مسلمان تو سزا پائیں اور انہیں ''جہادی'' کے اسم تحقیر کے ساتھ یاد کیا جائے مگر ''لائل محمڈن'' یعنی سرکاری وفاداری کا دم بھرنے والے مسلمان انعام و اکرام پائیں۔

(نوائے وقت لاہور، ۱۰ مئی ۲۰۰۲ء، صفحہ اداریہ)

ڈاکٹر فوق کریمی

بغاوت میں کھل کر انگریزوں کی مدد:

سید صاحب نے ''سرکشی بجنور'' کے دیباچہ میں جو کچھ لکھا ہے اور ہم اسے تسلیم بھی کرتے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ سچ ہے لیکن اس پوری کتاب میں جہاں جہاں نواب محمود خاں اور ان کے ساتھیوں کا انگریزوں سے مقابلہ ہوا اور اس مقابلے میں انگریزوں کو جو فتح حاصل ہوئی ہے اس کا اظہار سید احمد خاں نے اس طرح کیا ہے کہ یہ فتح انگریزوں کی نہیں بلکہ خود سید احمد خاں کی ہے۔ نواب اور ان کے ساتھیوں کے ہر عمل واقدام کو سید صاحب نہایت حقارت سے دیکھتے ہیں اور نواب کی شکست پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں، اور انگریزوں کے ہر فعل پر خوش ہوتے ہیں، انگریز حاکموں کی ہر بات کو دانش مندانہ قرار دیتے ہیں اور بغاوت میں کھل کر انگریزوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ آج ہم ان کے خیالات کو اُن کی تحریروں میں پڑھتے ہیں تو ہمیں سید صاحب کی انگریز دوستی سے تکلیف ہوتی ہے......

(سرسید کے سیاسی افکار: ص ۸۴)

مسلمانوں کے عقائد کے خلاف بات:

انہوں نے انگریزوں کو یہ مشورہ دیا کہ ہندو اور مسلمان فوجیں الگ الگ ترتیب دی جاتیں تو ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ممکن تھا کہ نہ ہوتا۔ وہ اس کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ فوج میں ہندو اور مسلمان آپس میں ایک برادری کی حیثیت سے رہتے تھے اور اس میں اسی سبب سے ہندو اور مسلمان کی تمیز نہ تھی۔ جہاں تک ان کے سیاسی افکار کا تعلق ہے، انہوں نے زندگی کے بیشتر دور

میں ہمیشہ ہندو اور مسلمانوں کو ایک قوم اور ایک آنکھ سے مشابہت دی ہے۔ ان کی اس تحریر میں اس ذہن کی ترجمانی ملتی ہے جو ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد کچھ ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں ہی کو غدر کا محرک قرار دیا گیا۔ انگریزوں کے اس انتقام کی چنگاری اس میں پائی جاتی ہے کہ اس نے صرف مسلمانوں ہی کو اپنا دشمن سمجھ لیا لہٰذا ہندو اور مسلمانوں کے نام سے فوجوں کی تقسیم اس کا ردِ عمل تو ہو سکتا ہے، ان کے وسیع سیاسی خیالات کی نشان دہی نہیں ہوتی۔ دوسرے انہوں نے مذکورہ عبارت میں یہ کہا ہے کہ اگر مسلمانوں کی پلٹن الگ کردی جاتی ہے تو ان کے خیال میں مسلمانوں کی پلٹن جدید کارتوس کے کاٹنے میں بھی عذر نہ کرتی، یہ بات بھی قطعی مسلمانوں کے عقائد سے ہٹ کر کہی گئی ہے۔ مسلمان اور وہ بھی ۱۸۵۷ء کا فوجی مسلمان کبھی بھی سؤر کی چربی کے کارتوس اپنے دانتوں سے نہ کاٹتا۔ (ایضاً)

سماجی اونچ نیچ کے زیرِ اثر محض طبقہ اشرافیہ کی ترجمانی:

ادنیٰ درجہ کا آدمی خواہ اس نے بے اے یا ایم اے کی ڈگری کیوں نہ لی ہو اور وہ لائق بھی ہو لیکن وہ اس لئے قابل احترام نہیں تھا کہ کسی رئیس یا جاگیردار کا بیٹا نہیں ہے اس لئے وہ وائسرائے کی کونسل میں بیٹھنے کا مستحق نہیں سمجھتے تھے۔ وہ ولایت کے ایک درزی کے بیٹے کا استقبال تو بحیثیت ایک آفیسر کے ہندوستان میں کرتے ہیں لیکن ایک معمولی ہندوستانی اگر وہ سول سروس کے امتحان میں کامیاب ہو جائے تو وہ اس لئے قابلِ عزت نہیں ہے کہ وہ معمولی ہندوستانی قوم کا فرد ہے۔ اصل میں سرسید کا ذہن ہندو قوم کی اس سماجی اور مذہبی زندگی کی نمائندگی کر رہا تھا جس نے ہندو قوم کو ہندو سماج میں مختلف اونچے نیچے خانوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ سول سروس کا امتحان اگر ہندوستان میں شروع ہوتا جس کے سرسید مخالف تھے تو کیا پہاڑ ٹوٹ پڑتا؟ انہیں اندیشہ اس بات کا تھا کہ اگر یہ امتحان ہندوستان میں شروع ہو گئے تو بنگالی ہندو زیادہ کامیابی حاصل کریں گے اور مسلمان اور ہندوؤں کی دوسری قومیں زیادہ ان امتحانات سے فائدہ حاصل نہ کرسکیں گی۔ اچھا، فرض کیجئے، تھوڑی دیر کے لئے یہ مان بھی لیا جائے کہ سول سروس کا امتحان ولایت میں ہی ہوتا تب بھی ہندوؤں کا ایک طبقہ جو مسلمانوں اور عام ہندوؤں سے تعلیم اور اقتصادی اعتبار سے خوش حال تھا، وہ ولایت جا سکتا تھا۔ مسلمان پھر بھی گھاٹے

میں رہتے۔ سرسید کی یہ منطق کہ سول سروس کا امتحان ولایت میں ہو، یہ سرسید کے اُن شرفا، امرا کی نمائندگی کرتی ہے جو اُن کے ذہن میں اٹھارہ سو ستاون کے ہنگاموں کے بعد سما گئے تھے۔

(ایضاً ص ۲۴۸)

سرسید صاحب کا یہ نظریہ ان کی سیاسی زندگی اور تحریک میں ہمیں متعدد جگہ ملے گا۔ اس سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ سرسید اصل میں ان لوگوں کو سربلند دیکھنا چاہتے تھے جو جاگیردار یا اپنے آپ کو اعلیٰ اور شرفا کی ایک الگ صف میں رکھتے تھے۔ (ایضاً: ص ۱۰۹)

مزاج کی انتہا پسندی اور متضاد نظریات کا اظہار:

سرسید نے کانگرس کی مخالفت ہمارے خیال میں کچھ تو مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی پستی کے باعث اور کچھ مسٹر تھیوڈور بیک کی ہمہ وقت قربت سے متاثر ہوکر کی۔ یہی وجہ ہے کہ کانگرس کی مخالفت میں انہوں نے بڑی حد تک انتہا پسندی سے کام لیا اور مخالفت کے جو اسباب انہوں نے اپنی تقریروں میں بیان کئے، ان میں کچھ دلائل تو ایسے ہیں کہ جن سے اتفاق کیا جاسکتا ہے اور بعض باتیں ایسی بھی ہیں جن سے ہم متفق نہیں ہوسکتے، اور جن باتوں سے ہم متفق نہیں ہوسکتے وہی باتیں سرسید کے مزاج کی انتہا پسندی کی نشان دہی کرتی ہیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں بڑے متضاد نظریات کا اظہار کیا ہے۔ (ایضاً: ص ۲۳۴)

مدرسۃ العلوم — متحدہ قومیت کا اعلیٰ نمونہ:

سرسید نے اس مدرسۃ العلوم کے ذریعہ جو متحدہ قومیت کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا وہ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ سرسید کی ۲۳ سالہ سیکرٹری شپ کے دوران میں اس کالج سے ۱۲۰ طلبہ گریجویٹ ہوئے جس میں ۹۷ مسلمان تھے اور ۲۳ ہندو۔ آج بھی اس یونیورسٹی کا چشمہ فیض بلا امتیاز مذہب و ملت ہر ایک ہندوستانی کے لئے جاری ہے اور اب تک لاکھوں نوجوانانِ وطن نے اس سے استفادہ حاصل کر کے ملک اور قوم کی اعلیٰ خدمات انجام دی ہیں۔ راجہ مہندر پرتاب سنگھ، ڈاکٹر کچلو، ڈاکٹر سید محمود، مولانا محمد علی، مولانا حسرت موہانی، قاضی عبدالغفار، رفیع احمد قدوائی، تصدق حسین خاں شیروانی، ٹھاکر ملکھان سنگھ وغیرہ کے مجاہدانہ کارناموں سے تاریخ

کے صفحات ہمیشہ روشن رہیں گے۔

(اسباب بغاوت ہند، ۱۹۵۸ء مقدمہ فوق کریمی، ص ۱۴)

قاضی جاوید

نوآبادیاتی نظام کے بدترین نفسیاتی اثرات:

سرسید احمد خاں کے بارے میں آخری فیصلہ انیسویں صدی کے وسطی زمانے کے برصغیر کی معروضی صورت حال کے حوالے سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ وہ اور اُن کے رفقائے کار اور ہم خیال نوآبادیاتی نظام کے بدترین نفسیاتی اثرات کی تجسیم تھے۔ اس نظام کے جبر نے انہیں نیم انسانوں کی سطح پر لا کھڑا کیا تھا۔ شاید وہ اس سے بھی پست سطح پر گر گئے تھے۔ اپنے انسان ہونے کی صداقت کی نفی کر کے انہوں نے اپنی پناہ گاہ ڈھونڈی تھی۔ سید احمد خاں نے اپنی نئی صداقت کے واضح اظہار میں کبھی تامل نہیں کیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ انگریزوں پر یہ الزام لگانا غلط ہے کہ وہ ہندوستان کے مقامی باشندوں کو جانور سمجھتے ہیں، اصل یہ ہے کہ ہم درحقیقت جانور ہی ہیں۔

(سرسید سے اقبال تک: ص ۱۶)

انگریزوں کے ساتھ اس غیر مشروط وفاداری کو برقرار رکھنے کی غرض سے سید احمد خاں ہندوستان کے مختلف مذہبی گروہوں کے درمیان اتحاد اور یگانگت کو نامناسب تصور کرتے تھے۔ وہ بجا طور پر یہ سمجھتے تھے کہ اگر ہندوستانی عوام میں وحدت اور یک جہتی پیدا ہوئی تو اس سے برطانوی سلطنت کو شدید خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد برصغیر کے عوام کی تحریک آزادی کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے ''اسباب بغاوت ہند'' میں انہوں نے نوآبادیاتی حکمرانوں کی توجہ اس حقیقت کی جانب دلائی تھی کہ اگر وہ اپنی حکومت کی بنیادیں مضبوط کرنا چاہتے ہیں تو پھر انہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تضادات کو نہ صرف برقرار رکھنا ہوگا بلکہ ان کی شدت کو تیز کرنا ہوگا۔ بلاشبہ ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی حکمت عملی کو واضح ترین الفاظ میں وہی ذہن مرتب کر سکتا تھا جو خود نوآبادیاتی نظام کے نفسیاتی جبر کا بدترین شکار ہو چکا ہو۔ (ایضاً ص ۲۵)

مسلمانوں کے بالائی طبقات کی انگریز پرستی:

سید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک کے دیگر رہنماؤں نے ہندی مسلمانوں کو گزشتہ صدی کے نصف آخر میں انگریز پرستی کے جس چلن کی تعلیم دی تھی: صدی رواں کے آخر میں اس چلن کا رویہ مختلف سماجی، معاشی، سیاسی اور تہذیبی عوامل کی بنا پر ناکارہ ہو چکا تھا۔ ویسے تو سید احمد خاں کی زندگی ہی میں ان کے نقطہ نظر اور طرز عمل پر شدید نکتہ چینی کی گئی تھی اور اسے ہندی مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لئے زہر قاتل قرار دیا گیا تھا، تاہم مجموعی طور پر مسلمانوں کے بالائی طبقات نے اس راہ کو اختیار کر لیا تھا جس کی تعمیر سید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک کے دیگر رہنماؤں کے ہاتھوں سرانجام پائی تھی۔ جہاں تک نچلے طبقے کا تعلق ہے، وہ عام طور پر اس سے بے تعلق رہے تھے اور جہاں کہیں ان دونوں کا ملاپ ہوتا تھا، عوام اس سے بے زاری کا اظہار کرتے تھے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں انیسویں صدی کے دوران نوآبادیاتی آقاؤں کے خلاف نچلے طبقات کی جدوجہد مختلف صورتوں میں جاری رہی تھی اور بار بار اس جدوجہد نے مسلح تصادم کی صورت بھی اختیار کی تھی۔ ایسے مواقع پر، جیسا کہ توقع کی جا سکتی ہے، بالائی طبقات ہمیشہ حکمرانوں کا ساتھ دیتے رہے تھے۔ یوں وہ اپنی سرکار پرستی اور نوآبادیاتی آقاؤں سے اپنی وفاداریوں کی تجدید کرتے تھے۔ (ایضاً ص ۲۰۰)

ناگزیر انقلابی نتائج سے گریز:

کئی معروضی اسباب نے مل کر جلد ہی سرسید کی تحریک کے خلاف ردعمل پیدا کر دیا۔ بہت سے مقامی دانشوروں نے سرسید کی تحریک کو ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ وہ ''ترقی'' اور ''تہذیب'' کے دیوانے ہوئے جا رہے تھے مگر جب اس کے ناگزیر انقلابی نتائج اُجاگر ہونے لگے تو وہ خوف زدہ ہو کر پیچھے کو بھاگے اور اپنے ہی بنائے ہوئے بت کو مسمار کرنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ خود سرسید احمد خاں بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ ''ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے فروغ سے کوئی اچھا پھل ہاتھ نہیں لگا'' کیونکہ تعلیم یافتہ لوگوں نے پہلے تو یہ مطالبہ کیا کہ حکومت مقامی باشندوں اور انگریزوں کے درمیان کوئی فرق روا نہ رکھے، پھر انہوں نے آزادی کے چرچے شروع کر دئے اور ''ایجی ٹیشن'' کے نعرے لگانے لگے۔

(ماہ نو لاہور، اگست ۱۹۷۹ء، ص ۳۴۔۳۵)

ترقی و آزادی کے منصوبے بنا سکتا تھا۔ جدید طبقہ موجودہ نظام کی ہیئت سے الگ نئی بنیاد پر تعمیر کرنا چاہتا تھا جس کا خاکہ خود اس کے ذہن میں بھی واضح نہ تھا۔ وہ اس عوامی طاقت کی تشکیل چاہتا تھا جو حکومت کے لئے چیلنج ہو۔ کانگرس سے سرسید کا اختلاف اصولی نہیں بلکہ اسی فرق کا مظہر ہے۔

(سرسید کی ادبی خدمات اور ہندوستانی نشاۃ ثانیہ: ص ۳۲۴۔۳۲۵)

جسٹس (ر) قدیرالدین احمد

پاکستان کا دوقومی نظریہ سرسید سے منسوب کرنے کی غلط فہمی:

کہا جاتا ہے کہ سرسید نے پہلے ہی دوقومی نظریہ پیش کر دیا تھا جس کی بنیاد پر پاکستان بنا۔ اس بیان میں تین بڑی اور نمایاں غلط فہمیاں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ نہ تو سرسید نے اور نہ قائداعظم نے یہ کہا تھا کہ ہندوستان میں فقط دوقومیں بستی ہیں بلکہ دونوں صاحبان نے کانگریس کے اس دعوے کی تردید کی تھی کہ ہندوستان میں ایک قوم کے علاوہ دوسری قوم ہے ہی نہیں اور کانگریس اُس قوم کی نمائندہ جماعت ہے۔ دوسری تاریخی غلطی یہ ہے کہ درحقیقت ہندوستان میں کبھی دوقومیں نہیں بستی تھیں بلکہ وہاں تو ہمیشہ متعدد قومیں بستی تھیں اور بستی ہیں تیسری غلطی یہ ہے کہ سرسید کے قول اور مسلم لیگ کے قول کو ایک ہی بات سمجھا گیا ہے حالانکہ دونوں میں بیّن اور اُصولی فرق ہے۔ سرسید اور مسلم لیگ دونوں نے یہ تو کہا کہ ہندو اور مسلمان ایک نہیں ہیں بلکہ دونوں کے فائدے اور نقصان کی ماہیت بھی علیحدہ علیحدہ ہے چنانچہ انڈین نیشنل کانگریس مسلمانانِ ہند کی نمائندگی نہیں کر سکتی مگر سرسید کے زمانہ تک حق نمائندگی تک اور دونوں گروہوں کے فائدہ اور نقصان کی ماہیت تک ہی بات کی انتہا رہی۔ اُس زمانہ میں مسلمان اپنے آپ کو ایک علیحدہ اقلیت کہتے تھے اور اپنے سارے مطالبات بحیثیت ایک اقلیت طلب کرتے تھے۔ اُس وقت یہ سوال کہ مسلمانانِ ہند ایک اقلیت ہیں یا ایک قوم، اُٹھ ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ اس فرق کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی بلکہ ہماری زبان میں بھی لغت کے لحاظ سے قوم محض ایک گروہ کو کہتے ہیں، مثلاً ''قوم جلاہاں'' بھی کہا گیا ہے اور ''قوم جہلا'' بھی کہا گیا

ہے۔قوم ہونے کی اہمیت تو اُس وقت ہوئی جب مسلمانوں نے ایک خطہ زمین اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے طلب کیا۔ ایسے مطالبہ کا تصور سرسید کے زمانہ میں ناممکن تھا، وہ تو مسلمانوں کو انگریزوں کی دشمنی سے بچا رہے تھے۔آزادی ،حقِ خوداختیاری اور حکومت سے مقابلہ کا ذکر ہی کیا تھا!

(تاریخ تحریکِ علی گڑھ ،مقدمہ ص ۱۶۔۱۷)

تحریک علی گڑھ کی تحریک پاکستان سے مبینہ وابستگی کی حدود:

تحریک پاکستان اور تحریک علی گڑھ میں وابستگی تو ہے مگر براہ راست نہیں بلکہ بالواسطہ ہے۔ براہ راست تعلق نہ ہونے کی ایک یہ بھی وجہ ہے کہ ان دونوں تحریکوں کے درمیان میثاق لکھنؤ تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات جیسی بڑی بڑی حدودِ فاصل موجود ہیں البتہ بالواسطہ تعلق مسلمانان ہند کی اُس لگاتار کوشش سے پیدا ہوتا ہے جو انہوں نے اپنے وقار کو حاصل کرنے کے لئے طرح طرح سے کی ہے۔ (ایضاً:ص ۱۷)

وفاداری کا سبق دیا مگر امید پوری نہ ہوئی:

سرسید نے اپنی ساری عمر مسلمانوں کی بھلائی میں ان کو انگریزوں سے دوستی کا سبق دیا۔انگریزوں کے دلوں کو بھی اسلام دشمنی سے صاف کرنے کی کوشش کی اور ان اغراض کو پورا کرنے کے لئے مسلمانوں کو انگریزی زبان اور جدید علوم سکھانے کے انتظامات کئے۔ نیز مغربی معاشرت کو مسلمانوں میں پھیلایا۔انگریز بھی مسلمانوں کی اُس ذہنیت کو بدلنا چاہتے تھے جس سے جہاد رونما ہوتے ہیں۔فریقین کے اصلی اغراض مختلف تھے مگر اس سمجھوتے کی ایک ظاہری شکل پہلے ایم اے او کالج تھا اور پھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہوگئی..... یہ ادارے مسلمانوں اور انگریزوں میں ایک عظیم تر میثاق کے ستون تھے جن کی وجہ سے مسلمان انگریزوں کی مزید دشمنیوں سے محفوظ رہے اور علوم جدید کی چوکھٹ پر آ پہنچے۔لفظ ''علیگڑھ'' ایک معزز نام ہوگیا۔وہاں کے دیئز عما ملک میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے مگر سرسید کی یہ اُمید پوری نہیں ہوئی کہ انگریز مسلمانوں سے وفاداری کریں گے۔ (ایضاً ص ۲۴)

بین الاقوامی تصور سے یکسر خالی تحریریں:

ابتدا میں ملک کو دستوری مراعات دیئے جانے کے سب سے بڑے منادہونے کے باوجود وہ آخر میں حکومت کو یہ مشورہ دینے پر مجبور ہوئے کہ سیاسی مراعات دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ انتخابی طرز حکومت کے بھی خلاف ہو گئے تھے کیونکہ ان کا خیال یہ تھا کہ مسلمان ایک چھوٹی سی اقلیت ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ کے لئے ہندوؤں کے دست نگر بن جائیں گے۔ وہ شاید تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ تھوڑے عرصہ بعد سلطنت برطانیہ کا دور دورہ ختم ہو جائے گا، اور جب وہ چلے گئے تو مسلمانوں کو سہارا دینے والا کون ہوگا۔ چنانچہ وہ اس کے بھی خلاف تھے کہ ہند کے مسلمان، بیرون ملک میں جو بستے ہیں ان سے سیاسی تعلقات رکھیں۔ یہاں تک کہ وہ چاہتے تھے کہ ہند کے مسلمان انگریزوں کی وفاداری میں اپنا رشتہ ترکی خلیفہ سے بھی توڑ دیں۔ ان کو یقین کامل تھا کہ اگر مسلمانوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا تو حکومتِ برطانیہ ہمیشہ ان کے ساتھ وفاداری کرے گی اور اس کی مدد مدت مدید تک قائم رہے گی۔ وہ بین الاقوامی سیاست کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھنا نہیں چاہتے تھے، نہ ان کو اس کی فرصت تھی، ان کی ساری تحریریں بین الاقوامی تصور سے یکسر خالی ہیں۔ (ایضاً: ص۱۱)

قرطاس معبوض

فرقہ پرستی کا کردار کش الزام:

سرسید پر فرقہ پرستی کا الزام لگانا تاریخی حقائق سے چشم پوشی اور ایک معصوم اور بے گناہ کی کردار کشی کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔ ۱۸۸۵ء میں کانگرس کی تشکیل ہوئی اور اس دوران جب کہ کانگرسی رہنماؤں اور سرسید کے درمیان شدید کشمکش اپنے پورے عروج پر تھی، سرسید نے ۷ اپریل ۱۸۸۷ء کے علی گڑھ گزٹ میں لکھا ہے کہ ''ہماری خواہش ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں دوستی اور محبت اور برادری روز بروز بڑھتی جائے اور سوشل حالت میں ایسی ترقی ہو کہ مسلمان بجز مسجدوں کے اور ہندو بجز مندروں کے پہچانے نہ جائیں''

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سرسید نے کانگرس کا مقابلہ کرنے کے لئے جو یونائیٹڈ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کی تھی، اس میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل تھے۔ سرسید نے یقیناً فرقہ پرست ہندوؤں کو للکارا اور مسلمانوں کے مذہبی، لسانی اور تہذیبی ورثے کی حفاظت کے لئے گراں قدر خدمات انجام دیں لیکن ان کی تنگ نظری سے بیزاری اور مذہبی رواداری کی پالیسی میں آخر وقت تک کوئی تبدیلی نہیں آئی، جس کا ثبوت ان کا وہ مضمون ہے جو کہ انہوں نے اپنی وفات سے صرف چند ماہ پہلے علی گڑھ گزٹ میں شائع کیا تھا..... علی گڑھ کے قیام کا اصل مقصد یقینی طور پر مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت اور اسلامی معاشرے کی اصلاح تھا لیکن اس درسگاہ کے دروازے تمام مذاہب سے تعلق رکھنے والے طلبہ کے لئے ہمیشہ کھلے رکھے گئے۔ یہ بات کچھ لوگوں کے لئے یقیناً قابل حیرت ہوگی کہ علی گڑھ کالج کے پہلے گریجویٹ کا نام بابو ایشوری پرشاد تھا۔ اسی طرح یہاں کا پہلا پوسٹ گریجویٹ بھی ہندو تھا اور پہلا ایل ایل بی کی سند لینے والا طالب علم بھی ہندو تھا۔

(تہذیب کراچی، مارچ ۱۹۹۹ء: ص ۲۲-۲۳)

پروفیسر مولوی سید قمر الدین خاں

علما کی برہمنیت کا مخالف:

مسلمانوں کی پچھلی تاریخ سرسید کی نظر سے اوجھل نہ تھی۔ عباسیوں کے عہد اولیٰ میں اہلِ اعتزال اور اہلِ حدیث کے درمیان جو معرکہ برپا ہوا اور اہلِ حدیث نے اپنی آخری کامیابی کے بعد مسلمانوں کو جس جامد مذہبی نظام میں جکڑا، اس نے تفتیش و تحقیق پر ہمیشہ کے لئے مہر لگائی اور جابر و ظالم بادشاہوں کی خواہشات کو ہوا دی۔ یہ سب چیزیں ان کے سامنے تھیں..... تاریخ کے تمام اسباق سرسید کے سامنے تھے۔ وہ ایک بالغ نظر مؤرخ اور عظیم الشان ملت کے بانی تھے اس لئے یہ فیصلہ کرنے میں انہیں ذرا تامل نہیں ہوا کہ اب ایسے تجربے کرنے کی ضرورت نہیں جن کا نقص بار بار ثابت ہو چکا ہے۔ یہاں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ سرسید

۔حیے دین کے خلاف تھے۔ وہ دراصل ملا کی برہمنیت کے خلاف تھے۔ اور اس بات کے خلاف تھے کہ ہر بات پر مذہب کا فتویٰ لیا جائے اور دین کی تعبیر اس طرح کی جائے کہ انسانوں کے لئے وبال جان بن جائے۔

(برگ گل کراچی، سرسید نمبر ۶۹۔۱۹۶۸ ص ۲۲۱)

کریم الدین احمد

انگریزوں کی حمایت میں دنگا فساد پر تیار:

سرسید اپنی پوری جدوجہد کے بعد بھی مسلمانوں میں تعلیم عام کرنے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ عوام ان کی انگریز پرستی سے بدظن تھے۔ پھر ان کے کالج کی تعلیم مہنگی تھی جسے عام مسلمان برداشت نہ کرسکتا تھا سرسید انگریزی تعلیم سے ایک اور کام بھی لینا چاہتے تھے یعنی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو''۔ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے انہیں اپنے لڑکے سے زیادہ موزوں کوئی آدمی نظر نہ آیا (جس کی تعلیم انگریزوں کے درمیان ہوئی تھی) چنانچہ انہوں نے کالج چلانے کے لئے اپنے بعد اسی لڑکے کو نامزد کرنا چاہا۔ سید محمود کی جانشینی پر ان کا اصرار غالباً اسی وجہ سے تھا کہ وہی اُن کی ''روح تعلیم'' کو سمجھتے تھے اور ان پر سرسید کو بھروسہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے مرنے کے بعد بھی کالج انگریز دوست ہاتھوں میں رہے، ایسے عناصر جو حریت پسند ہوں یا انگریزوں کے ذرا بھی مخالف ہوں، وہاں عمل دخل نہ پائیں انگریزوں کی حمایت میں وہ دنگا فساد اور مارنے مرنے پر تیار ہو جاتے تھے (وجہ صرف اتنی تھی کہ کالج کا انگریز سٹاف چاہتا تھا کہ سرسید کے بعد سید محمود کالج کے سیکرٹری ہوں، اور سرسید سے اس بات کی حتمی وعدہ لینا چاہتے تھے ورنہ وہ لوگ کالج چھوڑ کر اپنے وطن واپس جانا چاہتے تھے)۔ تعلیمی تگ ودو میں بھی ان کا کام ''لائل محمڈنز آف انڈیا'' پیدا کرنا تھا اس لئے وہ اپنے کام میں کسی ایسے شخص کو لینے کے لئے تیار نہ تھے جس کی انگریز دوستی پر ذرا بھی شبہ ہو۔

(تنقیدی تحریریں: ص ۲۲۹۔۲۳۰)

ڈاکٹر کلیم صدیقی

استعماری قوتوں کے سب سے زیادہ منظورِ نظر:

عمومی حیثیت سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مغربی استعماریت کے بارے میں مسلمانوں میں تین واضح رجحانات پیدا ہوئے:

(الف) ایک طبقہ ان افراد پر مشتمل تھا جنہوں نے مغرب کی سیاسی، معاشی اور ثقافتی دخل اندازی کی مزاحمت کی۔

(ب) ایک طبقہ ان لوگوں کا تھا جنہوں نے مسلمانوں کی انحطاط پذیر سیاسی اور اخلاقی صورت حال کے پیش نظر مغربی استعماریت کو ایک ناگزیر مجبوری کے طور پر بے دلی سے قبول کر لیا۔

(ج) ایک طبقے نے مثبت طور پر اس کا خیر مقدم کیا۔

لہٰذا کوئی تعجب کی بات نہیں کہ تیسرے طبقے کے افراد ہی استعماری طاقتوں کے سب سے زیادہ منظور نظر ٹھہرے۔ یہی وہ مسلمان تھے جو ''تجدد پسند'' کہلائے یا انہوں نے استعماری حکومت کی اطاعت اور وفاداری کے عہد و پیمان کئے، یورپی زبان، ثقافت، فلسفہ اور علوم فنون اور مغربی نظریہ حیات و کائنات کو بڑی آسانی سے اور مذہبی موانع سے مطلق آزاد ہو کر اپنا لیا، استعماری حکومتوں کی افسر شاہی میں ملازمتیں اختیار کیں، دنیا بھر میں مغربی استعمار کے لئے بڑی بڑی جنگوں میں اپنی جانیں قربان کیں، استعماری حکمرانوں سے اپنی وفاداری کے صلے میں گراں قدر انعامات حاصل کئے۔ ہندوستان میں ان حکمرانوں کے مقربین میں سے سرسید احمد خاں جیسے لوگ اور ان کے پیرو مسلم قوم کے رہنما بن گئے۔ یہی لوگ اور ان کے بیٹے اور پوتے برطانوی میراث کے حق دار قرار پائے۔ اگر بقیہ مسلم امت کی حالت کا مجموعی جائزہ لیا جائے جو اب مختلف قومی ریاستوں میں منقسم ہو چکی ہے، تو صاف نظر آئے گا کہ عالم اسلام کے ہر حصے میں اسی قسم کی قیادت اُبھر کر سامنے آئی جس نے استعماری حکومتوں کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ مغرب زدہ طبقے کی قیادت جو استعماریت کی گود میں پلا ہے، کلیتہً اسی استعماری دور کی ساختہ پر

دافتہ ہے۔ ان کی تاریخ کا آفتاب استعماری حکومت کے افق سے طلوع ہوتا ہے۔ ان کے ذہن میں یا تو اسلامی تاریخ کا کوئی تصور موجود نہیں ہے، یا اگر کوئی دھندلا سا نقش باقی ہے تو اُسے بھی وہ حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ماقبل دور جدید تو محض مذہبی رسوم ان کے نزدیک قابل قبول سمجھی گئیں لیکن دور جدید میں داخل ہونے کے بعد بے محابا تجدید بلکہ کامل مغربیت ہی ان کا مطلوب و مقصود ہے۔ یہ ہے وہ قیادت جو مابعد استعماری ریاستوں میں آج ہر جگہ برسر اقتدار ہے اور جو وہاں کے لوگوں کو مغرب کا اطاعت شعار بنائے ہوئے ہے۔ دوسرے طبقے کے لوگ جنہوں نے بے دلی سے استعماری حکومت کی ناگزیریت کو گوارا کیا تھا وہ بھی اب تجدد پسندی کے دام میں اسیر ہیں۔ کچھ لوگ ان مذہبی تحریکوں سے وابستہ ہو گئے جو استعماری دور کے اوائل میں شروع ہوئیں۔ جس طبقے نے مغربی استعمار کی مزاحمت کی تھی، وہ بے دردی سے کچل دیا گیا۔ اس طرح جدید تاریخ کی تصنیف کا سہرا فاتحین کے سر بندھا۔ چنانچہ استعماریت کی مزاحمت کرنے والے مجاہدوں کو وہ لوگ بھی بھول گئے جن کے لئے انہوں نے جہاد کیا اور اپنی جانیں دیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کی جدید تاریخ میں انہی لوگوں کو زیادہ تر سراہا گیا ہے جنہوں نے نوآبادکاروں کا خیر مقدم کیا تھا۔ بعد ازاں اقتدار اپنے ہاتھوں میں منتقل کرانے کے لئے استعماری حکومت کے خلاف ان کی سیاسی جدوجہد کی روئداد بھی تاریخ میں شاندار لفظوں میں بیان کی گئی ہے۔ استعماری حکومتوں نے انہیں مغربی سیاست کے داؤ پیچ، لادینی جمہوریت کے نام پر استبدادی سیاست اور جغرافیائی و نسلی قومیت کے سبق اچھی طرح سکھا پڑھا دئے تھے۔

(مغرب کے زیر اثر مسلمانوں کا سیاسی مسلک فکر و عمل: ص ۵ تا ۷)

کے۔ ایم۔ اعظم

علی گڑھ تحریک کا مہلک نتیجہ:

ستم ظریفی تو یہ ہے کہ جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندو مسلمانوں کے شانہ بشانہ لڑ رہے تھے تو یہ ایک مسلمان تھا جس نے جنگ آزادی کے سروانوں کو مطعون ٹھہرایا

تھا۔ گو وہ ظاہری طور پر ایک پرہیزگار مسلمان تھا مگر اُس نے مسلمانوں کو انگریزوں کی اطاعت کا سبق دیا۔ سرسید احمد خاں شروع میں ہندو مسلم اتحاد کے زبردست پرچارک رہے مگر پھر اچانک انہوں نے ہندوؤں کی عددی اکثریت کا ہوا کھڑا کر دیا اور مسلمانوں کو خود اعتمادی سے محروم کرنے اور خوف و ہراس کا شکار کرنے پر کمربستہ ہو گئے۔ یہاں پر ایک سوال ضرور اُبھرتا ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کو منتشر کرنے سے کس کے مفادات کی ترویج کر رہے تھے؟ سرسید احمد خاں کو اس شے کا احساس نہ تھا کہ قوت کا دار و مدار تعداد پہ نہیں بلکہ کردار اور روحانی طاقت پر ہوتا ہے۔

(نوائے وقت لاہور، ۱۲ مارچ ۲۰۰۱ء، ادارتی صفحہ)

ہمارے ممدوح سرسید احمد خاں سے تعبیر کی غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے قوم رسول ہاشمیؐ کی ترکیب کو اقوام مغرب پر قیاس کر کے اسے زوال سے نکالنے کا جو طریق کار ''مادہ پرستی، ملازمتوں کے حصول اور انگریزوں کی رضا جوئی'' کی شکل میں پیش کیا، وہ دور اندیشی اور تاریخ کے عمیق فہم پر مبنی نہ تھا۔ سرسید اور اُن کے معاونین کی نیت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا لیکن اُن کی تحریک کا مہلک نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانان ہند اپنے شاندار اور محترم ماضی سے آہستہ آہستہ دور ہو گئے۔ سرسید احمد خاں کی تعبیر کی غلطی یہ تھی کہ اُنہوں نے اسباب زوال کی بنیادی حقیقت، وہن (یعنی دنیا کی محبت اور موت کا ڈر) کو نظر انداز کر کے قوم کی مادی منفعتوں کو مطلوب و مقصود بنا لیا اور ان منفعتوں سے عارضی محرومی کو زوال کا حقیقی سبب جان لیا۔ بے شک ایسے انداز فکر سے مستقبل کے لئے قومی فلاح کی امید رکھنا خوش فہمی سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ سرسید احمد خاں اور اُن کے رفقا کی تربیت یافتہ نسل نے مسلمانان ہند کی علمی، فکری، روحانی اور تمدنی زندگی کی مقتدد روایات کو درخور اعتنا نہ سمجھا بلکہ مادی زندگی کی آسائشوں کو ملی زندگی کے قابل قدر تسلسل پر ترجیح دی۔ ان کے نزدیک بقول اکبر الٰہ آبادی ''زندگی کی معراج کلرکی کرنے، ڈبل روٹی کھانے اور خوشی سے پھول جانے میں تھی''۔ علی گڑھ نے حالی، شبلی اور نذیر احمد جیسی نابغہ روزگار شخصیات تو کیا پیدا کرنی تھیں، وہ ان اکابرین کی قائم کردہ روایت کو آگے بڑھانے والے حضرات بھی وجود میں نہ لا سکا۔ ایک اجنبی زبان کے ذریعے تعلیم و تدریس کے فیصلے نے برصغیر کے باشندوں کو ذہنی مرعوبیت اور مغلوبیت کا شکار کر کے ان کی تربیت کے سلسلے میں بڑی حد تک منفی

کردارادا کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قوم کا ایک فعال حصہ اپنی شاندار تاریخی روایات سے بے تعلق اور متنفر ہو گیا۔ علی گڑھ تحریک کی ابتدا جس اصلاحی جوش وخروش اور ترقی کے ولولہ سے ہوئی تھی وہ آہستہ آہستہ ظاہری چمک دمک، دنیاوی کامیابی اور زمانہ سازی کے جذبے کے نیچے دبتا چلا گیا۔ ہمیں تعلیم صرف رزق میں توسیع کے لئے حاصل نہیں کرنی، بلکہ اطاعت غیر اور مغرب کی حلقہ گوشی سے نجات حاصل کرنے کے لئے بھی حاصل کرنی ہے۔ جب تک ہم اپنے ممدوح سرسید احمد خاں کی ناقص تعبیر کی بھول بھلیوں سے نہیں نکلیں گے، قومی سلامتی اور دینی فضیلت کا راستہ ہماری نظروں سے اوجھل رہے گا۔

(بیدار ڈائجسٹ لاہور، اگست ۲۰۰۲ء، صفحہ ۳۰)

کے۔ کے۔ عزیز

دوقومی نظریے کا مورث، سرسید نہیں بلکہ امیر علی:

سید احمد خاں نے بھی اپنی چند تقریروں اور تحریروں میں ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق اردو زبان کے لفظ ''قوم'' کا استعمال کیا ہے لیکن مخصوص مغربی اصطلاح ''نیشن'' کے مقابلے میں ''قوم'' کے لفظ کی دوسری تعبیر ہو سکتی ہے، مثلاً اسے عوام یا کسی ذات برادری یا فرقے کے لوگوں کے معنوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ پس امیر علی پہلے شخص تھے جنہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو ''ایک قوم'' کہا۔ انہیں دوقومی نظریے کا مورث اور نتیجۂ پاکستان کے معماروں میں شمار کیا جانا چاہیے۔

(امیر علی، ہز لائف اینڈ ورک: ص ۶۴)

عام آدمیوں کی نہیں بلکہ اشرافیہ کی بات:

سرسید احمد خاں...... نے اپنی تمام تقریروں میں اشرافیہ کی بات کی، ان کے ذہن میں عام آدمی اور مسلمان تھا ہی نہیں۔ وہ اشراف کا اتنا ذکر کرتے ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ وہ صرف اشراف سے ہی تعلق رکھتے ہیں، جس سے ہمارے ہاں ایک طبقاتی نظام آ گیا کہ مسلمان

تجارت اور کاروبار کی طرف نہیں آئے بلکہ نوکری کی طرف چلے گئے جس نے مسلمانوں کو معاشی طور پر بہت نقصان پہنچایا۔

(روزنامہ جنگ، سنڈے ایڈیشن، ۸راپریل ۲۰۰۱ء، ص ٦)

لالہ صحرائی

سرسید کی سپر اندازی:

(ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی کتاب پر تبصرہ سے اقتباسات) فاضل مصنف چونکہ خود بھی علی گڑھ مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں، لہٰذا انہوں نے سرسید کی تعلیمی اصلاحات کے علاوہ ان کے مذہبی معتقدات اور ان کی تفسیرِ قرآن میں بیان کردہ بعض اختلافی نکات کی زبردست وکالت کی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے جس دلیل پر زیادہ انحصار کیا ہے، وہ بھی کم و بیش معذرت خواہی سے تعلق رکھتی ہے۔ مختصر الفاظ میں ان کا مطلب یہ ہے کہ سرسید نے اگر مسلمانوں کے لئے مغربی علوم کی تحصیل اور اس کیلئے انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر شدت کے ساتھ اصرار کیا یا انہوں نے اسلامی عقائد میں جدید سائنسی تقاضوں کے مطابق ''ترمیم'' کی کوشش کی تو خواہ ان کے یہ اقدامات اصولی طور پر غلط ہی کیوں نہ ہوں، بہرحال اُس وقت کے حالات میں مسلمانوں کو انگریزوں کی انتقامی کارروائیوں سے بچانے کے لئے اور انہیں پستی و نکبت سے نکالنے کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ یہ دلیل بظاہر خاصی قوی معلوم ہوتی ہے، تاہم فاضل مصنف اس حقیقت سے بے خبر تو نہ ہوں گے کہ جب کوئی قوم وقتی مفاد اور مصلحت کی قربان گاہ پر اپنے بنیادی اصولوں اور معتقدات کی بھینٹ چڑھا دے تو اس کی حقیقی ترقی کا خواب شاذ ہی شرمندۂ تعبیر ہوتا ہے۔ کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ مسلمانانِ ہند نے سرسید کے تتبع میں جب مغربی علوم کو ناقدانہ ذہنیت کی بجائے مرعوبانہ ذہنیت سے حاصل کرنا شروع کیا تو اس نئی روشنی کے پردے میں الحاد، بے یقینی اور تشکیک کے ان پرانے اندھیروں نے بھی ان کے دل و دماغ پر ڈیرے ڈال دیئے جو ملتِ اسلامیہ کی اصل قوت یعنی دینِ حق پر ایمان، اس پر احساسِ فخر اور اس کی خاطر سب کچھ کر گزرنے کے جذبہ کی

راہ میں ہمیشہ سے حائل رہے ہیں۔

فاضل مصنف کا خیال ہے کہ ''سرسید کے نزدیک انگریزی حکومت اتنی مستحکم تھی کہ اسے مسلمانوں کی جدوجہد سے شکست نہیں دی جا سکتی تھی، لہٰذا سرسید نے اعلان کیا کہ مسلمانوں کے مذہب کا تقاضا تو یہ ہے کہ اگر حالات انہیں کسی اجنبی حکومت کا محکوم بنا دیں تو وہ اس حکومت کے وفادار رہیں''۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے اعلان کو کیشِ مرداں تو نہیں کہا جا سکتا، اور پھر ایسے مسلک کو اسلام سے نسبت دینا اس عظیم و جلیل دین کی حد درجہ غلط وکالت کے مترادف ہے۔ کتاب کا یہ سارا باب سرسید احمد کے کارناموں کی ستائش سے لبریز ہے۔ اس کے آخر میں مسلمانوں کی ان مساعی کا اجمالی سا تذکرہ بھی ہے جو بالآخر مسلم لیگ کے قیام پر منتج ہوئیں۔ فاضل مصنف کو سرسید احمد سے جو ذہنی عقیدت ہے، قدرتی طور پر اس کی بنا پر انہوں نے اپنی کتاب میں دیگر مصلحین کی نسبت سرسید کے افکار و نظریات کو زیادہ جگہ دی ہے اور پھر انہوں نے سرسید کے مختلف نظریات اور اقدامات پر مؤرخانہ نقد و تبصرہ کی بجائے ازراہِ عقیدت ان کے جواز کے لئے دلائل پیش کرنے کا فریضہ بھی ادا کیا ہے۔ اس قسم کا نقطۂ نگاہ اصولاً تاریخ کی کسی ایسی کتاب کے لئے زیادہ موزوں نظر نہیں آتا جس میں کسی خاص فرد کی بجائے پوری ملت کے افکار و احوال کا بے لاگ تذکرہ مطلوب ہو۔

(چراغِ راہ کراچی، جولائی ۱۹۶۸ء: ص ۷۲-۷۳)

تو بہ زمانہ ستیز:

کتاب..... میں مسلمانانِ ہند کے ان رہنماؤں اور دانشوروں کے افکار و اعمال کا جائزہ لیا گیا ہے جو سرسید احمد خاں کی ہتھیار ڈال دینے والی روش کے ردِ عمل کے طور پر سامنے آئے۔ اس ضمن میں اکبر الہ آبادی، علمائے ندوہ، علمائے دیوبند اور مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مولانا آزاد کے بارے میں فاضل مؤلف کا خیال ہے کہ ''ان کا مجلہ الہلال مسلمانوں کو ان کے پسندیدہ کھانے کھلاتا تھا''، نیز یہ کہ مولانا آزاد نے مسلمانوں کو اپنے مذہب پر فخر و ناز کی خواب آور دوا پلائی''..... فاضل مصنف نے مزید کہا ہے کہ مولانا آزاد مسلمانوں کو رومانیت کا چکر دلا کر دنیائے عمل سے فرار کی راہ سمجھاتے تھے''۔ اس کا مطلب یہ

ہوا کہ سرسید کی سپراندازی کی تلقین سے تو بہرحال مسلمانوں کے قوائے عمل مفلوج نہیں ہوتے تھے البتہ ''الہلال'' کے نعرۂ جہاد سے ایک خوابناک کیفیت ان پر طاری ہو جاتی تھی۔ جو شخص یہ کہتا تھا کہ ''چلو تم ادھر کو جدھر کی ہوا ہو'' وہ تو بہرحال ملت کو جہدِ عمل پر آمادہ کرتا تھا لیکن جو شخص یہ نعرہ لگاتا تھا کہ ''زمانہ تو بہ نسازد تو بہ زمانہ ستیز'' وہ انہیں خوابوں کی دنیا میں بسانا چاہتا تھا۔ یہ ایک عجیب وغریب نظریہ ہے۔ عقیدت کی آنکھ ہمیشہ یک رُخے مطالعہ کی عادی ہوتی ہے، لہٰذا اس موقعہ پر فاضل مصنف کچھ اسی قسم کے اظہارِ خیال پر مجبور تھے۔...... فاضل مصنف نے...... سرسید کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''انہوں نے دراصل مسلمانوں کی خوشامد نہیں کی تھی''۔...... سوال یہ ہے کہ سرسید کے علاوہ اکبرالہ آبادی، مولانا حالی، علامہ اقبال اور مولانا آزاد میں سے آخر کس نے مسلمانوں کی خوشامد کی ہے اور کب انہوں نے مسلمانوں کو ان کی خامیوں سے آگاہ کرنے میں مداہنت سے کام لیا ہے؟ خود ''الہلال'' کے ایسے مضامین کی تعداد کیا کچھ کم ہے جن میں مسلمانوں کو ان کی گمراہی پر تادیب وسرزنش کا انداز اختیار کیا گیا ہے؟ وہ خواہ سرسید ہوں یا ان سے اختلاف رکھنے والے دیگر مصلحین، سب نے اپنے برادرانِ دین کے حق میں حسب موقعہ تادیب وسرزنش سے کام لیا ہے، البتہ ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ ''دیگر مصلحین'' اس تادیب وسرزنش کے بعد مسلمانوں کو پھر سے وہی آبِ نشاط انگیز مہیا کرنے کی ترغیب دیتے تھے جو اُن کی کشت ملت کو سرسبز وشاداب کرنے کا ہمیشہ ذریعہ بنا ہے۔ اس کے برعکس سرسید انہیں دفع الوقتی کی خاطر وہی دوسروں کا جھوٹا پانی پینے کا درس دیتے تھے۔

(ایضاً: ص ۴۳-۴۷)

ڈاکٹر مبارک علی

مخصوص جاگیردارانہ ذہنیت کی عکاسی:

سرسید کے نظریات وافکار مسلمانوں کے نئے تعلیم یافتہ ابھرتے ہوئے زمینداروں اور جاگیرداروں کے طبقہ کے لئے انتہائی سودمند تھے اس لئے انہوں نے بہت جلد سرسید کی شخصیت کے گرد عظمت وبزرگی کا حصار کھینچا اور ان کی ذات وشخصیت کو مقدس بنادیا۔ ہمارے

ہاں اب تک سرسید کی شخصیت اور ان کے سیاسی و سماجی و تعلیمی افکار کا مطالعہ بنے بنائے ...
کے تحت کیا جاتا ہے اور اس سے ہٹ کر اس کا تجزیہ کرنے کی بہت کم کوششیں کی گئی ہیں۔

(الیسہ تاریخ ص ۱۶۵)

سرسید نے مفاہمت، تعاون اور وفاداری کی جو تعلیم دی اس کے ذریعہ وہ مسلمانوں کے ایک خاص طبقہ کو فائدہ پہنچانا چاہتے تھے، اور یہ طبقہ مسلمان امرا اور جاگیرداروں کا تھا۔ جب وہ لفظ ''مسلمان قوم'' استعمال کرتے تو ان کے سامنے اسی محدود طبقہ کے مفادات ہوتے تھے، مسلمان عوام کے نہیں۔ کیونکہ انگریزی حکومت کے قیام و استحکام اور ۱۸۵۷ء کے واقعات نے مسلمان جاگیرداروں اور زمینداروں کے طبقہ کو بری طرح متاثر کیا تھا، ان کی جائیدادیں ضبط ہوئی تھیں، ان کی دولت لٹی تھی، ان کی مراعات ختم ہوئی تھیں، ان کا اقتدار جاتا رہا تھا اور ان کی قوت و طاقت ٹوٹی تھی جس کی وجہ سے یہ طبقہ بے حس اور بے جان ہو گیا تھا ..... سرسید کا تعلق مغل امرا کے خاندان سے تھا۔ انہوں نے جس گھرانہ میں پرورش پائی تھی اور جس ماحول میں تعلیم و تربیت حاصل کی تھی، وہ امرا کے طبقہ سے مخصوص تھا اس لئے ان کی سوچ، غور و فکر اور رجحانات میں اس طبقہ کی ذہنیت کی عکاسی ہوتی ہے۔ وہ ایک مخصوص جاگیردارانہ ذہن رکھتے تھے اور اس سے ہٹ کر نہ سوچ سکتے تھے اور نہ دیکھ سکتے تھے۔ ان کی تمام ہمدردیاں اسی طبقہ سے تھیں اور اسی کی آنکھ سے وہ قوم کے مسائل دیکھتے تھے۔ (ایضاً ص ۱۷۷۔۱۷۸)

تعلیمی میدان میں بھی سرسید کا دائرہ صرف امرا، رؤسا اور شرفا، زمینداروں اور جاگیرداروں کے طبقہ تک محدود تھا، اس لئے وہ چاہتے تھے کہ حسب سابق یہ طبقہ حکمران جماعت میں شامل ہو جائے اور انہی مراعات کو پھر سے حاصل کر لے۔ انگریزی زبان اور مغربی علوم کی تعلیم کا مقصد یہی تھا کہ اس کے ذریعہ وہ اعلیٰ عہدے حاصل کر سکیں اور حکمران طبقہ سے اپنے روابط بڑھا سکیں ..... سرسید تعلیم کو طبقاتی بنیادوں پر تقسیم کرنا چاہتے تھے، اعلیٰ مغربی تعلیم صرف اُمرا کے لڑکوں کے لئے ضروری سمجھتے تھے جبکہ عوام کو وہ صرف مذہبی تعلیم میں الجھائے رکھنا چاہتے تھے۔ (ایضاً ص ۱۸۴)

تعلیم کے سلسلہ میں سرسید صرف اس تعلیم کے حامی تھے جو طالب علموں کو اعلیٰ

نائب عہدوں کے لئے تیار کرے۔ان کے ذہن میں اس سے زیادہ تعلیم کا اور کوئی مقصد نہیں
ہے اس لئے انہوں نے سائنس کی تعلیم کی مخالفت کی کیونکہ اس سے اعلیٰ تربیت اور شائستگی پیدا
نہیں ہوتی ہے۔اسی طرح صنعتی وفنی تعلیم کے بارے میں بھی ان کی جاگیردارانہ ذہنیت آڑے
آئی جس کو وہ امرا کے لڑکوں کے لئے ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ (ایضاً:ص ۱۸۷)

سامراجی عزائم سے چشم پوشی:

سرسید نے مذہب کے ذریعہ اس بات کو ثابت کیا کہ چونکہ انگریزی حکومت میں
مسلمانوں کو پوری مذہبی آزادی ہے اس لئے ان کی حکومت کے خلاف آوز اٹھانا،بغاوت کرنا
اور جہاد کا نعرہ بلند کرنا مذہبی تعلیمات کے خلاف ہے ..... یہاں سرسید ان حقائق سے چشم پوشی
کرتے ہیں جو ایک سامراجی طاقت مفتوح ملک کی معیشت کے ساتھ کرتی ہے۔اگر وہ معاشرہ
میں مذہبی آزادی برقرار بھی رکھے تو اس کا اس کے سامراجی عزائم پر کوئی فرق نہیں پڑتا ہے
کیونکہ اس کا اصل مقصد معاشی لوٹ کھسوٹ ہوتا ہے۔ (ایضاً:ص ۱۷۹۔۱۸۰)

علی گڑھ کی پیداوار نوکرشاہی طبقہ کا کام:

..... سرسید نے جس مقصد کے لئے علی گڑھ (کالج) کھولا تھا اس کے وہی نتائج
نکلے۔جن مسلمانوں نے اعلیٰ مغربی تعلیم حاصل کی انہیں حکومت کے اعلیٰ عہدے ملے اور
انہوں نے مغربی طرز معاشرت کو اختیار کیا اور اپنا رشتہ عوام سے کاٹ کر اپنے مفادات کو حکومت
سے وابستہ کیا۔اس کے نتیجہ میں نوکرشاہی کا طبقہ وجود میں آیا جس کا کام حکومت کی خوشامد اور
چاپلوسی کے سوا کچھ نہ تھا۔مسلمانوں کا یہ تعلیم یافتہ طبقہ جب عوام سے علیحدہ ہوکر حکومت کے
ہاتھوں میں چلا گیا تو اس نے ترقی اور انقلاب کی راہوں کو مسدود کردیا۔ (ایضاً:ص ۱۸۸)

رسالہ ''اسباب بغاوت'' کی مبینہ جرأت وہمت:

سرسید کے بارے میں ہمارے ہاں پہلی غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ انہوں نے
۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' لکھ کر بڑی جرأت وہمت کا ثبوت دیا،
لیکن واقعات کا تجزیہ ایک دوسری صورت میں پیش کرتا ہے۔۱۸۵۷ء تک ہندوستان میں ایسٹ

انڈیا کمپنی کا اقتدار رہا جبکہ انگلستان میں پارلیمنٹ کمپنی کے اقتدار کو پسند نہیں کرتی تھی اور اس کوشش میں تھی کہ کسی طرح کمپنی کے اقتدار کو ختم کر کے براہ راست پارلیمنٹ کے اقتدار کو ہندوستان میں قائم کرے۔ اس سلسلہ میں پارلیمنٹ نے مختلف اوقات میں اپنے اثر کو بڑھانے کے لئے مختلف طریقوں سے کمپنی کے معاملات میں دخل دیا۔ جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ پیش آیا تو پارلیمنٹ کو اس بات کا موقع مل گیا کہ وہ یہ ثابت کرے کہ ہندوستان میں کمپنی کی حکومت ناکام ہو چکی ہے، اس لئے ہندوستان سے کمپنی کی حکومت ختم کر کے ملک کو براہ راست پارلیمنٹ اور ملکہ برطانیہ کے تحت میں لایا جائے۔ اس موقع پر سرسید کا رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' پارلیمنٹ کے لئے ایک بہترین دستاویزی ثبوت ثابت ہوا جس میں کمپنی کی پالیسیوں پر تنقید کی گئی تھی اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کا ذمہ دار انہی کو قرار دیا گیا تھا۔ اس لئے یہ رسالہ ممبران پارلیمنٹ کے لئے، جو کمپنی کے خلاف تھے، ایک نعمت سے کم نہ تھا جس کے ذریعہ اُنہوں نے کمپنی کی حکومت کے خلاف دلائل دیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان سے کمپنی کا اقتدار ختم ہوا اور یہاں پر پارلیمنٹ اور تاج برطانیہ کی حکومت قائم ہوئی۔ اس پس منظر میں اس بات کو مسترد نہیں کیا جاسکتا کہ یہ رسالہ سرسید سے لکھوایا گیا ہو کیونکہ فوراً اس کا انگریزی ترجمہ ہوا اور اس کی کاپیاں ممبران پارلیمنٹ میں تقسیم ہوئیں اور وہاں اس کا پرجوش خیر مقدم ہوا۔ (ایضاً: ص ۱۷۲۔۱۷۳)

مبین مرزا

بڑے لوگوں کی بڑی لغزش کا معاملہ:

برِ صغیر کی ہند اسلامی تہذیب کا نقشہ ۱۸۵۷ء کے بعد ایک تدریجی سفر سے گزر کر جس ارتقائی فکر اور جدیدیت کی زد میں آیا، اس کی راہ سرسید کی عقلیت پسندی، پیروئ مغرب اور ان کے لائے ہوئے نظام تعلیم ہی نے ہموار کی تھی۔ بہ الفاظ دیگر یہ کہا جائے گا کہ ہماری ہند اسلامی تہذیب کے فکری قلعے میں پہلی بڑی دراڑ سرسید کی اصلاحی تحریک کے بھونچال ہی نے ڈالی تھی۔ بات یہ ہے کہ ایک دوسری تہذیب، جس کا اصول حقیقت آپ کے اصل اصول سے متصادم ہو، اس کے نظامِ افکار کا اپنے فکری ڈھانچے پر اطلاق اپنی تہذیبی اساس کی نفی اور فکری

بنیادوں کے انہدام کے مترادف ہوتا ہے۔ سرسید کی پیروئ مغرب کی تگ ودو نے ہمارے ساتھ یہی کیا ... چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سرسید نے ہمارے ہاں جس نظام تعلیم کو رائج کرنے اور فروغ دینے کی کوشش کی وہ ہمارے لئے ایک نئی سمت کا سفر تھا اور یہ نئی سمت ان راستوں کے عین مقابل تھی جن پر اس سے پہلے ہم سفر کر رہے تھے، لٰہذا رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ ہم سرسید کے دکھائے ہوئے راستوں پر چل نکلے ...... ہم نے راستہ تو نیا اختیار کر لیا لیکن پیش نظر منزلیں وہی پرانی رہیں۔ اب آپ ہی کہیے کہ نتیجہ سمت کی گم شدگی کے سوا آخر اور کیا ہو سکتا تھا؟

(جسارت میگزین کراچی، ۳۱ مئی ۹۸ء کتاب کالم)

...... سرسید بہت بڑے آدمی تھے۔ جس طرح بڑے آدمیوں کے خواب بڑے ہوتے ہیں اور ان کے خوابوں کے بطن سے قومیں جنم لیتی ہیں اور معاشروں کی قلب ماہیت ہوجایا کرتی ہے، اسی طرح بڑے آدمیوں کی لغزشیں بھی بڑی ہوتی ہیں اور لغزشوں کی پاداش میں تہذیبیں اور قومیں صرف ہو جاتی ہیں۔ سرسید نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد اپنی قوم کے Survival کے لئے پورے اخلاص نیت سے ایک راستے کا انتخاب کیا تھا۔ دیکھا جائے تو ان ہنگامی حالات میں یہ انتخاب غلط بھی نہیں تھا لیکن ہنگامی حالات کے اصول و آئین کا اطلاق عمومی صورت حال پر نہیں کیا جا سکتا۔ فوری دفاع اور بقا کے لئے اختیار کئے گئے اس راستے کو آگے چل کر ایک موڑ لینا تھا جو اُس نے نہیں لیا، اور پھر ہوا یہ کہ یہی راستہ مقصود و منزل قرار پایا۔ سو آج ہم اسی راستے کی بھول بھلیوں میں گم ہیں۔ بڑے لوگوں کی لغزش کا معاملہ قوموں کی زندگی میں پہاڑ پر لگنے والی ٹھوکر کا سا ہوتا ہے کہ ٹھوکر کھانے والے کو سنبھلنے کی مہلت نہیں ملتی اور وہ کھائیوں میں جا گرتا ہے۔ (ایضاً)

پروفیسر متین الرحمٰن مرتضٰی

اسلام اور لادینیت کے درمیان منافقانہ سمجھوتہ:

سرسید نے فارمولا تجویز کیا تھا کہ مسلمانوں کو تمام علوم جدید ویسے ہی نصاب کے مطابق پڑھائے جائیں جیسے یورپ میں پڑھائے جاتے ہیں، البتہ طالب علموں کو ذہنی طور پر

مسلمان رکھنے کے لئے ان کے مجموعی نصاب میں ایک مضمون کے طور پر اسلامیات بھی شامل کردی جائے اور یہ کام سرسید نے دیوبند کے فارغ التحصیل اساتذہ کو دینیات پڑھانے کے لئے مامور کر کے کیا مگر تاریخ ہمارے سامنے ہیں کیونکہ دینیات کا ایک الگ مضمون پڑھنے سے اسلامی خطوط پر ذہن کی اتنی تعمیر نہیں ہوتی جتنی خدانا آشنا سیکولر نصاب پر مبنی دوسرے علوم پڑھ کر ذہن کی تخریب ہوتی ہے۔ پیوندکاری پر مبنی اس آمیزہ نصاب کو پڑھنے سے مسلمان طالب علموں کے ذہن یکسو نہیں ہو۔ نہ بلکہ ان کا ذہنی خلجان اور مذہب کی افادیت پر ان کے شبہات میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، چنانچہ ایسے طالب علموں کا ایمان راسخ نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی زندگیوں میں اسلام اور لادینیت کے درمیان ایک منافقانہ سمجھوتہ کر کے منافقانہ اسلوب حیات اختیار کرتے ہیں۔

(تعلیم اسلامی تناظر میں (۴) ص ۱۴)

پروفیسر محمد اجتبا ندوی

معذرت خواہانہ انتہا پسند روش:

سرسید احمد خاں نے مغربی طرز پر نیچر اور تجدد و عقلیت پسندی سے متاثر ہو کر اور مغربی مفکرین و مستشرقین کے اسلام پر پے بہ پے اعتراضات سے حیران و مغلوب ہو کر جو معذرت خواہانہ، مدافعانہ اور پسپائی و سپردگی کی روش اختیار کی وہ نہ صرف انتہا پسند تھی بلکہ حقائق، اقدار، عقائد و مسلمات کی تاویل، توجیہہ اور انکار کی حد تک پہنچ گئی جس کی بنا پر مسلم معاشرہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔

(تاریخ فکر اسلامی: ص ۴۲)

محمد ادریس اپل

ہماری تاریخ کا عجیب و غریب کردار:

سرسید ہماری تاریخ کا عجیب و غریب کردار ہے۔ جو کردار بنگال میں میر جعفر، میر

صادق نے مسلمان حکومتوں کے خلاف ادا کیا، وہی کردار اعتقادی اورفکری طور پر سرسید نے مسلم اُمہ کے ساتھ ادا کیا۔ انہوں نے ادب وانشا کا سہارا لے کر خدمت وتعلیم کا نعرہ بلند کر کے وہ "عظیم الشان" کام انجام دیا جس نے انیسویں صدی عیسوی کے مسلم معاشرے کے اتحاد کو پارہ پارہ کیا: فکری انتشار، آوارہ خیالی اور تشکیک والحاد کی راہیں کھولیں۔ وہ علمِ کلام لے کر مغربی فلسفے کی برتری ثابت کرتے رہے، اخلاقی اقدار کا راگ الاپ کر اپنی قوم کو پست اور بے ہمت کہہ کر انہیں غلامی پر راضی کرتے رہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں انہیں ہر برائی نظر آتی رہی اور انگریزوں کو ہر لحاظ سے آسمانی مخلوق سمجھتے رہے۔ قوم سے انہیں اتنی ہی ہمدردی رہی جتنی انگریزوں کے حق میں سودمند تھی۔ لیکن المیہ یہ ہوا کہ کچھ بے ضمیروں نے، جن کے ہاتھ میں اقتدار واختیار کے سرچشمے تھے، انہوں نے سرسید کا بُت خود ہی تراشا اور خود ہی اس کی پوجا کرنے لگے جس کے نتیجے میں سرسید کو مُصلحِ قوم اور مجددِ ملت کا درجہ دے دیا گیا۔

(الجمعیۃ راولپنڈی)

محمد ادریس کاندھلوی

الحاد اور زندقہ سے پُر کتابیں:

سرسید احمد خاں علی گڑھی بانی علی گڑھ کالج ...... کی کتابیں الحاد اور زندقہ سے بھری پڑی ہیں اور مولانا عبدالحق صاحب دہلوی مصنف تفسیر حقانی نے اپنی تفسیر میں سرسید کے عقائد اور خیالات کا خاص طور پر رد کیا ہے اور سرسید کی نام نہاد تفسیر کو تحریف القرآن سے تعبیر کیا ہے۔ اس شخص نے نصوص شریعت میں جو تاویلیں کی ہیں وہ تاویلات نہیں بلکہ بلاشبہ وہ ایسی تحریفات ہیں کہ یہود ونصاریٰ کی تحریف بھی اُن کے سامنے ہیچ ہے ...... اس وجہ سے اُسی زمانہ میں کسی عالم نے سرسید کے بعض اقوال کفریہ کو نقل کر کے علمائے حرمین سے استفتا کیا تو علمائے حرمین نے جواب میں یہ الفاظ لکھے:

"اعتقاده فاسد و اليهود و النصارىٰ اهون حالا منه ضال مضل وهو خليفة ابليس اللعين يكفر لهذا الاعتقاد"

اور اس فتوی پر حرمین شریفین کے علمائے حنفیہ اور شافعیہ اور مالکیہ اور حنابلہ، سب کے دستخط ہیں۔ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ نے اپنے فتاویٰ موسومہ ''امداد الفتاوی'' جلد ششم میں اسی فتوی کا ذکر فرمایا ہے۔

(عقائد الاسلام، جلد اول: ص ۱۸۰۔۱۸۱)

محمد ارشد

برصغیر میں ایک نیا فکری انتشار اور بے راہ روی:

سرسید نے معجزات و کرامات کا یکسر انکار کیا ہے؛ معراج اور شق صدر جیسے معجزانہ واقعات کو رؤیا (خواب روحانی) سے تعبیر کیا ہے؛ حشر نشر، حساب کتاب، میزان، جنت ودوزخ اور ان کی نعمتوں اور ہولناکیوں (نعیم وآلام) کی حقیقت اور حوضِ کوثر کے متعلق قرآنی آیات؛ بطریق مجاز، استعارہ تمثیل قرار دیا ہے؛ ابلیس اور ملائکہ کے خارجی وجود سے انکار کیا ہے؛ جنات سے صحرائی اور پہاڑی لوگ مراد لئے ہیں؛ نبوت اور وحی اور نزولِ وحی کی حقیقت، کیفیت، اعجاز القرآن، مسئلہ جبر واختیار، حسن و قبح اور خیر وشر پر ایک نئے انداز سے گفتگو کی ہے؛ نسخ قرآن کا قطعی انکار کیا ہے اور آیاتِ قصص کی تفسیر میں دور از کار تاویلات سے کام لیا ہے۔ سرسید نے معاشرتی و عملی احکام بالخصوص جہاد وغزواتِ رسول، دوستی کفار، ربا، تعدد ازدواج اور جزیہ کی بحث وتحقیق کے بارے میں ایسا طرزِ فکر واسلوب اختیار کیا ہے کہ ان مسائل کے بارے میں دورِ حاضر کے عقلیت پرست گروہ، بالخصوص مغربی مستشرقین، کی طرف سے کوئی اعتراض نہ ہو سکے اور مسلمانوں کو اپنے حاکموں کے ساتھ ربط وضبط رکھنے میں کوئی امر مانع نہ ہو۔ سرسید کیونکہ انگریزی حکومت سے مفاہمت ومصالحت کے حامی وعلمبردار تھے لہٰذا انہوں نے اپنی تفسیر میں انگریزی حکومت کی اطاعت وفرماں برداری کو شرعی ودینی جواز فراہم کرنے کا پورا اہتمام کیا ہے۔

(فکر ونظر اسلام آباد، جنوری تا مارچ ۲۰۰۴ء، ص ۱۹)

سرسید احمد خاں اور ان کے خوشہ چین وہم خیال مصنفین کے افکار وخیالات نے

برِصغیر میں ایک نئے فکری انتشار اور بے راہ روی اور بیبا کی کا دروازہ کھول دیا، چنانچہ جدید تعلیم یافتہ طبقے کے دل ودماغ میں دینی عقائد وتعلیمات کے بارے میں تشکیک پرورش پانے لگی۔ مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے پیروکاروں کی مذہبی تشریحات وتاویلات کی اشاعت سے برِصغیر میں پہلے سے جاری نظریاتی پیکار دو چند ہوگئی۔ ایسے میں متعدد اہلِ روایت وراسخ العقیدہ علما نے عیسائی مشنریوں، آریہ سماجی مبلغین کے جواب میں اور سرسید اوران کے ہم نوا مصنفین کے افکار اور مرزائی گروہ کی انحرافی تاویلات کی تردید میں قرآنِ حکیم کی تفاسیر لکھیں۔ (ایضاً ص۲۱)

محمد اسحاق

علیگ برادری کے سپوت بمقابلہ غریب مسلمان:

تقسیم سے قبل تک ہندوستان کی ساری ریاستوں میں علیگ برادری کے سپوت اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ اقتدار، دولت، عزت وشہرت ان کا طرۂ امتیاز رہا۔ سرسید کے زمانے ہی سے ایم اے او کالج کی اعلیٰ تعلیم زمیندار اور دولت مند طبقے کے لڑکوں تک محدود رہی۔ تقسیم ہند کے بعد اعلیٰ تعلیم بڑی حد تک مسلمانوں کے متوسط طبقہ تک پہنچ گئی لیکن غریب مسلمان آبادی کا وہ ساٹھ فی صد طبقہ آج بھی اسی طرح اچھوت اور محروم ہے جیسا کہ وہ ڈیڑھ دو سو برس سے محروم چلا آرہا ہے۔ وہ تعلیم کو دولت کی طرح قسمت کی بات سمجھتا ہے۔

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۹۸ء، ص ۹۶)

محمد اسرائیل

لفظ ''قوم'' سے مراد اور مسلم یونیورسٹی کا تخصص:

سرسید قومی یک جہتی کے علم بردار تھے۔ سرسید سے پہلے میرے خیال سے کسی نے بھی اپنی تحریر وتقریر کے ذریعہ قومی یک جہتی کے لئے ملکی سطح پر اتنا کام نہیں کیا جتنا کہ سرسید نے۔ ان کی کوششوں کا دائرہ صرف مسلمانوں تک محدود نہ تھا بلکہ اُن کا ذہن مسلمانوں کے

ساتھ ساتھ دوسری قوم کے لئے بھی کھلا تھا۔ قوم کے لفظ سے ان کی مراد "اہل ہند" تھے۔ یہ
لئے محمڈن اورینٹل کالج کا قیام عمل میں آیا تو اس میں دوسرے مذاہب کے طلبہ کو بھی داخلہ دیا
گیا۔ سرسید کا یہ مقصد بالکل نہیں تھا کہ کالج میں صرف مسلمان طلبہ زیرتعلیم ہوں اور نہ ہی یہ اُس
وقت ممکن تھا، نہ اب ہے۔ ہاں، ایک مخصوص اور مثالی ادارہ کا قیام ضرور مقصد تھا جس میں تازہ
جدید تر اور اعلیٰ علوم وفنون کے ساتھ ہر قسم کی اچھی تربیت بھی دی جائے اور پھر اس کے نمونے
پر دوسرے مقامات میں اس قسم کے ادارے قائم ہوں اور ان شعبوں سے فارغ طلبہ علی گڑھ
تحریک کے مقاصد کو عام کریں۔ سرسید نے اپنی زندگی ملک وملت کے لئے اور معاشرہ کی
اصلاح کے لئے وقت کردی تھی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اس کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ اس
ادارہ کے بارے میں ہندوستان کے لوگوں میں ایک غلط فہمی بہت عام ہے۔ مسلمان یہ سمجھتے ہیں
کہ یہ ادارہ بلاشرکت غیرے ان کا ہے اور برادران وطن بھی بالعموم اس کو مسلم ادارہ ہی سمجھتے ہیں
لیکن وقتاً فوقتاً سوالیہ نشان بھی لگاتے رہتے ہیں۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی کہ روز اول
سے یہ ادارہ ایک قومی ادارہ ہے، اس نے سب کو یکساں فیض پہنچایا ہے۔ کیا سورج کی روشنی
سب کے لئے یکساں نہیں ہے؟ کیا گنگا کا پانی صرف ہندوؤں کی کھیتی کو سیراب کرتا ہے؟"

(محدث بنارس، جولائی ۹۶ء ص ۳۵)

پروفیسر محمد اشرف خاں سلیمانی

مزاجِ اُمت کے منافی نظامِ تعلیم:

سرسید مرحوم کی آثار الصنادید، مضامین اور تفسیر القرآن کے بعض اجزا نظر سے
گزرے۔ آثار الصنادید مفید کتاب ہے۔ سرسید مذہبی نظریات بحمد للہ متاثر نہ کر سکے۔ نیچریت
و حقیقت سے بعید تر تاویلات (جن کے ڈانڈے تحریف سے مل جاتے ہیں) اور مغرب کی ذہنی
مرعوبیت سے طبیعت نفور رہی۔ سرسید مرحوم (اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے) مسلمانوں کی
محبت، قومی درد و خلوص کے باوجود امت کے صحیح مرض وعلاج کی تشخیص و تجویز نہ کر سکے اور ان کی
مساعی کی وجہ سے اسلامیان پاک و ہند نے ایک ایسے نظام تعلیم کو قبول کر لیا جس سے کئی

تک گو وقتی معاشی مفادات وابستہ تھے لیکن حقیقتاً وہ مزاج اُمت کے منافی تھا اور اس میں امراض امت کا مداوا نہ تھا ... کیا قیامت ہے کہ ایک چوتھائی صدی گزر جانے پر پاکستان اس فرسودہ نظام تعلیم اور تقویم پارینہ سے اپنا دامن نہ چھڑا سکا اور اس قدیم اور چاک ''قبا'' پر پیوند لگا رہا ہے۔

(میری علمی اور مطالعاتی زندگی ص ۱۶۸)

شیخ محمد اکرام

مخالفت اور تکفیر کا اصل پس منظر:

اس مخالفت کے متعلق عوام بلکہ خواص میں بھی کئی غلط فہمیاں رائج ہیں سب سے بڑی غلط فہمی جو اس بارے میں بہت عام ہے، یہ ہے کہ علما نے سرسید کی مخالفت اسی وجہ سے کی کہ وہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم رائج کرنا چاہتے تھے۔ ہم نے سرسید کے موافق اور مخالف تحریروں کا مطالعہ کیا ہے، ہماری رائے میں یہ خیال غلط ہے اور علمائے اسلام کے خلاف صریح بے انصافی ہے ... اس معمہ کے حل کرنے کے لئے ان مضامین اور فتاویٰ کا مطالعہ کرنا چاہیے جو سرسید کی مخالفت اور ان کی تکفیر میں شائع ہوئے۔ ان کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ علی گڑھ کالج کی مخالفت اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ وہاں مغربی علوم پڑھائے جاتے تھے بلکہ اس لئے کہ اس کی بنا میں سرسید کا ہاتھ تھا اور سرسید اپنی کتب اور ''تہذیب الاخلاق'' میں معاشرتی اور مذہبی مسائل کے متعلق ایسے عقائد کا اظہار کر رہے تھے جنہیں عام مسلمان اسلام کے خلاف سمجھتے تھے۔ علی گڑھ کالج کے متعلق سخت سے سخت مضامین اور درشت سے درشت فتاویٰ میں یہ نہیں لکھا کہ انگریزی پڑھنا کفر ہے بلکہ یہی ہوتا تھا کہ جس شخص کے عقائد سرسید جیسے ہوں وہ مسلمان نہیں اور جو مدرسہ ایسا شخص قائم کرنا چاہے اس کی اعانت جائز نہیں ... ان کی سب سے زیادہ مخالفت اس وقت ہوئی جب انہوں نے ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا اور ان مذہبی عقائد کا اظہار کیا جنہیں عام مسلمان تعلیم اسلامی کے خلاف اور ملحدانہ سمجھتے تھے مثلاً شیطان، اجنہ اور ملائک کے وجود سے انکار، حضرت عیسیٰ کے بن باپ پیدا ہونے

یہ زندہ آسمان پر جانے سے انکار، حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ کے معجزات سے انکار وغیرہ وغیرہ۔ سر سید نے اپنے وقت کا بڑا حصہ ان عقائد و خیالات کی تفصیل میں صرف کیا ہے، اور اگرچہ یہ صحیح ہے کہ یہ کام انہوں نے خالص اسلامی ہمدردی سے متاثر ہو کر کیا لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان عقائد کی مخالفت قدرتی امر تھا۔ جن لوگوں نے سر سید کے حالات بغور نہیں پڑھے وہ سمجھتے ہیں کہ سر سید کی مخالفت ان دقیانوسی علما نے کی جو ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے تھے اور سرکار انگلشیہ اور انگریزی تعلیم کے مخالف تھے۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ مدرستہ العلوم کے سب سے بڑے مخالف دو بزرگ تھے اور دونوں معزز سرکاری ملازم یعنی مولوی امداد العلی ڈپٹی کلکٹر اور مولوی علی بخش سب جج۔

(موجِ کوثر مطبوعہ ۱۹۴۰ء: ص ۵۱-۵۳)

عام تفسیروں اور سر سید کی تفسیر میں بڑا فرق ہے۔ سر سید تکفیر کے سزاوار نہ سہی لیکن ان سے جمہور علما کا اختلاف قدرتی تھا ...... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض مسلمانوں نے کئی اہم مسائل میں سر سید کی رائے اختیار کر لی ہے۔ مولوی محمد علی امیر جماعت احمدیہ کی تفسیر قرآن بیشتر سر سید ہی کی ترجمانی ہے۔ حضرت عیسیٰ کے متعلق سر سید کے جو عقائد تھے وہ مرزا غلام احمد نے اختیار کر لئے ...... تفسیر کی اشاعت نے سر سید کے کاموں کو نقصان بہت پہنچایا اور فائدہ بہت کم۔ ان کا اصل مقصد مسلمانوں میں تعلیم عام کرنا اور ان کی دنیوی ترقی کا انتظام کرنا تھا۔ اسلام اور تفسیر قرآن کے متعلق، بالخصوص ان مسائل کے متعلق جن کا نہ تعلیم سے خاص تعلق ہے نہ دنیوی ترقی سے، عام مسلمانوں سے گہرا اختلاف پیدا کر کے سر سید نے اپنی مخالفت کا سامان آپ پیدا کر لیا اور بعض لوگوں کو انگریزی تعلیم سے عقائد متزلزل ہو جانے کا جو ڈر تھا، اس کا بدیہی ثبوت خود بہم پہنچا دیا۔ اس کے علاوہ سر سید نے اپنی رائے اور قیاس کے زور سے قرآنی آیات کو نیا مفہوم دیکر ایک ایسی مثال قائم کر دی جس کی پیروی بعضوں نے بری طرح کی ہے اور ہر آیت یا حدیث کی تاویل کر کے حسب خواہش معنی مراد لئے ہیں۔ یورپ سے کوئی بھی آواز اُٹھے، لوگ فوراً یہ کہنے کو تیار ہو جاتے ہیں کہ ہمارے ہاں بھی یہی ہے۔ پچھلے دنوں ایک ایل ایل بی صاحب نے ایک رسالہ اس مضمون کا شائع کیا تھا کہ اسلام میں مغربی طریقہ رقص

یعنی ''بال روم ڈانسنگ'' کی اجازت ہے اور اس خیال کی تائید احادیث اور روایات سے کی تھی۔ اس طریقے سے ایک تو مخالفین کی نظروں میں، جن کے اعتراضات رفع کرنے کے لئے علم کلام کی ضرورت بتائی جاتی ہے، اسلام کی کوئی وقعت اور عزت نہیں رہتی اور دوسرے، قوم میں خود نیک و بد اور موزوں اور غیر موزوں کی تمیز اُٹھ جاتی ہے اور ایمان و یقین سے عاری لوگوں کے ہاتھوں میں مذہب ایک کھلونا بن جاتا ہے۔ (ایضاً ص۸۷۔۸۹)

نااہل شرابی بیٹے کی نامزدگی کے باعث ٹرسٹی بل پر اختلاف:

اس مخالفت کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کالج کے انتظامات میں سرسید کے علاوہ کسی نے اتنی محنت نہ کی تھی جتنی مولوی سمیع اللہ خاں نے، اور سرسید کے بعد ان کا سیکرٹری ہونا قدرتی امر تھا۔ دوسرے، لوگوں کو سید محمود سے کئی شکایتیں بھی تھیں۔ اُن کی قابلیت میں کوئی شک نہ تھا لیکن وہ طبیعت کے ذرا تیز تھے اور شراب نوشی کی مذموم عادت ان کی شہرت کو بٹا لگا رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اسی زمانے میں اپنی قابلیت، شہرت اور باپ کے اثر و رسوخ کے باوجود کثرت شراب نوشی کی وجہ سے ہائی کورٹ کی ججی کے ناقابل سمجھا جائے اور اس سے استعفیٰ طلب کیا جائے، وہ ایسی قوم کے اہم ترین ادارے کا موزوں مہتمم کیسے ہوسکتا تھا جو شراب کو حرام سمجھتی ہے، اور کالج کے طلبہ کے لئے وہ کون سی نیک مثال قائم کرسکتا تھا؟ سید محمود کے مخالفین کے اعتراضات میں بڑا وزن تھا اور یہ ممکن تھا کہ مولوی سمیع اللہ اور سید محمود کے علاوہ کسی تیسرے آدمی کو جائنٹ سیکرٹری چنا جاتا لیکن سرسید اپنی تجویز پر اڑے رہے اور اُن کے احترام کے پیش نظر کمیٹی نے بھی کثرت رائے سے یہ تجویز منظور کرلی، چنانچہ مولوی سمیع اللہ خان اور ان کی پارٹی کالج سے علیحدہ ہوگئی۔ (ایضاً: ص۵۶)

پست درجے کی مادیت اور شیئیت پسندی:

سرکاری ملازمت کو علی گڑھ کا اہم ترین عملی مقصد بنانے کا بڑا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں ایک پست درجے کی مادیت اور شیئیت پسندی پیدا ہوگئی جو نہ صرف طلبہ کی مذہبی ترقی اور روحانی تربیت کے لئے ناسازگار تھی بلکہ جس نے ان کی اصل دنیوی ترقی پر بھی اثر ڈالا۔ دنیا میں ترقی

کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے: صحت جسمانی، ہوش و خرد اور کیرکٹر۔ صحیح کامیابی کے لئے تینوں چیزیں درکار ہیں لیکن کیرکٹر کی ضرورت سب سے زیادہ ہے۔ اگر عزائم بلند نہ ہوں یا بلند ارادوں کی تکمیل کے لئے شوق، محنت، مستعدی، قربانی، ارادے کی پختگی، ایمان کامل اور طبیعت پر قابو نہ آئے تو قوی ہیکل جثوں اور تیز و طرار دماغوں سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ علی گڑھ میں بھی یہی ہوا۔ حقیقی یا خیالی ضروریات نے مطمح نظر کو محدود کر دیا اور روحانی کمزوری سے کیرکٹر پست ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جدید اور باقاعدہ تعلیم کے باوجود نہ صرف مذہبی نقطۂ نظر سے، بلکہ دنیوی اور ظاہری کامیابی کے لحاظ سے بھی، طلبائے علی گڑھ اس بلندی پر نہ پہنچے جو علی گڑھ کالج کے دقیانوسی اور قدیم الخیال، لیکن روحانی طور پر سر بلند اور کیرکٹر کے لحاظ سے پختہ کار بانیوں نے حاصل کی تھی۔ جن لوگوں نے مسجدوں کی چٹائیوں پر بیٹھ کر تعلیم پائی تھی ان میں تو سرسید، محسن الملک اور وقار الملک جیسے مدبر اور منتظم پیدا ہو گئے لیکن جن روشن خیالوں نے کالج کی عالی شان عمارتوں میں تعلیم حاصل کی تھی اور جن کی رسائی مغرب کے بہترین اساتذہ اور دنیا بھر کے علم و ادب تک تھی، وہ مطمح نظر کی پستی اور کیرکٹر کی کمزوری سے فقط اس قابل ہوئے کہ کسی معمولی دفتر کے کل پرزے بن جائیں، یا اپنے بانیوں کے خیالات اور اُن کی عظمت کا کوئی اندازہ کئے بغیر جو باتیں اُن کے مخالف کہہ رہے تھے (جو خود مکتبوں اور مسجدوں کے پروردہ تھے) انہی کو زیادہ آب و تاب اور رنگ و روغن دے سکیں۔ مادیت اور شیئیت پسندی کا جو اثر طلبہ پر ہوا وہی علی گڑھ کے اساتذہ پر ہوا ... وہاں مادیت اور ظاہر پسندی کا دور دورہ تھا ۔ اساتذہ میں علمی اہلیت اور فنی قابلیت تو ساری تھی لیکن ان کی نگاہیں بلند نہ تھیں۔ انہوں نے یہ تو نہ کیا کہ دولت دنیا میں مختصر سے مختصر پر کفایت کریں اور اپنے علمی شوق کی تکمیل، تصنیف و تالیف اور نام نیک کو حاصل زندگانی سمجھیں، ان کے نزدیک علم و فن کھانے کمانے کا ذریعہ تھا اس لئے بالعموم یہی خواہش ہوتی کہ علمی زندگی پر مردنی چھا جائے تو کوئی ہرج نہیں، لیکن مادی زندگی کی بہار ضرور لوٹی جائے۔ جو لوگ اس قابل تھے کہ اگر وہ بلند نظری کو کام میں لاتے تو شہرت دوام اور قومی احسانات میں حالی اور آزاد، شبلی اور نذیر احمد کو کہیں پیچھے چھوڑ جاتے، اُن کا منتہائے زندگی یہ ہو گیا کہ کسی طرح ظاہری ٹھاٹھ اور خوش معاشی میں وہ ایک سیکنڈ گریڈ ڈپٹی

کلکتہ کا مقابلہ کر سکیں۔ علی گڑھ کے پروفیسروں میں علمی قابلیت، مذاق کی شستگی اور نیک ارادوں کی کمی نہیں تھی لیکن جب خیالات کا رخ پھر گیا اور ہمتیں پست ہوگئیں تو یہ خوبیاں بے کار ثابت ہوئیں اور اساتذہ کا وقت عزیز ڈرائنگ روم کی تزئین، خوش معاشی، ضیافت بازی، کلب بازی، گپ بازی (اور ہاں، پارٹی بازی) کی نذر ہونے لگا۔ اس فضا میں علمی زندگی کا فروغ پانا محال تھا۔ (ایضاً مطبوعہ ۱۹۵۴ء ص ۱۵۱ تا ۱۵۴)

روحانی کمزوری اور ذہنی بزدلی کے شکار:

مادی نقطۂ نظر کے فروغ سے نہ صرف یہ ہوا کہ اساتذہ اور طلبہ ایسے علمی کاموں کی تکمیل سے معذور ہوگئے جنہیں پورا کرنے کی خاطر ایثار و قربانی اور محنت و مستعدی کی ضرورت تھی بلکہ خیالات میں ایک عجب طرح کی ''ڈھلمل یقینی'' یعنی روحانی کمزوری اور ذہنی بزدلی آگئی۔ سرسید کا خیال تھا کہ علی گڑھ والے ان کے کام کو جاری رکھیں گے، وہ اسلامی ہندوستان کی شاندار روایات کے وارث ہوں گے اور اسلام اور مسلمانوں پر جو اعتراض ہوتے ہیں ان کا دندان شکن جواب دیں گے لیکن یہاں یہ عالم تھا:

در بغل تیر و کماں، کشتۂ نخچیر شدیم

کسی طرف سے اسلام یا مسلمانوں یا علی گڑھ کے خلاف کوئی آواز اُٹھے، اس پر لبیک کہنے والے سب سے پہلے علی گڑھ سے نکلیں گے:

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

جہاں تک مسلمانوں، مسلمان بادشاہوں یا اسلام کے خلاف اعتراضات کا تعلق ہے، ان کے جواب میں کوئی قابل ذکر کتاب علی گڑھ کالج کے بانیوں کی نسل ختم ہو جانے کے بعد علی گڑھ سے آج تک شائع نہیں ہوئی بلکہ حالت یہ ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم کسی مسلمان بادشاہ، مثلاً سلطان محمود غزنوی یا اورنگ زیب، کے خلاف کچھ لکھے تو علی گڑھ کے خوش اخلاقوں کا یہی جواب ہوگا:

مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے

بلکہ وہ تو کہیں گے کہ نہ صرف محمود اور عالمگیر تعصب کے پتلے تھے بلکہ اسلامی حکومت کا موسس

اعی سلطان محمد غوری بھی ایک اناڑی جرنیل اور بھونڈا سپاہی تھا، اور یہ فقط نیرنگی قدرت کا کرشمہ ہے کہ وہ ایک سلطنت کی بنیاد ڈال گیا! (ایضاً ص ۱۵۵۔۱۵۶)

محمد اکرم ورک

''فتنۂ انکارِ سنت'' کی تحریک کے سرخیل:

تیسری قسم کے لوگ وہ تھے جو انگریزی تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور ذہنی مغلوبیت کا شکار ہو گئے۔ اس گروہ نے قدیم مذہبی فکر و فلسفہ کو مسلمانوں کے زوال کا سبب قرار دیا اور مسلمانوں کو ترغیب دی کہ وہ اقوامِ عالم میں اپنے مقام کی بحالی کے لئے انگریزی تہذیب و ثقافت کو اپنائیں اور انگریزی علوم و فنون میں کمال حاصل کرلیں۔ سرسید احمد خاں (م ۱۸۹۸ء) اس گروہ کے سرخیل ہیں۔ نئے حالات میں اسلام کو ''قابلِ قبول'' بنانے کے لئے سرسید نے اسلام کی تشکیلِ جدید کا بیڑا اٹھایا تاکہ مسلمان ''ترقی'' کی رفتار میں زمانے کا ساتھ دے سکیں۔ اسلام کی من مانی تعبیر و تشریح میں چونکہ حدیثِ رسولؐ سب سے بڑی رکاوٹ تھی، اس لئے حدیث کو ہدفِ تنقید بنایا جانے لگا۔ علمِ حدیث پر اعتراضات کا رجحان بالآخر ''فتنۂ انکارِ سنت'' کی تحریک میں تبدیل ہو گیا۔ سرسید نے سب سے پہلے عقل کی روشنی میں قرآنِ مجید کی تفسیر لکھی اور معجزات کے علاوہ کئی دیگر اسلامی عقائد کا حلیہ بگاڑنے کی کوشش کی۔

(الشریعۃ گوجرانوالہ، فروری ۲۰۰۵ء، ص ۲۹)

محمد امجد حسین

قدیم مُلحد فلاسفہ کے فاسد نظریات کے بل بوتے پر تجدّد کا ڈھنڈورا:

سو سال پہلے کی بات ہے، سرسید فلاسفہ قدیم و جدید کا وارث اور نیچر و سائنس کا پجاری بن کر اسلام کے بنیادی قوانین و اعتقادات اور قرآن کی صریح نصوص سے ثابت نظریات و افکار پہ طبع آزمائی کرتے ہوئے تیشہ زنی کرتا رہا اور معجزات اور بہت سے اسلامی احکام کا اور

حشر نشر، معاد اور جنت جہنم، ملائکہ، نبوت، وحی سب اسلامی بنیادوں کی ایسی رکیک تاویلات کر گیا کہ الامان والحفیظ! وہ حامت مغرب و دانش فرنگ کے بعض نظریات سے متاثر و مرعوب ہو کر ، جو ابھی خود بھی خام و ناپختہ تھے، ایسی ایسی لچر باتیں لکھ مارتا ہے کہ بڑے بڑے کفار و ملحدین بھی شرما جائیں لیکن دانش فرنگ کا محو سفر کارواں چندے بعد ہی ان سابقہ نظریات کو غبار راہ بنا کر اڑا دیتا ہے تو شیخ نیچری کی نیچریات کے غبارے کی ساری ہوا نکل جاتی ہے۔

حیرت ہے کہ سرسید وغیرہ نیچر پرست اپنی افلاطونیت کے ترنگ میں مسلمات دین کی تاویل اور آیات قرآنیہ کی تحریف کا اتنا بڑا اقدام کرتے ہیں کہ فارابی و ابن سینا جیسے معلمین حکمت کے بھی کان کترجاتا ہے لیکن فلسفہ و سائنس کے وہ گھسے پٹے نظریات، جن کی بنیاد پر انہوں نے نیچریت کی ساری عمارت کھڑی کی ہے، علمائے اسلام خصوصاً ابن تیمیہ اور امام غزالی نے اور پچھلے دور میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے تحلیل و تجزیہ کر کے ان تمام فلسفیانہ آلودگیوں سے حقائق نفس الامریہ اور الٰہیات و طبیعیات کا مطلع صاف کیا ہے۔ ان بزرگوں کے فلاسفہ کے متداولات کے رد پر مبنی یہ تصانیف شاید اس گروہ نیچر کے احاطۂ علم سے ماوراء ہی رہیں ورنہ وہ یہ پرانے راگ الاپنے سے باز رہتے جن کا حرف بحرف اور ترکی بہ ترکی جواب ہو چکا ہے، اور ان فاسد و متضاد نظریات و فلسفیانہ مباحث پر ان علمائے اسلام نے جو مضبوط گرفت خود انہی کے اصولوں کی روشنی میں کی ہے اور ان کا تضاد و سقم واضح کر کے خود ان کے اصولوں کا قبلہ حقائق نفس الامریہ کی روشنی میں درست کیا ہے، اس کے بعد کسی مادہ پرست اور نیچری کو زیب نہیں دیتا کہ ان پرانے ناقص نظریات پر کاربند ہو۔

ان معتزلہ جدید مغرب گزیدہ و فلسفہ زدہ نیچریوں نے معتزلہ قدیم اور مشرق و مغرب کے ملحد فلاسفہ کے انہی کھوٹے سکوں کے بل بوتے پر اپنے علم و تجدد کا سکہ بٹھانا چاہا اور ذہنی نظریات و تفصیلات سرقہ کر کے تجدد کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کیا اور انہی فاسد نظریات میں ملت کے درد کا درماں ڈھونڈنے لگے اور اس راہ سے اس طبقے نے مغرب سے درآمد ہر فکر و خیال اور ہر طور و طریقے کو انسانی فلاح و ترقی کی معراج جان کر پورے دل و جان سے اس پر امنا وصدقنا کہہ کر سمعنا واطعنا کا طرز عمل اپنایا اور پھر شومئ قسمت کہیے یا ایک منظم سازش کہ امت کی

سیادت و قیادت اس طبقہ کے ساتھ وابستہ کر دی گئی اور ملت کی قسمت کے فیصلے ان کے ہاتھوں سے ہونے لگے۔ گزشتہ سو سال کے اس طرز عمل نے امت کو بنی اسرائیل کی طرح گمراہی اور بے راہ روی کے ایسے میدان تیہ میں لا کھڑا کیا ہے کہ آج پوری امت "نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن" کے مقام پر کھڑی ہے اور "تک تک دیدم دم نہ کشیدم" کا منظر پیش کر رہی ہے۔

(التبلیغ راولپنڈی، اکتوبر ۲۰۰۵ء، ص ۳۴ تا ۳۵)

محمد امین زبیری

مدرسۃ العلوم کے طلبہ کی مسلّم وفاداری:

یہاں کے طلبہ کی وفاداری مسلّم ہو گئی، وہ قابلیت اور کیریکٹر میں ہندوستان کے بہترین اور انگلستان کی یونیورسٹیوں کے طلبہ کے برابر شمار ہونے لگے۔ حکومت کے افسروں نے، جن میں وائسراؤں سے حکام ضلع تک شامل ہیں، اپنے اثر سے کالج کو بڑے بڑے فوائد پہنچائے اور سرکاری ملازمت میں اس کے طلبہ کو ترجیح دی گئی۔ اسی ادارہ سے کانگریس کا زور و شور کم کرنے اور مسلمانوں کو اس سے جدا اور اس کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے بھی سخت کوششیں ہوئیں اور مسلمانوں کے دامن سے غداری و تعصب اور جہالت وغیرہ کے داغ مٹنے اور ہلکے ہونے شروع ہو گئے، کالج کے ہر ایڈریس میں مسلمانوں کی وفاداری کا یقین دلایا گیا اور جواب میں اس کا اعتراف اور حوصلہ افزائی کی گئی۔

(تذکرہ محسن، ص ۲۰۰)

غلام احمد قادیانی اور سر سید کے خیالات کا مرکب مولوی محمد علی:

مولوی محمد علی نے بھی اپنے ترجمہ و تفسیر قرآن میں سر سید کی تفسیر سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے اور حواشی میں ایسے نوٹ کثیر تعداد میں ملتے ہیں جو سر سید سے ماخوذ ہیں، جس کو سر سید کے مذہبی عقائد و نظریات کا ایک ارتقائی پہلو کہا جا سکتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ محمد علی نے اپنے مذہبی پیشوا کی تعلیمات کو بھی اس میں شامل کر لیا ہے۔ اس کوشش میں مولوی محمد علی کا جو رنگ ابھرا ہے، وہ غلام احمد قادیانی اور سر سید کے خیالات کا ایک مرکب معلوم ہوتا ہے۔

(تذکرہ سر سید، ص ۲۹۰)

پروفیسر محمد انوار الحسن شیر کوٹی

سوقیانہ الفاظ کا استعمال:

ہمیں سرسید کی روح سے معذرت کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مجاہدین آزادی کے بڑے بڑے بزرگوں کے لئے سرسید نے جو سوقیانہ الفاظ استعمال کئے ہیں، وہ انہیں زیب نہیں دیتے۔ نواب محمود خاں کو نامحمود، عبدالکریم عرف ماڑے خاں شیر کوٹی کو...... (جن کے نام کے ساتھ سرسید نے 'حرامزادہ' کا لفظ استعمال کیا ہے [ناقل] دیکھئے ،سرکشی ضلع بجنور ص ۱۱۵)، مجاہدین تھانہ بھون کو جن میں حاجی امداد اللہ، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم، حافظ محمد ضامن شہید رحمہ اللہ علیہم اجمعین تھے، انہیں مفسدین لکھنا غیر مہذب اور ناشائستہ حرکت ہے۔ بھلا انگریزوں کے طرفدار مسلمانوں کو پکا مسلمان کہنا کون سی حدیث میں لکھا ہے؟ کیا سرسید بتائیں گے کہ قاضی عنایت کے چھوٹے بھائی کو بلا تحقیق پھانسی دے دینا، گولیوں سے اڑا دینا ان کے نزدیک کس طرح جائز ہے؟

(انوار القاسمی ص ۲۷۶ بحوالہ "انگریز کے باغی مسلمان" ص ۲۰۱)

محمد ایوب قادری

گورنمنٹ کے وفادار گروہ کا سرخیل:

نواب محمود خاں نے ضلع (بجنور) کے انتظام کو بڑی قابلیت سے درست کیا، ہندو مسلمانوں کے تعلقات کی استواری وخوشگواری پر زور دیا، مندروں کی حفاظت کے لئے پہرے لگوائے مگر گورنمنٹ کا وفادار گروہ، جس کے سرخیل سید احمد خاں صدر امین تھے، انگریزوں سے خفیہ خط وکتابت میں مصروف تھا اور ان لوگوں نے خیر خواہی سرکار کے پردے میں ہندو چودھریوں کو نواب محمود خاں کے خلاف بغاوت پر ابھارا۔ یہی وہ فتنہ تھا جو آگے چل کر محمود خاں کی حکومت کے لئے سب سے بڑا خطرہ اور انگریزی حکومت کے دوبارہ قیام کا سبب بنا۔

(جنگ آزادی ۱۸۵۷ء واقعات وشخصیات ص ۱۵۲)

محمد تقی عثمانی

فتنۂ انکارِ حدیث کی سب سے پہلی آواز:

یہ آواز ہندوستان میں سب سے پہلے سر سید احمد خاں اور ان کے رفیق مولوی چراغ علی نے بلند کی لیکن انہوں نے انکارِ حدیث کے نظریہ کو علی الاعلان اور بوضاحت پیش کرنے کی بجائے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جہاں کوئی حدیث اپنے مدّعا کے خلاف نظر آئی، اس کی صحت سے انکار کر دیا خواہ اس کی سند کتنی ہی قوی کیوں نہ ہو، اور ساتھ ہی کہیں کہیں اس بات کا بھی اظہار کیا جاتا رہا کہ یہ احادیث موجودہ دور میں حجت نہیں ہونی چاہئیں۔ اور اس کے ساتھ بعض مقامات پر مفید طلب احادیث سے استدلال بھی کیا جاتا رہا۔ اسی ذریعہ سے تجارتی سود کو حلال کیا گیا، معجزات کا انکار کیا گیا، پردہ کا انکار کیا گیا اور بہت سے مغربی نظریات کو سندِ جواز دی گئی۔ ان کے بعد نظریۂ انکارِ حدیث میں اور ترقی ہوئی اور یہ نظریہ کسی قدر منظم طور پر عبداللہ چکڑالوی کی قیادت میں آگے بڑھا......

(درسِ ترمذی، مکتبہ دار العلوم کراچی، ۱۹۸۰ء، بحوالہ ''محدث لاہور، اگست ستمبر ۲۰۰۲ء، ص ۱۴۰)

اسلام کے حلیے کا بگاڑ:

سر سید احمد خاں صاحب کے بہت سے دینی نظریات جمہورِ امت کے بالکل خلاف تھے جنہیں کبھی مسلمانوں میں قبولیت حاصل نہیں ہو سکی...... ''خطباتِ احمدیہ'' جمہورِ امت کے نقطۂ نظر سے انتہائی غیر مستند کتاب ہے جس میں اہلِ مغرب کے اعتراضات سے خواہ مخواہ مرعوب ہو کر قرآن و سنت کی نصوص میں ایسی رکیک تاویلات سے کام لیا گیا ہے جو تحریف کی حد تک پہنچ گئی ہیں...... شکوک و شبہات رفع کرنے کی اس کوشش میں ''تہذیب الاخلاق'' کے بعض مضامین نے اسلام کا حلیہ اس طرح بگاڑ دیا کہ وہ آنحضرت ﷺ کے لائے ہوئے اسلام کے بجائے ایک ایسا ڈھیلا ڈھالا جامہ بن گیا جو دنیا کے ہر باطل سے باطل خیال پر فٹ ہو سکتا ہو۔

(البلاغ کراچی، مئی ۱۹۷۴ء، ص ۵۶)

محمد ثناء اللہ

انگریزوں کے سامراجی اور مشنری مقاصد کی معاون علی گڑھ تحریک:

ہندوستان میں انگریزوں کو دو ایسے افراد مل گئے جن کی جدوجہد سے ان کے بہت سے مقاصد پورے ہوئے۔ یہ دو اشخاص تھے، سرسید احمد خاں اور مرزا غلام احمد قادیانی ..... سرسید نے قرآن کریم کی ایسی تاویل کی جس سے قرآن ہی کی تحریف نہیں بلکہ عربی زبان اور قواعد کی بھی تحریف ہوتی ہے۔ سید جمال الدین افغانی نے سرسید کو ہندوستان میں دہریوں کا سرخیل قرار دیا تھا سرسید کی رائے کے مطابق انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا صحیح نہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے دوران سرسید نے انگریز سپاہیوں کی حمایت کی تھی ..... اسلام اور عیسائیت میں ہم آہنگی، انگریزوں کے خلاف جہاد نہ کرنے کی دعوت، مسلم خواتین کی آزادی اور مغربی عورتوں کی تقلید، اور مسلمانوں کو ''جامد'' افکار سے آزاد کرنا اور مغربی تہذیب میں پوری طرح رنگ جانا علی گڑھ تحریک کے خاص خاص مقاصد تھے۔ سرسید نے جس انداز سے قرآن کی تفسیر لکھی تھی اور انجیل کی تفسیر لکھنا شروع کیا تھا، وہ اسلام اور عیسائیت میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی نمایاں کوشش تھی۔ علی گڑھ تحریک کے جو نتائج سامنے آئے ان کو مختصراً یوں بیان کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں میں ایک ایسی ''اینگلو محمڈن'' اور ''اینگلو انڈین'' نسل پیدا ہوئی جس کی نفسیات کی ترکیب میں ''محمڈن'' عناصر کم اور انگریزی عناصر زیادہ تھے (ابوالاعلیٰ مودودی) ..... اپنی تاریخ اور تہذیبی اقدار سے دوری، اسلامی عقائد کا استخفاف، ہر چیز میں مغرب کی تقلید اور آزادی نسواں جیسے مشنری مقاصد اگر کسی کی نظر میں ہوں تو وہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ علی گڑھ تحریک سے انگریزوں کے سامراجی اور مشنری مقاصد کو بروئے کار لانے میں اس سے کیا مدد مل سکتی تھی۔

(ذکر و فکر دہلی، ستمبر اکتوبر ۱۹۸۸ء: ص ۱۰۰-۱۰۲)

محمد رحیم دہلوی

میور کے اعتراضات کے جواب میں فرنگی آقاؤں کا خوف:

سرسید نے میور کی کتاب کی غلطیوں کی نشان دہی تو کی ہے مگر وہ میور سے اس قدر

زرے ہوئے ہیں کہ جہاں بھی اس کا یا اس کی کتاب کا 'جو غلطیوں کی پوٹ ہے' ذکر کرتے ہیں انتہا درجے بالملاحظہ باادب رہتے ہیں اور اس کی تعریف وتوصیف کے بغیر آگے نہیں بڑھتے چنانچہ کتاب کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

''عیسائی مصنفوں کی کتابوں میں سب سے زیادہ عمدہ وہ کتاب ہے جو سرولیم میور صاحب نے نہایت لیاقت اور قابلیت اور کمال خوبی کے ساتھ لکھی ہے۔ یہ کتاب چار موٹی موٹی جلدوں میں ہے اور بہت خوب صورت ٹائپ اور خوش وضع تقطیع میں چھپی ہے۔ اس لائق و فائق مصنف کو مثل مغربی علوم کے مشرقی علموں میں بھی بڑی واقفیت حاصل ہے اور اس لئے ان کی اس کتاب نے تمام تربیت یافتہ یورپ کے ملکوں میں بڑی قدر و منزلت پائی ہے جو اسی قدر و منزلت کے لائق ہے، اور یورپ کے عالموں اور عالموں کی مجلس نے بھی اس کتاب کے سبب ان کی ایسی قدر کی ہے جس کے درحقیقت وہ مستحق تھے''

سرسید احمد خاں نے میور کے بے جا اعتراضات کے جو جواب دیئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے فرنگی آقاؤں سے ڈر ڈر کر اور پہلو بچا بچا کر لکھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دبے بیٹھے ہیں، ڈرے ڈرے ہیں اور شبلی نعمانی سے بھی کہیں زیادہ فرنگیوں سے مرعوب ہیں۔

(فرنگیوں کی لن ترانیاں: ص ۱۲۳تا۱۲۶)

پروفیسر ڈاکٹر محمد ریاض

دوقومی نظریے کا اصل خالق؟ نہ سرسید، نہ کوئی اور!

دوقومی نظریہ سب سے پہلے کس نے پیش کیا؟ اس بارے میں مختلف قیاس پیش کئے جاتے رہے ہیں اور مزید قیاس آرائیاں ممکن ہیں۔ بعض حضرات لکھتے ہیں کہ محمد بن قاسم کے حملۂ سندھ کے ساتھ ساتھ دوقومی نظریہ وجود میں آ گیا تھا کیونکہ یہاں کے باشندے اہل کتاب نہ تھے۔ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان کوئی مشترک عنصر نہ تھا۔ انہیں ایک دوسرے کے معابد، روایات اور تاریخ میں بُعد نظر آتا رہا مگر مسلمان چونکہ حاکم رہے، اس لئے معاملہ دبا رہا

ہندوؤں کو ذرا کھلی چھٹی ملی تو اپنے عزائم ظاہر کر دئے۔ بعض مصنف حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی (م ۱۶۲۴ء) نے اصلاحی مکاتیب اور بیانات کو، جو اکبر کے ''دین الٰہی'' کی بیخ کنی کے لئے وقف تھے، دوقومی نظریہ کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۷۶۲ء) نے اسلام کے احیا اور مسلمانوں کے تہذیب وتمدن کو مشخص کرنے کی خاطر بڑا کام کیا، دوقومی نظریہ کے خالقوں میں اُن کا نام بھی لیا جاتا ہے سرسید مسلمانوں کی جداگانہ تہذیب وتمدن کے بھی حامی تھے، اس لئے دوقومی نظریہ کے نقش گروں میں ان کا نام بھی لیا جاتا ہے--اور اس فضیلت سے فیض یاب ہونے والے بعض دوسرے حضرات بھی ہیں۔ ہمیں ان سب بزرگوں کی خدمات کا اعتراف ہے اور اُن کے افکارِ عالیہ کا پاس، مگر حقیقت یہ ہے کہ جدید تر صورت میں دوقومی نظریہ یا نظریۂ پاکستان کا مذکورہ یا دیگر بزرگوں کے ساتھ انتساب دور کی تاویل نظر آتی ہے۔

(اقبال اور برصغیر کی تحریک آزادی: ص ۶۰۔۶۱)

تحریک پاکستان میں دوقومی نظریے کا ذکر بار بار ملتا ہے۔ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے یہ مسئلہ بڑا سادہ ہے کہ دنیا میں ابتدا سے ایک ملت کفر رہی ہے اور دوسری ملت اسلام۔ اس کے مطابق برصغیر کے مسلمان ایک قوم ہیں اور دوسرے مذاہب کے پیرو (خصوصاً ہندو، جو اکثریت کے حامل تھے) ایک دوسری قوم......

(ماہِ نو لاہور، مارچ ۱۹۸۳ء: ص ۱۶)

خواجہ محمد زکریا

نام لئے بغیر سرسید کے نظریات پر علامہ اقبال کی بالواسطہ تنقید:

......بعض ایسی شخصیات، جو مکمل طور پر سرسید کے نظریات سے متفق نہیں تھیں، ناقدین نے انہیں سرسید کے متاثرین کے کھاتے میں ڈال دیا۔ اکبرالہ آبادی نے تو سرسید احمد خاں پر واشگاف الفاظ میں چوٹیں کی ہیں اس لئے سرسید کے حلقۂ اثر میں شمار ہونے سے بچ گئے ہیں مگر جن لوگوں نے ان کا نام لئے بغیر اُن کے نظریات سے اختلاف کیا ہے انہیں عام طور پر

افکارِ سرسید ہی کی توسیع سمجھا جاتا ہے۔ علامہ اقبال کا شمار بھی انہی شخصیات میں ہوتا ہے
بات سے قطع نظر کہ حالی بھی آخری چند برسوں میں سرسید کے نقطۂ نظر سے پوری طرح متفق نہ
رہے تھے، اقبال کے سلسلے میں تو یہ رائے قطعی بے جواز ہے۔ علامہ اقبال کے کلام نظم و نثر میں
سرسید کا ذکر بہت کم آیا ہے، بلکہ صرف ایک ہی نظم میں ان کا تفصیلی ذکر ہوا ہے۔ وہ ''بانگِ درا''
کے دورِ اول کی نظم ''سرسید کی لوحِ تربت'' ہے۔ یہ نظم ۱۹۰۳ء میں لکھی گئی ہے۔ جیسا کہ سب
جانتے ہیں، یہ اقبال کی شاعری کا دورِ اول ہے اور انہوں نے جو کچھ اُس زمانے میں لکھا ہے، بعد
میں بہت کچھ اس کے برعکس تحریر کیا ہے۔ اُس زمانے کا اکثر کلام محض اس لئے برقرار رکھا گیا ہے
کہ قاری کو اُن کا ذہنی ارتقا سمجھنے میں دشواری پیش نہ آئے اور اسے معلوم ہو جائے کہ جو شخص کسی
زمانے میں

ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

کہتا تھا، بعد میں اس کے برعکس

مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

کیوں کہنے لگا تھا۔ ''سید کی لوحِ تربت'' بھی اسی قسم کی نظم ہے جسے غیر ضروری اہمیت نہیں دینی
چاہیے۔ سرسید احمد خاں کے ساتھ اقبال کو ۱۹۰۳ء میں جو دلچسپی تھی وہ اس وجہ سے تھی کہ ان کے
نظریات وطنیت کے جغرافیائی تصور پر مبنی تھے۔ اگرچہ آج سرسید احمد خاں کو نظریۂ پاکستان کا بانی
قرار دیا جاتا ہے مگر ان کی تحریروں سے مجموعی طور پر وطنیت کا جغرافیائی تصور ہی ظاہر ہوتا ہے، اور
سرسید کے دور کے حالات کو مدنظر رکھئے تو یہ کوئی قباحت کی بات نہیں۔ جب سرسید احمد خاں
صدقِ دل سے یہ محسوس کرتے تھے کہ انگریز ہندوستان سے کبھی نہیں جائیں گے تو وہ ہندوستان
کی تقسیم کے متعلق کیونکر سوچ سکتے تھے؟...... علامہ اقبال کی اہم ترین فکری تصنیف یعنی ''تشکیل
جدید الٰہیات اسلامیہ'' سرسید کے ذکر سے تہی ہے۔ شاعری میں ''جاوید نامہ'' کے برابر اہمیت
ان کی کسی کتاب کو حاصل نہیں ہے۔ اس کتاب کا ڈھانچہ اس قسم کا ہے کہ علامہ کی پسندیدہ
شخصیات کی فہرست اس میں مل جاتی ہے مگر اس میں سرسید احمد خاں کا ذکر کہیں بھی موجود نہیں
البتہ جمال الدین افغانی موجود ہیں اور ان کا ذکر بڑی محبت اور عقیدت سے ہوا ہے، اور یہ کون

نہیں جانتا کہ افغانی نے سیداحمد خاں پر بڑے تلخ لہجے میں تنقید کی ہے۔ تلاش بسیار کے بعد میں سیداحمد خاں کا بالکل سرسری ذکر علامہ کی تحریروں میں دو تین جگہ دیکھ سکا ہوں اور وہ بھی غیر متعلقہ حوالوں سے، اور وہاں ان کے افکار سے تعرض نہیں کیا گیا۔ تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ اقبال ان کے افکار کی اہمیت کے منکر تھے؟ یہ نتیجہ نکالنا کلیتاً درست نہ ہوگا، البتہ یہ درست ہے کہ سال بہ سال اکبرالہ آبادی سے متفق ہوتے جارہے تھے۔ سرسید کی بعض تحریروں کے لب بھی قائل تھے مگر ان کے ضرر رساں پہلوؤں پر ان کی نظر واضح طور پر پڑنے لگی تھی ... انہیں سرسید کی توضیحات سے اختلاف کرنا پڑا مگر سیداحمد خاں کی خدمات کی وجہ سے انہوں نے کہیں بھی ان کا نام لے کر تنقید نہ کی، تاہم سیاق وسباق سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید ہی کے نظریات ہدف تنقید بنے ہیں ... مکتب یا مدرسہ کی اصطلاح استعمال کر کے انہوں نے بالواسطہ طور پر سرسید ہی کے نقطۂ نظر کی تغلیط کی ...... غرض علامہ اقبال کے بارے میں یہ سمجھنا درست نہیں کہ وہ سرسید ہی کی تعلیمات کو آگے بڑھانے والے تھے۔ وہ صرف ایک خاص دور میں ان کی کوششوں کی اہمیت کو تسلیم کرتے تھے مگر اس حکمت عملی کی مزید توسیع کو نئے حالات کی روشنی میں قوم کے لئے مضر سمجھتے تھے۔

(اقبال کا ادبی مقام: ص ۹ تا ۱۷)

سرسید کی نامکمل جدید تعلیم سے نوجوانوں میں الحاد کی لہر:

سرسیداحمد خاں نے جو جدید تعلیم شروع کی وہ ضروری تھی مگر نامکمل تھی۔ صرف آرٹس اور فلسفے کی ادھوری تعلیم قوم کے لئے بہت کم مفید ثابت ہوسکتی تھی۔ اس سے قوم میں الحاد پھیل گیا اور نوجوان نئے فلسفوں کو پڑھ کر بطور فیشن خدا اور مذہب کے منکر ہوگئے۔ (ایضاً: ص ۳۱)

پروفیسر محمد سرور

سرسید پرستی کا شاخسانہ:

...... ''سرسید پرستی'' نے تحریک پاکستان کی تحریک کو، جسے بعد میں سرکاری

پروپیگنڈے کے ذریعہ اس رنگ میں رنگ دیا گیا، بری طرح مسخ کر کے رکھ دیا اور یہ عوامی
تحریک "عمی نزعہ منتب فقر" کی انگریز پرست تحریک کا ایک ضمیمہ بنادی گئی حالانکہ جہاں تک
قائد اعظم کا تعلق تھا، وہ کبھی بھی سرسید کی سیاسی پالیسیوں کے حامی نہیں رہے تھے اور ان کی
ساری زندگی انگریز سے آئینی جنگ لڑتے گزری تھی۔ خود پاکستان کی تحریک مسلمان عوام کی حق
خود ارادی کی بنیاد پر آزادی کی جدوجہد تھی، اس لئے اس وقت ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی نے
اس کی پرزور حمایت کی تھی لیکن ہوا یہ کہ ایک سے ایک بڑا خان بہادر اور 'سر'، نیز بڑے بڑے ہم
جو سرکاری افسر اس میں گھس آئے اور انہوں نے قائد اعظم کے زیر سایہ اپنی اپنی گدیاں
بنائیں۔ مرزا سکندر، جو ایک زمانے میں پشاور کے ڈپٹی کمشنر تھے، بڑے فخر سے کہا کرتے تھے
کہ سرحد میں مسلم لیگ میں نے بنائی ہے۔ خواجہ رحیم ۱۹۴۲ء میں لائل پور کے ڈپٹی کمشنر تھے
۔انہوں نے وہاں مسلم لیگ کا بڑا زبردست جلسہ کرایا۔ خاص دہلی میں نواب زادہ لیاقت علی
خاں کے دائیں بائیں سب مسلمان سرکاری افسر تھے جو قیام پاکستان کے بعد بڑے بڑے
عہدوں پر فائز کئے گئے۔ غرض عوام کی جدوجہد اور قربانیوں سے سرزمین پاک میں افسروں
نے اپنی بادشاہت قائم کر لی اور عوام اسی طرح پستے رہے جیسے پہلے پستے تھے۔ اسی "سرسید
پرستی" سے ہمارے ہاں سرکار پرستی اور افسر پرستی آئی اور انہوں نے پوری قوم کی سرتابی کرنے
والی صلاحیتوں کو مفلوج کر کے رکھ دیا اور "بجا کہیے" ہمارا شعار بن گیا۔

(افادات وملفوظات مولانا عبید اللہ سندھی: ص۷۶)

ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی

نیچر اور طبعی قوانین کی وسعت اور غیر معمولی استحکام:

میں سرسید کے اس نقطہ نظر سے اتفاق نہیں کرتا کہ نیچر اور طبعی قوانین کو اتنا وسیع اور
مستحکم مان لیا جائے کہ اللہ کا ارادہ، اس کی مشیت، اس کی رضا اور اس کے تعبدی اوامر سب کچھ
پابند ہو کر رہ جائیں۔ چنانچہ سرسید نے فرشتہ، شیطان، جنت، جہنم، معجزات انبیا اور دعا کی تعبیر
میں جو لغزش کی ہے وہ اسی کا نتیجہ ہے۔ مثال کے طور پر وہ جبریل امین کو کوئی ایسا وجود تسلیم نہیں

کرتے جس طرح عام مسلمان مانتے ہیں، بلکہ رسول اللہ ﷺ کے ملکہ نبوت سے تعبیر کرتے ہیں جس نے آپ کے قلب پر قرآن کریم کو نازل کیا، یا مثلاً وہ کہتے ہیں کہ آگ کی فطرت جلانا ہے تو جب تک یہ قانون فطرت ہے اس وقت تک کوئی چیز اس میں جلنے سے محفوظ نہیں رہ سکتی، اس لئے حضرت ابراہیم کا آگ میں ڈالا جانا ثابت نہیں ہے۔

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، مارچ اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۸۲)

معجزات سے انکار کی مضحکہ خیز تاویلیں:

سرسید کا یہ دعویٰ کہ ابراہیم کو آگ میں نہیں ڈالا گیا، اس کے خلاف قرآن کی آیت صریح ہے۔ اگر حضرت ابراہیم کو آگ میں نہیں ڈالا گیا تو ۰ آیت کی ضرورت بھی نہیں تھی یعنی آگ کو اللہ نے حکم دیا وہ عبث عمل تھا، نعوذ باللہ۔

سرسید کا دوسرا دعویٰ کہ حضرت عیسیٰؑ کے بغیر باپ کے پیدا ہونے پر قرآن میں کوئی نص موجود نہیں ہے، یہ بھی حقیقت واقعہ کا انکار ہے..... سرسید کے دعویٰ کے برخلاف اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کسی انسانی باپ سے پیدا ہوئے تھے۔ سرسید پر یہاں وہی اعتراض ہوتا ہے جو انہوں نے مفسرین علما پر کیا ہے۔ دراصل سرسید کے ذہن میں اہل کتاب کے خیال کی گونج تھی کہ حضرت عیسیٰؑ یوسف نامی کسی شخص سے پیدا ہوئے تھے۔

سرسید کا تیسرا دعویٰ کہ یونسؑ کو مچھلی نگل گئی تھی اس پر نص قرآنی موجود نہیں ہے، یہ بھی حقیقت کا انکار ہے..... سرسید کی مجبوری یہ ہے کہ ان کے مشاہدہ میں ہے کہ مچھلیاں انسان سے چھوٹی ہوتی ہیں، وہ بھلا انسان کو کیسے نگل سکتی ہیں؟ مگر وہیل مچھلی کی ضخامت، جس کا آج انسان مشاہدہ کر سکتا ہے، اس قدر ہوتی ہے کہ وہ ایک کیا متعدد انسانوں کو بیک وقت نگل سکتی ہے چنانچہ بعض صحابہ نے سمندر کے کنارے ایسی مچھلی دیکھی تھی جس کے کانٹے اونٹ کی کوہان کے برابر تھے۔ اصل میں سرسید نے اپنی عقل سے اللہ کی لامحدود فطرت کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے، اس کی وجہ سے ان کو معجزاتِ انبیا کی کنہہ سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ وہ قانونِ فطرت کو بس اتنا سمجھتے ہیں جتنا ان کے مشاہدہ میں آتا ہے۔

سرسید نے ان تمام معجزات پر گفتگو کرتے ہوئے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ

مفسرین کرام نے یہ ساری تفسیریں الفاظ قرآنی سے صرف نظر کر کے اسرائیلی روایات سے متاثر ہو کر کی ہیں سرسید کا مذکورہ تاثر درست نہیں کیونکہ علما نے معجزات کی تشریح قرآن وسنت کی زبان اور تصریحات کے مطابق کی ہیں، اسرائیلی روایات کا ان کے محقق علمانے خود ہی انکار کیا ہے۔ سرسید نے جن چیزوں سے اختلاف کیا ہے وہ قرآن ہی ہیں، اسرائیلیات نہیں۔ عیسیٰ کا مٹی سے پرندہ بنانا سرسید نے اس معجزہ کا صاف انکار کیا ہے اور اسے حضرت عیسیٰ کے بچپن کا کھیل قرار دیا ہے، جس طرح ہمارے عہد کے بچے مٹی کا گھروندا بناتے ہیں، گڈا گڑیا کا کھیل کھیلتے ہیں حضرت عیسیٰ کے معجزہ کی یہ مضحکہ خیز تاویل کی مثال شاید ہی تفسیر کی چودہ سو سالہ تاریخ میں کہیں مل سکے مگر سرسید کو ایسے ہر واقعہ کی توجیہہ کرنی تھی جو خلاف عادت انبیاؑ کے واقعات میں مذکور ہے کیونکہ ان کے نزدیک کوئی معجزہ خلاف قانون قدرت ہو نہیں سکتا، مگر سرسید کے ذہن میں یہ بات نہ آسکی کہ جو مروجہ اور معروف مشاہدہ کے خلاف ہوتا ہے، وہ بھی قانونِ قدرت کا پابند ہوتا ہے۔ (ایضاً، اکتوبر ۱۹۹۸ء: ص ۳۷ تا ۴۱)

پروفیسر سید محمد سلیم

انگریز پرستی کی دو آتشہ شراب:

لندن سے لوٹنے کے بعد سرسید کے اندر انگریز دوستی کا نشہ دو آتشہ ہو کر انگریز پرستی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ انگریز پرستی کی یہ دو آتشہ شراب وہ تمام مسلمانوں کو پلانا چاہتے تھے۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ محض انگریزی زبان یا مغربی علوم کی تحصیل کا مرکز نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو اس میں کوئی خرابی کی بات نہیں تھی مگر سرسید نے اس کالج کو انگریزی تہذیب وثقافت کی اشاعت کا مرکز بنا دیا۔ ہر ہر طریقہ سے انگریز کی محبت اور انگریزی تہذیب کی محبت مسلمانوں کے حلق کے اندر انڈیلنے کی کوشش کی گئی۔

(مسلمان اور مغربی تعلیم پاک وہند میں: ص ۱۹۶)

اسلام کا نیا ایڈیشن:

سرسید ایک طرف تو مسلمانوں کو انگریزوں کا وفادار بنانا چاہتے تھے اور دوسری

طرف وہ اسلام کا بھی ایک نیا ایڈیشن پیش کرنا چاہتے تھے جو حاکمان وقت کو گوارا ہو۔ مغربی تعلیم، جس کے لئے سرسید مسلمانوں کو ترغیب دے رہے تھے، وہ کسی صورت میں بھی غیر جانب دار نہیں تھی۔ اس پر مادیت، مسیحیت اور آخر میں لادینیت کی چھاپ بہت گہری لگی ہوئی تھی۔ ناممکن ہے کہ ایک طالب علم اس تعلیم کو حاصل کرے اور اس کے اثرات بد سے محفوظ رہے۔ ان خرابیوں کے تدارک کے لئے سرسید نے جو تدابیر اختیار کیں، وہ حد درجہ ناقص اور ناکافی تھیں۔ (ایضاً ص ۱۹۹۔۲۰۰)

سرسید کی بنیادی خامی:

سرسید احمد خاں کی ایک بنیادی خامی یہ رہی کہ وہ انگریزی زبان نہیں جانتے تھے، مغربی تہذیب کے متعلق ان کی معلومات براہِ راست نہیں تھیں اس لئے ان کے اندر مغربی علوم سے متعلق خود اعتمادی پیدا نہ ہوسکی۔ وہ اس احساسِ کمتری میں عمر بھر مبتلا رہے۔ مغربی علوم کو، خصوصاً سائنس کی معلومات کو، وہ حرف آخر سمجھ بیٹھے۔ اب جہاں کہیں اسلامی تعلیمات اور سائنس کی معلومات میں بظاہر کہیں تصادم نظر آیا، اس کا ایک ہی حل ان کے پاس تھا کہ وہ اسلام کی کتر بیونت کر کے اس کو سائنس کے جسم پر فٹ کردیں۔ اس بات کا ان کے یہاں احتمال بھی نہیں تھا کہ سائنس کی معلومات بھی غلط ہوسکتی ہیں اور کوئی دوسرا نظریہ بھی پیدا ہوسکتا ہے۔ مسلمانوں کی آئندہ تعلیم پانے والی نسلوں کو الحاد و دہریت سے محفوظ رکھنے کے لئے بقول ان کے صحیح اسلام کی تصویر انہوں نے پیش کی ہے۔ قرآن مجید کی تفسیر لکھی جو سترہ پاروں تک ہی لکھی جاسکی، مکمل نہ ہوسکی۔ اس تفسیر میں انہوں نے صرف آیات قرآنی کو قبول کیا ہے۔ تمام مفسرین، تمام فقہا کسی کو بھی قابلِ اعتنا نہیں سمجھا ہے۔ اس نئی تفسیر میں انہوں نے معجزاتِ رسول کا انکار کردیا، جنوں کے وجود کا انکار کردیا، وحی بذریعہ جبریلؑ کا انکار کردیا؛ قبولیتِ دعا کے وہ منکر ہیں، صرف آیاتِ قرآنی کو اپنی من مانی تفسیر کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ اس تراش خراش کے بعد جو اسلام باقی بچا، وہ ان کے خیال کے مطابق ایسا ہے کہ اس کو مغربی علوم سے اور سائنس سے کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس تراش خراش کے بعد کیا اسلام باقی بچا؟ ایسا مثلہ شدہ اسلام انسانی زندگی کی کیا رہنمائی کرسکے گا؟ ..... ان کے افکار و خیالات کی مدلل تردید

درحقیقت علامہ شبلی نعمانی اور پھر مولانا ابوالکلام آزاد نے کی ہے۔ ان سب تنقیدات کا مجموعی اثر یہ نکلا کہ عامتہ المسلمین مذہبی معاملات میں سرسید کی رائے کو کوئی وزن نہیں دیتے ہیں۔ اس طرح ان کے دینی اثرات زائل ہو گئے، مگر یہ حقیقت ہے کہ خود رائی کا جو بیج سرسید نے بویا تھا، وہ برگ و بار لایا۔ اس نے بہت سے گمراہ فرقوں کو جنم دیا۔ قادیانی، اہلِ قرآن، چکڑالوی، منکرین احادیث وغیرہ فرقے سب انہیں سے فیض یافتہ ہیں۔ (ایضاً: ص ۲۰۰۔۲۰۲)

تجدیدی کوششوں کی ناکامی:

مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی کوششوں کے نتیجے میں جو دینی شعور اور مخلصانہ عمل کا جذبہ گزشتہ دو صدیوں سے ابھر رہا تھا، جس سے سرشار طبقہ نے گزشتہ ایک صدی سے انگریزوں کے خلاف سردھڑ کی بازی لگا رکھی تھی، جو کسی حال میں ہار ماننے کو تیار نہیں تھا، جو اسلام سے مایوس نہیں تھا، سرسید نے اس طبقہ کو شکست دے دی، اس کی کوششوں پر پانی پھیر دیا، اس کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ بالآخر وہ طبقہ مدرسوں اور خانقاہوں میں پناہ گزیں ہو گیا اور بالآخر مایوسی، حرماں نصیبی اور جمود کا شکار ہو گیا۔ (ایضاً: ص ۲۰۲۔۲۰۳)

روایتی طبقہ کی سربراہی:

سرسید نے اس روایتی طبقہ کو تقویت پہنچائی اور اسے آگے بڑھایا جو اسلام کو اسلاف کا ایک قیمتی ورثہ تو ضرور سمجھتا ہے مگر زندگی کے معاملات میں اس کو واحد رہنمائی اور رہبری کا منصب دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس روایتی مسلمان طبقہ کو سرسید نے معاشرے کی زمام کار سپرد کر دی۔ ۱۸۷۰ء تک ولی اللّٰہی ساختہ طبقہ کی بالادستی قائم تھی لیکن ۱۸۸۵ء کے بعد سے اینگلو محمڈن طبقہ کو معاشرہ میں غلبہ حاصل ہو گیا۔ اسلام کے متعلق یہ طبقہ خوش عقیدگی اور خوش فہمی میں مبتلا ہے۔ سیاسی اور معاشی میدان میں یہ مسلمان قوم کے مفادات کا زبردست محافظ ہے لیکن انفرادی اور اجتماعی طور پر اسلامی احکام کی پیروی میں سخت کوتاہ دست ہے۔..... نوکری کرنا اور پیٹ پالنا ان کا منتہائے مقصود ہے؛ حاکم وقت کی وفاداری ان کا شعار ہے؛ نجی اور پبلک زندگی میں اعتقادی اور عملی یک رنگی کے یہ لوگ قائل نہیں ہیں۔ (ایضاً: ص ۲۰۳)

عقلی توجیہات سے انکارِ حدیث تک:

انیسویں صدی میں یورپ میں جس فلسفے اور سائنس کا غلبہ تھا اس کا غالب رجحان الحاد اور دہریت کی جانب تھا۔ سرسید خود بھی ایڈیسن اور اسپینسر کے مضامین سے بے حد متاثر تھے۔ ان کی مخلصانہ کوشش یہ تھی کہ اسلام کی ایسی توجیہہ پیش کی جائے جو یورپ کو قابلِ قبول ہو۔ فطری اصولوں کو محور تسلیم کر کے انہوں نے نصوصِ اسلامیہ کی توجیہہ شروع کر دی۔ اس سلسلے میں انہوں نے خرقِ عادات اور معجزات کا انکار کر دیا...... انہوں نے مسلک اعتزال کا ازسرنو احیا کیا...... عقلی توجیہات کے ضمن میں سرسید نے بعض صحیح احادیث کا انکار کر دیا۔ یہ احادیث جمہور علما کے نزدیک مستند ہیں۔ یہاں سے انکار حدیث کی رو چل پڑی...... اسی تحریک کا ایک شاخسانہ اہلِ قرآن کی تحریک ہے جس کو عبداللہ چکڑالوی نے خوب فروغ دیا ...... انکارِ تاریخِ اسلام، انکارِ حدیث کا ہی ایک شاخسانہ ہے جس کے بعد دین کا بنیادی ستون منہدم ہو جاتا ہے۔

(تعمیر افکار کراچی، مارچ تا مئی ۲۰۰۳: ص ۴۰۱ تا ۴۰۳)

ابن الوقتی اور انگریز پرستی کی تعلیم:

دبستانِ سرسید کے رہنماؤں نے مسلمانوں کو مرعوبیت، ابن الوقتی اور انگریز پرستی کی تعلیم دی تھی۔ سیاست ان کے نزدیک شجرِ ممنوعہ تھی۔ دین و سیاست کی تفریق کا نعرہ سب سے پہلے علی گڑھ میں لگایا گیا تھا۔ (ایضاً: ص ۴۰۳)

محمد سہیل عمر

ٹھوس علمی بنیاد سے محروم سرسید اور حالی کے افکار:

جس دور میں سرسید اور اُن کے رفقا ہندوستان کی فکری تاریخ میں اضافہ کر رہے تھے، اس وقت بھی مغرب میں دیگر دینی اور مابعد الطبیعاتی اصلاحات کی طرح فطرت کے لفظ کو بھی نئے معنٰی دئے جا رہے تھے۔ ہر مفکر اور ہر مکتب فکر اپنی اپنی انفرادی رائے کے مطابق اس

لفظ میں معنی ڈال رہا تھا۔ یہ معانی روایتی اصولوں سے تو کٹے ہوئے تھے ہی، آپس میں بھی ان کا کوئی نقطۂ اشتراک نہ تھا سوائے اس کے کہ سبھی نظریات شخصی رائے کی پیداوار تھے۔ سر سید نے روایتی علوم کی تعلیم نہیں پائی تھی۔ مابعد الطبیعاتی شعور کا فقدان ان کے ہاں بالکل واضح ہے لہٰذا دیگر دینی روایتوں اور تہذیبوں میں فطرت کے تصورات کا علم تو ایک طرف رہا، ان کو مسلمانوں کے کونیاتی علوم اور بالخصوص فطرت سے متعلق علوم کا بھی قرار واقعی علم نہ تھا۔ مسلمانوں کے لئے "دلِ دردمند" کے ہاتھوں مجبور ہو کر اصلاحِ معاشرہ کی دُھن میں پیرویٔ مغرب میں ایسے بڑھے کہ اور بہت سے خیالات کی طرح انہوں نے فطرت کے بارے میں بھی مغرب سے بعض چلتے ہوئے نظریات لئے اور انہیں ادھ کچرا ہی نگل گئے اور اُن کی بنیاد پر تفسیرِ قرآن سے لے کر سیاست و سماجیات تک اپنے افکار کی عمارت اٹھا دی۔...... ان دونوں بزرگوں کی نیت خواہ کتنی ہی نیک رہی ہو مگر ان کے افکار کسی ٹھوس علمی بنیاد سے محروم تھے۔ انہیں خود پتہ نہ تھا کہ جن تصورات کو وہ اٹل حقیقت سمجھ رہے تھے، ان کی حیثیت ان کے زمانے کی مغربی تہذیب کے متروکہ ردّی مواد سے زیادہ نہ تھی، اور اسے بھی زمانے کی ہوا نے جلد ہی ہباءً منثورا کر دیا۔

(سر سید اور حالی کا نظریہ فطرت: ص ۹-۱۰)

ڈاکٹر محمد شجاع ناموس

علی گڑھ یونیورسٹی کی اسلامی تہذیب کے فروغ میں ناکامی:

علی گڑھ یونیورسٹی نے ابھی تک کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کی بنا پر دنیا میں اس کا نام روشن ہوتا، یعنی اسلام کی خدمت، چونکہ یہ مسلم یونیورسٹی ہے، علوم اسلامی کی ترقی کسی رنگ میں تاریخ اسلام، فلسفہ اسلام، اسلامی ادب وغیرہ نہیں تو یہ انگریزی میں کیمیا یا فلسفہ پڑھانا، یہ تو ہندوستان کی باقی تمام یونیورسٹیاں بھی کرتی ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ اس یونیورسٹی میں مسلمانوں کی تعلیم کے لئے خاص سہولتیں میسر ہیں جو دوسری یونیورسٹیوں میں نہیں تو اس طریق کار سے یونیورسٹی نے اپنا حلقہ محدود کر کے ایک خاص جماعت کو تعلیم دی، مگر اسلام کی کون سی خدمت کی؟ یہ خدمت ضرور ہے کہ مسلمان تعلیم یافتہ ہو گئے اور اسلامی جماعت کو فروغ ہو گیا مگر

اس کے ساتھ یہ بھی چاہیے تھا کہ اسلام، اسلامی تعلیم اور اسلامی تہذیب کو فروغ ہوتا۔

(آزاد قوم کا نظامِ تعلیم اور پاکستان: ص ۱۳۷)

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری

تعلیم نسواں کے فروغ کا شدید مخالف:

یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ سرسید تعلیم نسواں کے مخالف تھے۔ جس شخص نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ اپنی قوم مین جدید تعلیم کو عام کرنے میں صرف کر دیا، اس کے متعلق جب ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس طرز پر خواتین کو تعلیم دلانے کے خلاف تھا تو حیرت اور استعجاب کے علاوہ اور کیا کیا جا سکتا ہے! عام طور پر تو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ایک خاتون کو تعلیم دینے سے پورے خاندان کی تعلیم کا بندوبست ہو جاتا ہے لیکن سرسید کے خیالات اس کے بالکل برعکس تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ مردوں کو تعلیم دینے سے عورتیں خود بخود تعلیم یافتہ ہو جائیں گی، اسی لئے انہوں نے ہر ایسے اقدام کی مخالفت کی جس کا مقصد عورتوں کی تعلیم کو فروغ دینا تھا۔ انہوں نے اپنے ان خیالات کا اظہار متعدد مواقع پر کیا ہے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں متعدد بار خواتین میں تعلیم کو عام کرنے کے سلسلہ میں تجاویز پیش کی گئیں مگر سرسید نے ان میں سے ہر ایک کی مخالفت کی...... صرف اتنا ہی نہیں بلکہ تعلیم نسواں کی مخالفت کے جوش میں وہ یہاں تک کہہ گئے کہ خواتین کو تعلیم دلانا ان کے ساتھ سخت ظلم کرنا ہے...... سرسید خواتین کے لئے اُسی قدیم طرز کی تعلیم کے حق میں تھے جس میں قرآن شریف پڑھا دیا جاتا تھا، دینی مسائل سے متعلق ابتدائی کتابوں کی تعلیم دے دی جاتی تھی اور ضرورت کے مطابق اردو و فارسی پڑھا دی جاتی تھی، اسی سے ان کی اخلاقی تربیت ہوتی تھی اور اسی کے ذریعہ وہ اپنے حقوق و فرائض پہچان جاتی تھیں۔ سرسید کے ان خیالات سے عام طور پر لوگ متفق نہیں تھے، خود اُن کے رفقا بھی اس مسئلہ پر اختلاف رکھتے تھے۔ ۱۸۹۶ء میں جسٹس کرامت حسین، نواب محسن الملک اور شمس العلما مولوی ممتاز علی وغیرہ کی کوششوں سے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں ایک ذیلی شعبہ بنام ' شعبہ تعلیمِ نسواں ' قائم ہوا۔ سرسید نے اس کے قیام کی سختی سے مخالفت کی تھی چنانچہ محسن

الملک، جو سرسید کے دست راست سمجھے جاتے تھے، انہوں نے بھی بارہا سرسید پر اس سلسلہ میں تنقید کی ہے۔

(مولانا آزاد، سرسید اور علی گڑھ: ص۴۴ تا ۴۸)

مشترکہ قومیت کے نظریہ کا اولین پیش کار:

سرسید نے جس وضاحت اور تفصیل سے مشترکہ قومیت کا تصور پیش کیا وہ اس وقت بالکل نئی بات معلوم ہوتی تھی۔ اور اگر یہ کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ سرسید پہلے ہندوستانی ہیں جنہوں نے اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کیا اور اسے ایک منظم اور مربوط نظریے کی شکل میں پیش کیا۔ (ایضاً: ص۵۲)

سرسید کے خیال میں قومیں وطن سے بنتی ہیں، اور یہی وہ نقطہ ہے جہاں ہر مذہب اور مسلک کے پیرو متحد ہوتے ہیں اور یہیں سے باہمی اشتراک و اتفاق کی فضا پیدا ہوتی ہے اور یہیں سے سیکولرازم کی جڑوں کو استحکام ملتا ہے۔ (ایضاً: ص۵۳)

سرسید نے اپنے مشترکہ تہذیب اور متحدہ قومیت کے نظریے کو اساسی طور پر تاریخی اور سماجی اصول پر استوار کیا اور استحکام بخشا۔ (ایضاً: ص۵۹)

غیر ضروری اجتہاد:

سرسید بڑی حد تک یہاں مات کھا گئے۔ مذہبی مباحث چھیڑنے سے ان کے مشن کو نقصان پہنچا۔ اُن کے بہت سے خیالات اور مذہبی معتقدات راسخ العقیدہ مسلمانوں کے خیالات سے میل نہیں کھاتے تھے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ بعض مذہبی امور میں انہوں نے غیر ضروری اجتہاد سے کام لیا۔ اس کی وجہ سے ان کی اور تہذیب الاخلاق دونوں کی مخالفت اور زیادہ شدید ہوگئی۔ (ایضاً: ص۳۴)

علی گڑھ کے نامور فرزندوں میں "شیرِ کشمیر" شیخ محمد عبداللہ کی خدمات:

اس میں کوئی شک نہیں کہ آزادی سے قبل اپنے وطن عزیز کو غلامی سے نجات دلانے اور آزادی کے بعد اس کی تعمیر جدید میں علی گڑھ کے فرزندوں نے ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں، ایسی خدمات جن پر نہ صرف مادرِ علمی کو بلکہ مادرِ وطن کو بھی بجا طور پر ناز ہوسکتا

ہے ایسے نامور فرزندوں کی فہرست بہت طویل ہے البتہ ان میں چند نام ایسے ہیں جن کے تذکرے کے بغیر جدید ہندوستان کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی ۔ ان میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، مولانا طفیل احمد منگلوری، رفیع احمد قدوائی، راجہ مہندر پرتاپ، میر اکبر علی خاں، ڈاکٹر ذاکر حسین، شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ، حافظ محمد ابراہیم، ڈاکٹر سید محمود، خان محمد عبدالغفار خاں، غلام محمد صادق جیسے حضرات تو آسمان سیاست کے اتنے روشن ستارے ہیں کہ ان کی روشنی کبھی مدھم نہیں پڑسکتی۔

(مقالات قومی سرسید سمنار،ص ۱۴۶)

علی گڑھ کے نامور فرزندوں میں ایک انتہائی اہم اور لائق صد احترام نام شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کا بھی ہے۔ اپنی قوم کے لئے شیخ صاحب کی قربانیاں ناقابل فراموش اور ملک کے لئے خدمات اتنی وسیع اور کثیر الجہات ہیں کہ یہاں ان سب کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ اگرچہ آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد بھی آپ کی سرگرمیوں کا محور ومرکز سرزمین کشمیر ہی رہی تاہم کشمیر اور باشندگان کشمیر کی جو خدمات آپ نے انجام دیں، ان کے اثرات بڑی حد تک پورے ملک کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی فضا پر مرتب ہوئے۔ آزادی کے بعد شیخ صاحب کی ہندوستان کے لئے سب سے بڑی خدمت اس سے کشمیر کا الحاق ہے۔ ۱۹۴۸ء میں اگر شیخ صاحب ہندوستان کے وزیراعظم اور وزیر داخلہ کو اس سلسلہ میں فوری طور پر مداخلت کرنے کے لئے مجبور نہ کرتے اور گاندھی جی کو اپنی دلیل سے قائل نہ کرتے کہ کشمیر کی جنگ محض ایک علاقہ پر قبضہ کرلینے کی جنگ نہیں ہے بلکہ اصلاً یہ ان آدرشوں کے تحفظ کی جنگ ہے جو گاندھی جی کو اپنی زندگی سے زیادہ عزیز ہیں تو کشمیر آج یقیناً ہندوستان کا حصہ نہ ہوتا۔ ہندوستان سے کشمیر کا الحاق بلاشبہ وقت کی اہم ترین ضرورت اور ہندوستان اور مسلمانانِ ہندوستان کی عظیم ترین خدمت ہے۔ (ایضاً:ص ۱۵۶)

ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی

مذہب اور سائنس میں سمجھوتہ کے خطرناک نتائج:

اس میں شک نہیں کہ ان کی انقلابی تحریک ہی سبب بنی نئی نسل کی ترقی اور تعلیم کے

محمد عبداللہ عمر پوری

تین آفات کا رد:

انگریزی دورِ حکومت اور امروہی طرزِ حکومت نے نیچریت کو جنم دیا جس کی تردید مفکرِ اسلام حضرت سید جمال الدین افغانی نے رسالہ "ردِ نیچریت" میں فرمائی اور اسی دورِ انقلاب کی دوسری مصیبت تحریفِ قرآن بصورت "تفسیر القرآن" کی تردید "تفسیر فتح المنان" معروف بہ "تفسیر حقانی" میں ہوئی۔ تیسری آفت جو کہ ان دونوں نوزائیدہ فتنوں کو پرورش دینے، پروان چڑھانے کے لئے سامنے لائی گئی، وہ رسالہ "تہذیب الاخلاق" کی اشاعت اور اس پوری جماعت جدید اسلام کا قلمی جہاد ہے جس کے جواب میں دیوبند سے رسالہ "تصفیۃ العقائد"، "قاسم العلوم" اور لکھنؤ سے "نور الآفاق" وغیرہ کا سلسلہ جاری ہوا۔

(الرحیم حیدرآباد، اگست ۱۹۶۳ء، ص ۱۷)

محمد عبدالہادی صدیقی

ہر بات پر مذہب کا فتویٰ لینے کا مخالف:

سرسید احمد خاں احیاءِ دین کے خلاف نہیں تھے — وہ دراصل اس بات کے خلاف تھے کہ ہر بات پر مذہب کا فتویٰ لیا جائے اور دین کی تعبیر اس طرح کی جائے کہ وہ انسان کے لئے وبالِ جان بن جائے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ دین کی اخلاقی قدروں سے آدمی کی زندگی آراستہ ہونی چاہیے مگر مذہب کسی طور پر بھی اس کی مادی ترقی و بہبود میں حائل نہیں ہونا چاہیے، اور اسلام کی تعلیمات ایسی عام ہونی چاہئیں کہ ہر شخص ان کو جانے اور سمجھے اور انہی کی اجتماعی سمجھ بوجھ سے اسلامی تمدن پیدا ہو۔ اہلِ مذہب کی کوئی خاص جماعت نہ ہو اور نہ ان کے خاص حقوق در سوخ ہوں۔

(تاریخ تحریکِ پاکستان، ص ۱۲۵–۱۲۶)

آج بھی ہماری زندگی کا سرمایہ ہے، اے کاش کہ اتنا بھی نہ ہوتا جتنا تھایا ہے، لیکن حالات اور وقت کے لحاظ سے اس وقت ایسا ممکن نہیں تھا اس لئے ایسا ہوا۔ یہ ایک غلطی تھی جس کا اعتراف نہ غلطی کو قبیح بناتا ہے اور نہ حسین، لیکن اگر اعتراف کے باوجود اسی غلطی کا اعادہ کیا جائے تو اعتراف گناہ تحسین گناہ بن جاتا ہے جو گناہ سے کہیں زیادہ بدتر ہوتا ہے۔ سرسید کے بارے میں یہ صحیح ہے کہ وہ اس بات کو شدت سے محسوس کرتے تھے کہ "میرا جو مقصد سید محمود کی تعلیم کا تھا، وہ حاصل نہیں ہوا" مگر انہوں نے سید محمود کو سرکاری ملازمت سے نہ روکا بلکہ ان کی تعلیم و تربیت کو ایک معیار قرار دے کر کالج میں بھی اسی مزاج کے لوگوں کے پیدا کرنے کا اہتمام کیا۔ سرسید کے اس طریق فکر اور طریق کار میں جو تضاد ہے، اس پر ان کا محاسبہ درست ہے۔ بھول چوک ان سے بھی ہوئی، اور یہ بھول ایک بڑی بھول تھی جس کی وجہ سے خود ان کی زندگی میں بعض قباحتیں بھی پیدا ہوئیں۔ اچھا ہوتا کہ ملازمتیں صرف حصول مقصد کا وسیلہ ہوتیں، خود مقصد بالذات نہ بن جاتیں..... بہرصورت یہ غلطی تھی جسے غلطی کے طور پر تسلیم کرلینا صحیح ہے، اس لئے کہ علوم جدیدہ کی دوسری جہتوں اور ان کی وسعتوں کی طرف بہت کم توجہ دی گئی اور اگر دی گئی تو ان علوم میں اتنا اختصاص نہ پیدا کیا جاسکا جو مسلمانوں کو مسابقتی دوڑ میں ہندوؤں سے آگے نہ لے جاسکتی تو کم از کم یہ دوڑ برابر پر تو ختم ہوتی۔ (ایضاً: ص ۱۳۷۔۱۳۸)

ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ

تعلیمِ نسواں اور سرسید:

۱۸۹۶ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے میں ..... مولوی جسٹس کرامت حسین مرحوم اور نواب محسن الملک مرحوم کی تجویز اور کوشش سے ایک شعبہ بنام "شعبہ تعلیمِ نسواں" قائم ہوا تھا۔ مولوی ممتاز علی صاحب مرحوم سب سے اول اس شعبے کی آنریری سیکرٹری مقرر ہوئے تھے۔ تعلیم نسوں کے سلسلے میں سرسید کی رائے ہمیشہ مولوی ممتاز علی صاحب کی رائے کے مخالف رہی۔ شعبہ تعلیمِ نسوں بھی سرسید کی رائے کے خلاف قائم ہوا تھا۔ سرسید عورتوں کی تعلیم کے معاملے میں بہت ہی پرانے خیال کے بزرگ تھے۔

(تہذیب نسواں لاہور، ۶ جولائی ۱۹۳۵ء: ص ۶۲۸)

محمد عبداللہ عمر پوری

تین آفات کا ردّ:

انگریزی دورِ حکومت اور امروہی طرزِ حکومت نے نیچریت کو جنم دیا جس کی تردید مفکر اسلام حضرت سید جمال الدین افغانی نے رسالہ ''ردّ نیچریت'' میں فرمائی اور اس دورِ انقلاب کی دوسری مصیبت تحریفِ قرآن، بصورت ''تفسیر القرآن'' کی تردید ''تفسیر فتح المنان'' معروف بہ ''تفسیرِ حقانی'' میں ہوئی۔ تیسری آفت جو کہ ان دونوں نوزائیدہ فتنوں کو پرورش دینے، پروان چڑھانے کے لئے سامنے لائی گئی، وہ رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کی اشاعت اور اس پوری جماعت جدید اسلام کا قلمی جہاد ہے جس کے جواب میں دیوبند سے رسالہ ''تصفیۃ العقائد''، ''قاسم العلوم'' اور لکھنؤ سے ''نورالآفاق'' وغیرہ کا سلسلہ جاری ہوا۔

(الرحیم حیدرآباد، اگست ۱۹۶۳ء، ص ۴۷)

محمد عبدالہادی صدیقی

ہر بات پر مذہب کا فتویٰ لینے کا مخالف:

سرسید احمد خاں احیاء دین کے خلاف نہیں تھے -- وہ دراصل اس بات کے خلاف تھے کہ ہر بات پر مذہب کا فتویٰ لیا جائے اور دین کی تعبیر اس طرح کی جائے کہ وہ انسان کے لئے وبالِ جان بن جائے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ دین کی اخلاقی قدروں سے آدمی کی زندگی آراستہ ہونی چاہیے مگر مذہب کسی طور پر بھی اس کی مادی ترقی و بہبود میں حائل نہیں ہونا چاہیے، اور اسلام کی تعلیمات ایسی عام ہونی چاہییں کہ ہر شخص ان کو جانے اور سمجھے اور انہی کی اجتماعی سمجھ بوجھ سے اسلامی تمدن پیدا ہو، اہلِ مذہب کی کوئی خاص جماعت نہ ہو اور نہ ان کے خاص حقوق و رسوخ ہوں۔

(تاریخ تحریکِ پاکستان: ص ۱۶۵-۱۶۶)

محمد عثمان مقبول

علومِ جدیدہ کی مطابقت میں تفسیری لغزشیں:

سرسید کی تصانیف میں سب سے زیادہ اہم تفسیر القرآن ہے، اور یہی وہ تصنیف ہے جس نے سرسید کے مذہبی پہلو کو اس قدر تاریک کر دیا ہے کہ بلا استثنا تمام علمائے اسلام ان کی طرف سے بدظن اور بدگمان ہیں۔ اگرچہ سرسید کا ارادہ نیک اور نیت بالکل پاک تھی اور اس کام کو جس دماغ سوزی اور سخت جانکاہی اور کاوش سے انجام دیا ہے اس کا وہی اندازہ کر سکتا ہے جس نے اس کو پڑھا اور اس پر غور کیا ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ سرسید کی تفسیر کے بعض مقامات ایسے اعلیٰ مضامین اور حقائق و معارف سے بھرے ہیں کہ اگر اُن کو مذہب کی جان کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں، مگر جہاں کہیں قرآن مجید کے مفہوم کو اپنی رائے میں علوم جدیدہ کے مطابق کرنا چاہا ہے وہاں بڑے دھوکے کھائے ہیں اور اس تلاش میں خدا کی عظمت اور اس کے کلام کی حکمت و مصلحت کو دل سے محو کر دیا ہے ..... اگر یہ کہا جائے کہ سرسید کا فلسفۂ مذہب حقیقتاً علوم جدیدہ کے مسائل اور نظریات پر مبنی ہے تاہم پھر بھی نظریات اور حکما کی رائیں ایک دوسرے سے مختلف رہی ہیں اور ہوتی رہتی ہیں اور ان تغیرات کا سلسلہ لامتناہی اسی طرح جاری رہنے والا ہے۔ ایسی حالت میں غالباً کوئی مسلمان اس کو پسند نہ کرے گا کہ قرآن مجید، جو ایک مستقل فلسفہ ہے، ہمارے ہاتھ میں ایک کھلونے کی طرح ہمیشہ نئے نئے نظریات کی خاطر وقتاً فوقتاً نئی نئی شکلوں میں تبدیل ہوتا رہے۔

(مکاتب الخلان: ص ۷، بحوالہ سرسید تحریک کا ردعمل ص ۶۸۔۶۹)

محمد عطاء اللہ حنیف

برصغیر میں فتنوں کا سرچشمہ:

حدیثِ پاک کے خلاف پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات کے فتنے کا سرچشمہ عیسائی مشنریاں اور ان کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی کے بانی جناب سرسید احمد خاں اور ان کی پارٹی

ے لوگ تھے جو ''قومی اصلاح و اسلامی عقائد و ثقافت کی تطہیر'' کے بہانے یہ ''فرض'' سرانجام دے رہے تھے۔ اس زمانے میں چونکہ جناب سرسید احمد خاں صاحب قرآن و حدیث کو نیچر (قانونِ قدرت یا فطرت) کی عینک سے دیکھتے تھے، اس لئے ان کا اور ان کے ہم نواؤں کا تعارف علمی و دینی حلقوں میں ''نیچری'' کے لقب سے ہوتا تھا۔ گویا یہ لفظ سرسید کے مکتب فکر کا عنوان ہے۔ اسلام کے جو عقائد و احکام، حدیث کا دلیلِ شرعی ہونا، نماز، قربانی وغیرہ فرقہ منکرینِ حدیث کی ''تحقیقاتِ نادرہ'' کا تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں۔ ان میں رمضان المبارک کے روزے بھی ہیں جن کی فرضیت ساقط کرنے کے لئے یہ لوگ ایک مدت سے لٹریچر پھیلا رہے ہیں مگر بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ مسئلہ بھی اس فرقہ کو اپنے آباؤ اجداد جناب سرسید احمد خاں علی گڑھی اور ان کی پارٹی سے ورثے میں ملا ہے۔

ہمارے اس برصغیر میں فتنوں کا سرچشمہ بڑی حد تک سید احمد خاں علی گڑھی ہیں، چنانچہ اس کا شجرۂ نسب بھی یہی ہے کہ سید احمد خاں نے انگریز کی تربیت میں اس کا بیج بویا، جسے چکڑالے کے عبداللہ نامی ایک شخص نے اپنی نفسانی شہوات سے سینچا.....

علی گڑھ یونیورسٹی کے بانی جناب سرسید احمد خاں صاحب کے آخری دور کے اکثر خیالات مغربی مفکرین سے درآمدہ کردہ تھے۔ سب سے زیادہ اسلام سے متصادم نظریہ ان کا یہ تھا کہ رسالتِ محمدیہ کا اقرار اور احکامِ شریعت کا ماننا مسلمان ہونے کے لئے ضروری اور نجاتِ اُخروی کے لئے شرط نہیں۔ یہ نظریہ بظاہر معصوم سا ہے مگر بڑے دوررس نتائج کا حامل ہے۔

سرسید احمد بانی علی گڑھ یونیورسٹی نے یورپ کی سیاست، تمدن، معاشرت اور مزعومہ علمی ترقیوں سے مرعوب ہو کر جو تحریک مسلمانوں کو ''یورپیانے'' کی شروع کی تھی اس کا اثر غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں پر مفید ہوا یا غیر مفید، وہ تو خیر الگ بات ہے لیکن اس کے مضر پہلوؤں سے ایک بڑا مضر پہلو یہ ہے کہ اس نے اسلام کے اجماعی اور بنیادی عقائد کا انکار کر کے دو ایسے مستقل فتنوں کا دروازہ کھول دیا جو دن بدن خطرناک صورت اختیار کر رہے ہیں یعنی مرزائیت اور چکڑالویت...... اسلام کا اجماعی اور بنیادی عقیدہ ہے کہ نبوت ایک موہبتِ الٰہی ہے، کسب و اکتساب سے اس نعمت کا کوئی تعلق نہیں ہے، اس کے خلاف سرسید نے نبوت کو

"اکتسابی" قرار دیا۔ چنانچہ یہی جرثومہ پروان چڑھ کر مرزائیت کی شکل میں نمودار ہوا۔ سرسید نے مرزائیت کو تبلیغ کے لئے ایک سیڑھی بھی دے دی اور وہ تھا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آمد مہدی کا مسئلہ۔ اہل سنت وحدیث کے اس بنیادی اور اجماعی عقیدہ کے علی الرغم کہ حضرت مسیح علیہ السلام حیات ہیں اور قربِ قیامت ان کا نزول ہوگا، حضرت مہدی کے تشریف لانے وغیرہ کا سرسید نے انکار کیا۔ مرزائیت نے اپنے کفر کی اشاعت کے لئے ان مسائل کو بطور زینے کے استعمال کیا۔

معتزلہ کی طرح سرسید کا فتنہ بھی ایک علمی فتنہ تھا۔ ان کے دماغوں پر عقل کا غلبہ تھا یعنی وہ لوگ "نیچر" کی آڑ میں معجزات، حشر ونشر، برزخ وغیرہ مسائل میں نہ صرف بعض احادیث کا انکار کر جاتے تھے بلکہ قرآنِ حکیم کی ان آیات میں مرمت کرنے سے بھی نہ چوکتے تھے جو ان کو اپنی مزعومہ "نیچر" کے خلاف نظر آتی تھیں جس کی بنا پر علمائے حق اس فتنے کو "نیچریت" سے تعبیر کرتے تھے۔

(بحوالہ "الاعتصام لاہور، مارچ ۲۰۰۵ء" ص۲۰۲تا۲۱۰)

محمد عطاء اللہ صدیقی

انگریزوں کی کاسہ لیسی اور اطاعت کی تبلیغ:

آج سرسید احمد خاں کا نام بھی اقبال اور جناح کے پیش روؤں میں لیا جاتا ہے۔ ان کو "محسن ملت" بھی قرار دیا جاتا ہے مگر ان "بزرگ" کو ملتِ اسلامیہ کے کس قدر "محسن" تھے اس کا مرقع آج کی نوجوان نسل کے سامنے کم ہی پیش کیا جاتا ہے۔ موصوف سلطنت عثمانیہ کے مقابلے میں ہمیشہ انگریزوں کی کاسہ لیسی اور اطاعت کی تبلیغ فرماتے رہے۔ یہاں مناسب ہوگا کہ اس معاملے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک تحریر سے اقتباس پیش کیا جائے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں:

"تہذیب الاخلاق کی اشاعت اول میں سید مرحوم نے ایک مضمون "شیخ الاسلام" کے عہدے اور اختیارات کی نسبت لکھا تھا، اس میں لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ مذہبا فرض ہے کہ اپنے بادشاہ کے ہمیشہ تابع رہیں، گو وہ ترکوں کے ساتھ کیسی ہی ہمدردی رکھتے ہوں اور گو ترکی میں اور خود قسطنطنیہ میں کچھ ہی ہوا کرے''۔

''۱۸۹۸ء میں جب ترکی نے یونان پر فتح پائی تو بمبئی کے مسلمانوں نے، کہ مسلمان تھے اس لئے مسلمانوں کی فتح اور کفار کی ہزیمت سے خوش ہوتے تھے، سلطان المعظم (عثمانی خلیفہ) کی خدمت میں مبارکباد کا ایک تار بھیجا۔ اس پر سید صاحب کو اس قدر غصہ آیا کہ انہوں نے ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' میں ایک مضمون لکھا جس میں اس حرکت کو ''خفیف الحرکتی'' سے تعبیر کیا تھا۔ نیز لکھا تھا کہ ہم کو صرف اپنی گورنمنٹ سے سروکار رکھنا چاہیے اور جو کچھ کرنا چاہیے اس کی رضا اور حکم سے ہو۔ یہ بھی لکھا کہ بمبئی کے مسلمانوں کو ہرگز نہیں چاہیے تھا کہ تاج برطانیہ کے محکوم ہو کر ترکی کو مبارکباد دیں''۔ (ہفت روزہ الہلال، جلد اول، ۲۶ نومبر ۱۹۱۲ء)

(الہلال، جلد اول، ۲۶ نومبر ۱۹۱۲ء، بحوالہ نقیب ختم نبوت ملتان، جون ۲۰۰۲ء، ص ۳۱)

محمد علی جوہر

مذہبی معلومات سے کوسوں دور فاضلین:

علی گڑھ نے بہت سی چیزوں میں مشرق اور مغرب کی ایک حسین امتزاج پیدا کیا اور مغربی سائنس اور لٹریچر میں ترقی کے باوجود اس نے اپنا جداگانہ تفخر برقرار رکھا جو اس کے فاضلین کے حق میں ایک مؤثر محرک کے طور پر کارگر ہوتا تھا، مگر اس بات کو تسلیم کیا جانا چاہے کہ اس نے انہیں ان کے اعتقادی علم کے معاملے میں قیمتی ساز و سامان سے آراستہ نہیں کیا۔ وہ کافی ترقی پسند تھے، مسلمان ہونا ان کے لئے وجۂ افتخار تھا مگر افسوس کہ وہ مذہبی معلومات سے کوسوں دور تھے ... (مذہبی) درسی کتب میں زیادہ تر رسمی طور پر طہارت اور نمازوں کے مسائل کا ذکر ہوتا تھا، یا پھر بڑی جماعتوں کے طلبہ کے لئے اسلام کے چند اہم مسائل متعلقہ شادی، جہیز اور طلاق شامل ہوتے تھے۔ قرآن حکیم ہمارے لئے عملی طور پر ایک بند کتاب رہا اور سنتِ

رسول ﷺ ایک نام سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی۔ کالج کی چند جماعتیں صرف ایک محدود وقت کے لئے حضور اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ کے متعلق ایک ابتدائی قاعدہ پڑھتی تھیں جس کے صفحات بیس سے زائد نہیں تھے ہفتے میں ایک بار مسلم نوجوانوں کو اس گھنٹے میں ان کے مذہب کی تعلیم دی جاتی تھی جو دوسرے دنوں میں ثانوی زبان کی تعلیم کے لئے مخصوص تھا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ دینیات کا گھنٹہ تفریح کے گھنٹے سے بھی زیادہ لطف اندوز ہوتا تھا ہمارا قومی داری شعور مذہبی سے کہیں زیادہ سیکولر تھا اور اگرچہ ہم اسلام کو انسانیت کے لئے قطعی پیغام سمجھتے تھے اور اس پر سچا یقین رکھتے تھے اور بڑی جاں فشانی کے علاوہ نہایت فراست کے ساتھ اس کے اعلیٰ اصولوں کی برتری کے متعلق کافی بحث و مباحثہ کر سکتے تھے مگر اس کی تعلیمات کی تفصیلات اور اس کی ہمہ گیر اور صدیوں پرانی تاریخ سے شرم ناک حد تک بے بہرہ تھے۔

(مائی لائف، اے فریگمنٹ: ص ۲۲ تا ۲۴)

سر سید مرحوم کے اس التزام کا ایک نتیجہ تو بہت اچھا ہوا، یعنی والدین اپنے بچوں کو بجائے ان مدارس حکومت کے جہاں دینی تعلیم مطلق نہ ہوتی تھی یا عیسائی مشنیوں کی درس گاہوں کے جن میں بائبل کی تعلیم لازمی تھی، مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ میں بھیجنے لگے مگر افسوس کہ جو تعلیم دینیات ان بچوں کو وہاں دی جاتی تھی، وہ محض ناکافی تھی۔ فقہ میں عبادات کے چند ابتدائی مسائل کے سوا ہمیں وہاں کچھ نہ پڑھایا گیا۔ خدا بھلا کرے مولانا شبلی مرحوم کا کہ کچھ عرصہ تک کالج کی جماعتوں کو ابتدائی نصف گھنٹہ میں کچھ ترجمۃ القرآن سنا دیا جاتا تھا اور ایک مختصر رسالہ سیرت رسول ﷺ اور اسلام کی ابتدائی تاریخ کے متعلق کالج کی جماعتوں کے درس میں داخل تھا ورنہ نہ ہمیں مطالب قرآن سے کوئی واسطہ تھا، نہ حدیث نبوی سے اور نہ عقائد کے متعلق ہمیں کوئی تعلیم دی جاتی تھی۔ حقیقتاً اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹرسٹیان علی گڑھ نے کالج کا سارا کام اکیلے سر سید احمد خاں پر چھوڑ دیا تھا اور جب تعلیم دینی کے انتظام و اہتمام سے وہ مصلحت اندیشی کی بنا پر الگ رہے تو شعبہ دینیات ایسے لوگوں کے ہاتھ میں جا پڑا جن کی غفلت شعاری نے ہمارا کام تمام کر دیا۔

(اوراق گم گشتہ: ص ۵۹۱)

محمد علی صدیقی

اہلِ قرآن فرقہ کا بانی:

سرسید احمد خاں برصغیر کے پہلے بڑے مذہبی مفکر ہیں جنہوں نے اہلِ قرآن فرقہ کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے احادیث اور تفاسیر کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی بلکہ اس کے بارے میں ایک بات جو حتمی طور پر کہی جا سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ اسلامی احکام کے بارے میں قرآن ہی کو حکم مانتے تھے۔

(سرسید احمد خاں اور جدت پسندی: ص ۹۴)

مخالفت کا ایک بڑا سبب، سود کی حمایت:

سرسید احمد خاں کے حمایتی اور ان کے مخالفین تک جس پہلو پر بات کرتے ہوئے کتراتے ہیں، وہ سودی معیشت کے بارے میں سرسید احمد خاں کا نظریہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ سرسید کی مخالفت کا ایک بڑا سبب سود کی حمایت بھی تھی۔...... سرسید احمد خاں کی معاشی فکر میں مسلمان اُمرا کو واضح تلقین کی گئی تھی کہ وہ سود کا لین دین شروع کر دیں تاکہ وہ اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کی طرح کارخانوں اور بنکوں اور تجارتی کمپنیوں کے مالک بن سکیں اور سمندری جہازرانی کی کمپنیاں قائم کریں۔ اُس دور میں متعدد مسلمان اُمرا کی جائدادیں اسراف بے جا کی لایعنی روش میں گروی تھیں اور اگر وہ اپنی جائدادوں کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقوم کی منفعت بخش سرمایہ کاری کرتے تو صورتِ حال یکسر مختلف ہو سکتی تھی۔ (ایضاً: ص ٦٧)

پروفیسر محمد عمر الدین

مغربیت کے ابتدائی دور کی فکر:

سرسید کے تفصیلی مطالعے سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا معیارِ فطرت و عقل معاشرتی احکام اور دنیاوی معاملات میں تو ٹھیک کام دے جاتا ہے لیکن جب وہ فلسفہ الٰہیات

کے مسائل (مثلاً خدا کی ہستی، روح کا وجود، حیات بعدالموت کا لزوم وغیرہ) پر بحث کرتے ہیں تو ان کا استدلال منطقی کاملیت کے درجے کو نہیں پہنچتا۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ سرسید کا ذہنی رشتہ مغربی تجربیت کے ابتدائی دور سے وابستہ ہے جب تجربیت اپنی کمزوریوں سے آگاہ نہیں ہوئی تھی اور سائنس غرور پرستی کا شکار تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مابعدالطبیعاتی حقائق (مثلاً خدا، روح وغیرہ) کو اکثر تجرباتی اور عقلی استدلال کے ذریعے سے ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ کہیں کہیں وہ اپنے مذاقِ سلیم کی روشنی میں عقلیت اور تجربیت کے نازشِ بے جا کے استیلا سے نکلنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً خدا کی حقیقت، اس کی صفات کی ماہیت، روح کی حقیقت بلکہ ہر چیز کی حقیقت کے علم کو وہ عقل کی رسائی سے باہر سمجھتے ہیں۔ پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عقل اور فطرت، جن کو انہوں نے رہنما بنایا ہے، ان کی حدود اور رسائی کے بارے میں انہوں نے پوری فلسفیانہ ذمہ داریوں کے ساتھ نہیں سوچا ہے اور علم کی نوعیت اور حقیقت کے بارے میں کوئی مدلل اور مفصل نظریہ ان کے سامنے نہیں ہے۔ ہیوم اور کانٹ کی طرح انہوں نے ان راہوں کی خاک نہیں چھانی ہے بلکہ ذوقی اور وجدانی طور پر وہ اس راہ پر گامزن ہو گئے ہیں۔ اب جب کہ فزکس اور بیالوجی وغیرہ کی ترقیوں نے نئے نئے حقائق سے انسان کو دوچار کیا ہے اور بڑی حد تک عقلیت اور تجربیت کا غرور بے جا ٹوٹ چکا ہے، ایسی صورت میں ان نئے حقائق کی روشنی میں ہمیں اسلامی مسائل پر نظر ڈالنا ہوگی۔

(سرسید احمد خاں کا نیا مذہبی طرزِ فکر: ص ۷۷)

مفتی محمد عمرالدین

انگریزی زبان کی تعلیم کا جواز اور حرمت:

انگریزی تھوڑی بقدرِ ضرورت، بشرطیکہ اول عقائد ضروریہ مطابق مذہب اہل سنت کے خوب ضبط و حفظ ہوں، بہ نیت مباح پڑھنا پڑھانا جائز ہے...... اور اگر نصاریٰ کی خوشامد اور ان سے ہم پیالہ و ہم نوالہ ہونے کے مطلب سے اور ان سے تقرب و نزدیکی حاصل کرنے کی غرض سے کوئی پڑھے تو مکروہ و ناجائز ہے۔ انگریزی جس طرح علی گڑھ کالج میں پڑھی

اور پڑھائی جاتی ہے اور اسی کے روش وطریقہ پر دوسرے کالجوں میں پڑھائی جاتی ہے، ایسی پڑھائی قطعاً و یقیناً حرام ہے کہ غالباً ایسی پڑھائی اور پڑھنے کا مآل فسق وفجور ونیچریت وعیسائیت ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایسے کالجوں کی اعانت ومدد کرنا بھی قطعاً حرام ہے۔

(توضیح الاحکام ص ۷۔۸)

پروفیسر محمد عیسیٰ خاں

تعلیمی افکار میں جا بجا تضاد:

سر سید احمد خاں کے تعلیمی افکار میں ہمیں جا بجا تضاد نظر آتا ہے۔ وہ یوری تہذیب و ثقافت سے متاثر ہو کر مغربی تعلیم کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اقوام مغرب کی ترقی کا سبب اُن کی ترقی یافتہ تعلیم ہے، لیکن اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہے کہ تعلیمی نظام برطانیہ کو ترقی یافتہ شکل میں نہیں بلکہ فطری طور پر نشوونما کے عمل سے گزر کر حاصل ہوا ہے، اس لئے ہمیں اپنے نظام تعلیم کو مغربی نظام تعلیم کی ترقی یافتہ شکل کی روشنی میں نئے سرے سے استوار کرنا چاہیے۔ وہ ایک طرف مغربی تعلیم کو ضروری سمجھتے ہیں اور دوسری طرف نئی نسل کے اسلامی کردار کی بھی حفاظت کرنا چاہتے ہیں۔ خواتین کی تعلیم کے سلسلے میں ہم نے دیکھا کہ اُن کے لئے آپ کا معیار بالکل بدل جاتا ہے۔ جہاں لڑکوں کے لئے جدید تعلیمی ادارے قائم کرنے کے حق میں ہیں، وہاں لڑکیوں کے لئے سرے سے باقاعدہ اداروں کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ لڑکوں میں روشن خیالی پسند کرتے ہیں لیکن لڑکیوں کے لئے قدامت پسندی۔

(تعلیمی فلسفہ اور تاریخ ص ۱۶۵۔۱۶۶)

علی گڑھ کالج کی غیر تسلی بخش پیداوار:

افراد علی گڑھ میں مولانا محمد علی جوہر اور اس درجے کی اعلیٰ اسلامی ذہن بھی پیدا ہوئے لیکن تجزیہ کیا جائے تو یہ ان بزرگوں کے خاندانی اثرات کی وجہ سے ہوا ورنہ علی گڑھ کی عام کھیپ کوئی قابلِ فخر نہیں ...... کم وبیش تمام اہل علم حضرات علی گڑھ کی پیداوار سے نالاں تھے۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ سر سید احمد خاں کے افکار میں کوئی بنیادی خرابی تھی جس کی وجہ سے اس

کی عملی صورت بھی تسلی بخش نہ ہو سکی۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ علی گڑھ کی تعلیم نے وقتی طور پر مسلمان قوم کو ذلت اور پستی سے نکلنے کے لئے سہارا دیا لیکن اس کے اثرات صرف مادی نقطۂ نظر سے مفید رہے۔ نوجوان دین سے دور ہوتے گئے اور سرسید کے تعلیمی پروگرام کے دوررس اثرات خاص طور پر دینی نقطہ نظر سے اچھے نہ ہوئے۔ (ایضاً ص ۱۶۶)

محمد فاروق قریشی

مسلمانوں کو بالکل بے حس بنانے کا عمل:

سرسید احمد خاں کے اتحاد کے درس ایک خاص مقصد کے لئے ہوتے تھے تاکہ تمام اہل ہند مل کر برطانوی سرکار کی خدمت گزاری میں جت جائیں، عاجزی کے ساتھ اطاعت قبول کریں اور انکساری سے خدمت بجالائیں۔ جب غیر مسلموں پر اُن کا فسوں نہ چل سکا تو انہوں نے مسلمانوں کو انگریزوں کی اطاعت پر آمادہ کرنا چاہا۔ اب ان کی خواہش تھی کہ اگر تمام ہندوستانی نہیں تو کم از کم مسلمان ضرور انگریزوں کے کاسہ لیس بن جائیں اور اس مقصد کے لئے انہوں نے اسلام کا سہارا لیا اور انگریزوں کی اطاعت بروئے اسلام لازم قرار دے دی......

سرسید نے مسلمانوں کو بالکل بے حس بنا دیا تھا۔ وہ احتجاج یا مطالبہ کے شعور سے بالکل عاری ہو چکے تھے، انہوں نے انگریزوں کے رحم وکرم پر زندگی بسر کرنے پر قناعت کر لی۔ یہ انگریزوں کی بہت بڑی خدمت تھی جو سرسید احمد خاں نے انجام دی......

سرسید احمد خاں کی کارکردگی اور سرگرمیوں کے جو اثرات مسلمانوں پر مرتب ہوئے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سرسید کی تعلیمات نے مسلمانوں کو کس قدر نقصان پہنچایا۔ ان کی انگریز نواز پالیسیوں کے سبب مسلمان قعرِ ذلت میں گر چکے تھے۔ اگر کسی نے ان کی حالت بدلنے، باعزت مقام دلانے، خوددار اور باوقار بنانے کی کوشش کی تو ان کوششوں کو سبوتاژ کیا گیا اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے میدان میں اُتر آئے تاکہ مسلمانوں میں حقوق کی بازیابی کا شعور پیدا نہ ہو جائے۔ اور سرسید کا یہ طرزِ عمل انتہائی مہلک تھا جس سے مسلمان راہ کا سنگ گراں بن چکے تھے، اور گورنمنٹ کو جب ان کے وجود سے استفادہ کی ضرورت ہوتی تو با

بھی استعمال ہوتے تھے۔

(جنگ لاہور، ۵ر اپریل ۱۹۸۲ء، ص ۳)

جاں نثاران حریت کو گالیاں دینے کی دیرینہ رسم:

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء کا معرکہ آزادی کی جنگ تھی، اسے بغاوت ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جو لوگ اسے بغاوت سے تعبیر کرتے ہیں اور اس عنوان سے معروضات تیار کرتے رہے، ان کا شمار قومی مشاہیر میں نہیں ہو سکتا۔ اس حقیقت سے ہر کوئی آگاہ ہے کہ وطن کے باغیرت فرزندوں نے جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہو کر آزادی کی جنگ بے جگری سے لڑی اور آزادی کی حفاظت کے لئے محبانِ وطن جوق در جوق دہلی پہنچے۔ جب اپنوں کی بے وفائی کے نتیجہ میں انگریز فتح یاب ہوئے تو انہوں نے جنگ آزادی کو ''بغاوت'' کا نام دیا۔ ان کی خوشامد اور چاپلوسی کے لئے ہوا خواہانِ تاجِ برطانیہ بھی اسے بغاوت کے نام سے پکارنے لگے۔ ولائتی صاحب بہادروں نے اسے بغاوت کہا تو ان کے ہندوستانی فرزند اُن سے بھی آگے نکل گئے اور مجاہدین کو سرکش، غدار، مفسد، گمراہ اور حرامزادہ تک کہہ ڈالا اور اس طرح بادشاہ سے زیادہ بادشاہ کے طرف دار بن گئے۔ اگر جاں نثارانِ حریت حرامزادے تھے تو پھر حلال زادوں کی تعریف بھی ہونی چاہیے، ان کے چہروں سے نقاب اٹھنی چاہیے تاکہ قوم ان سے روشناس ہو۔ کیا برطانوی سرکار سے ''سر'' اور ''خان بہادر'' کے خطابات، اعزازات، جاگیریں اور دیگر مراعات حاصل کرنے والوں کو حلال زادوں میں شمار کیا جائے؟ اس صورت میں تو قومیں آزادی کی جنگ لڑنے پر غلامی کا طوق اپنے گلے میں سجانے کو ترجیح دیں گی۔

(ولی خاں اور قرارداد پاکستان ص ۳۳۷۔۳۳۸)

سید احمد نے مجاہدین جنگ آزادی کے لئے جو متبذل زبان استعمال کی ہے، کسی شریف شخص کو زیب نہیں دیتی ...... یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ انگریزی حکومت نے یہ خطاب کن لوگوں کو عطا کئے تھے، اپنے وفاداروں یا سرکشوں اور باغیوں کو؟ نیز یہ خطابات کس سلسلے میں ملتے تھے، انگریزوں سے وفاداری کے بدلے میں یا ان سے محاذ آرائی اور حصول آزادی کی جدوجہد کے معاوضہ میں؟ اس سلسلہ میں ابہام اور پردہ پوشی اب ختم ہو جانی

چاہیے۔ اس موضوع کے ساتھ اب تک جو کھیل کھیلا جاتا رہا، مزید دیر جاری نہیں رہ سکے گا۔ نئی نسل حقیقت حال جاننے کے لئے بے قرار ہے۔

(زندگی لاہور، ۸ تا ۱۴ جولائی ۱۹۹۴ء ص ۴۶)

حریت پسندوں کو گالی دینا دیرینہ رسم ہے۔ سرسید احمد خاں نے علمائے سو کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اسلام میں تحریف کی اور جنگ آزادی کو جہاد ماننے سے منکر ہیں حالانکہ اس عہد کے علمائے حق پرست نے دہلی کی جامع مسجد میں جمع ہو کر اسے جہاد قرار دیا تھا لیکن سرسید احمد خاں اسے مذہب کے خلاف قرار دیتے ہیں مجاہدین کے جذبہ حریت کو غیر مسلم مؤرخوں نے بھی زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے لیکن حیرانی کی بات ہے کہ سرسید احمد خاں جیسے عالم و فاضل، جو دین کے علم پر بھی گہری نظر رکھتے تھے، مصلحت کوشی کا شکار نظر آتے ہیں۔ سرسید احمد خاں کا کردار نہایت مایوس کن اور دل شکن ہے۔ وہ یہاں بھی یہ ثابت کرنے کے لئے بے قرار ہیں کہ یہ چند خود غرضوں کا ہنگامہ تھا جس کا اسلام میں کوئی جواز نہیں، اس میں حصہ لینے والے مجاہد نہ تھے بلکہ لٹیرے اور ڈاکو تھے جنہوں نے ذاتی منفعت اور طمع کی خاطر گڑبڑ کی حالانکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلمان اپنی، اپنی ہمسایہ قوموں کی آزادی اور اپنے ملک کی حفاظت و دفاع کی خاطر اسلام کی مرضی و منشا اور حکم کے مطابق برسر پیکار تھے۔ جنہوں نے اس معرکۂ حق و باطل میں غیر ملکیوں کا ساتھ دیا، مسلمانوں کی صدیوں سے قائم حکومت کے خلاف نبرد آزما ہوئے، اسے مغلوب بنایا، مسلمانوں کو آزادی کی نعمت سے محروم کیا، غلامی کی زنجیریں پہنائیں، انہوں نے اسلام اور وطن دونوں سے بے وفائی کی۔

(ولی خاں اور قرارداد پاکستان: ص ۳۳۸۔۳۳۹)

محمد قمر الدین قاسمی

تفسیر میں فکری لغزشیں:

اس میں دو رائے نہیں کہ قرآن کی تفسیر میں سرسید سے بعض فکری لغزشیں سرزد ہوئی ہیں جو اُن کی حد سے بڑھی ہوئی عقلیت کا نتیجہ ہے۔ عقلیت (Rationalism) انیسویں

صدی کے وسط میں اپنے نقطۂ عروج پر تھی اور ساری مغربی دنیا اس کے نشہ میں مخمور تھی۔ اہل علم بڑی سے بڑی بات کو بھی عقل کی میزان میں تولے بغیر تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اس عقلیت کا اثر سرسید کے ذہن پر بھی تھا اور اسی لئے ان کی تفسیر میں اعتزال کا رنگ غالب ہے۔

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۹۸ء، ص ۵۸)

سید محمد متین ہاشمی

سرکاری مناصب کو کالج کا اہم ترین مقصد بنانے کا نتیجہ:

کالج قائم کرتے وقت سرسید نے دعویٰ کیا تھا: ''فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر''۔ وہ مغربی علوم کے ساتھ ساتھ ایمان کامل اور صحیح مذہبی تربیت کو بھی ضروری سمجھتے تھے لیکن اس مقصد میں ان کو کامیابی نہیں حاصل ہوئی اور علی گڑھ سے جو نسل تعلیم حاصل کر کے نکلی اس نے مذہبی میدان میں کوئی قابل قدر کارنامہ انجام نہیں دیا۔ سرکاری مناصب کو علی گڑھ کالج کا اہم ترین مقصد بنانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں ایک قسم کی مادیت پرستی اور شخصیت پسندی پیدا ہوگئی اور اہل کالج کا مطمح نظر محدود ہو کر رہ گیا۔

(تحریک جامعہ محمدی ص ۴۲۔۴۳)

علما کا سرسید سے مخالفت کا اصل سبب، معتزلہ عقائد:

سرسید نے جدید علم کلام کی بنیاد رکھی اور بجائے اس کے کہ اس کی مدد سے اسلام کے مسلمہ عقائد کو مستحکم کرتے انہوں نے قرآن وحدیث کو کھینچ تان کر جدید سائنس کے ہم آہنگ بنانا شروع کیا۔ تہذیب الاخلاق کے مضامین اور اپنی تفسیر میں انہوں نے معراج وشق صدر کو خواب کا ایک واقعہ بتلایا ہے۔ حساب کتاب، میزان، جنت، دوزخ کے متعلق تمام قرآنی ارشادات کو مجاز استعارہ اور تمثیل قرار دیا ہے۔ ابلیس اور ملائکہ سے کوئی خارجی وجود مراد نہیں لیا ہے۔ حضرت عیسیٰ کے متعلق کہا ہے کہ قرآن کی کسی آیت سے ثابت نہیں ہوتا کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے یا زندہ آسمان پر اٹھا لئے گئے، قرآن میں جن وانس کے الفاظ سے چھپے ہوئے

پہاڑی اور صحرائی لوگ مراد ہیں، نہ کہ وہ وہمی مخلوق جو دیو اور بھوت کے الفاظ سے مفہوم ہوتی ہے" (موج کوثر ص ۱۵۹)۔ مذکورہ بالا عقائد معتزلہ کے تھے لہٰذا اس کا لازمی نتیجہ وہی ہوا جو معتزلہ کے معاملے میں ہوا تھا یعنی علمائے ہند نے ان خیالات کی شدید مخالفت کی۔ چونکہ علماء یہ سمجھتے تھے کہ علی گڑھ کالج میں سرسید اپنے انہی خیالات کی تبلیغ کریں گے اس لئے انہوں نے سرسید کی مخالفت کی اگرچہ علی گڑھ کالج میں دینیات کی بھی تعلیم دی جاتی تھی لیکن اس کی حیثیت محض ضمنی تھی، بنیادی حیثیت علوم جدیدہ ہی کو حاصل تھی۔ میرا مقصد یہ ہے کہ علی گڑھ کالج میں کوئی طالب العلم دین سیکھنے کے لئے نہیں جاتا تھا، جاتا تھا تو دنیوی علوم حاصل کرنے۔ ہاں! راستہ کی پڑی ہوئی چیز کی طرح جبراً قہراً دینیات کے بھی چند اسباق پڑھ لیتا تھا جس سے نہ تو عقیدے میں پختگی پیدا ہوتی تھی اور نہ کردار میں۔ (ایضاً: ص ۴۷ تا ۵۱)

سید محمد میاں

بازاری الفاظ سے بھی گئے گزرے الفاظ کا استعمال:

وہ انگریز کی وفاداری میں یہاں تک بڑھے ہوئے تھے کہ اس کی حمایت میں اپنے ملک اور اپنی ملت کے کسی بھی بڑے آدمی کی کوئی وقعت ان کی نظر میں نہیں تھی۔ انتہا یہ کہ مجاہدین حریت اور محبان وطن کے تذکرہ کے وقت وہ کچھ ایسے بے قابو ہو جاتے ہیں کہ دہلی کی روایتی تہذیب کا دامن بھی ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور ایک ایسا انداز اختیار کر لیتے ہیں جس پر بازاری لوگوں کو بھی شرم آجاتی ہے۔

(علمائے ہند کا شاندار ماضی [۴]: ص ۱۸۶)

سرسید احمد خاں صاحب نے تن من کی بازی لگا کر جس طرح حق وفا ادا کیا، وہ شاید ناکافی تھا اس لئے ان کو اپنی کمال نیازمندی اور برأت کے اظہار کے لئے وہ انداز تحریر بھی اختیار کرنا پڑا جس کی تعبیر کے لئے وفاداری، نیازمندی جیسے الفاظ بھی ناکافی ہیں جگہ جگہ ان واجب الاحترام شخصیتوں کو، جن کی تعظیم کے لئے پورے ضلع بجنور کی گردنیں ختم ہوتی تھیں،

بدذات، نمک حرام، حرام زادہ وغیرہ کے ''مہذب'' الفاظ سے یاد فرمایا ہے۔ وہی سرسید جو چند سال بعد ''تہذیب الاخلاق'' کے مصنف بنے، کیا ان کے اخلاق ایسے ہی ہونے چاہئیں؟

(ایضاً ص ۴۴۳)

سچائی اور خلوص کے ساتھ اختلاف رائے باعث ملامت تو کیا ہوتا، نص حدیث نے اس کو رحمت فرمایا ہے البتہ یہ انتہا پسندی کہ مخالف کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر کر تہذیب وشائستگی کے لازمی تقاضوں سے بھی اس کو محروم کر دیا جائے اور اس کے لئے بازاری الفاظ سے بھی گئے گزرے الفاظ استعمال کئے جائیں، یقیناً ایسی شکایت ہے جس کا ازالہ آج تک نہیں ہوسکا۔

(ایضاً ص ۴۴۴)

ڈاکٹر محمد میاں صدیقی

انسانی عقل کی حدود اور معجزات:

سرسید احمد خاں اور ان جیسے دوسرے حضرات کو انبیا کی ذات سے وابستہ بعض واقعات کو تسلیم کرنے میں دشواری اس لئے محسوس ہوئی ہے اور وہ شک اور تذبذب کا شکار اس بنا پر ہوئے (اور ہوتے) ہیں کہ وہ ان واقعات کو عقل کے ترازوؤں میں تولنے لگے ہیں اور ان واقعات کو بھی عام انسانوں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات پر قیاس کرتے ہیں اور یہیں سے بنیادی خرابی کا آغاز ہوتا ہے۔ انبیا کے ساتھ پیش آنے والے بعض خلاف عادت واقعات کو معجزہ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ دوسروں کے لئے اس طرح کا عمل ممکن نہیں ہوتا اور نہ ہی اس جیسے عمل کا نبیوں اور رسولوں کی ذات کے علاوہ کسی اور ذات سے صدور ممکن ہوتا ہے۔ معجزہ تو حقیقت میں معرفت نبوت کا ایک ذریعہ ہے، اسے عقل کے ترازو میں کیسے تولا جاسکتا ہے؟ نبوت و رسالت کی حدیں تو شروع ہی وہاں سے ہوتی ہیں جہاں انسانی عقل کی رسائی ختم ہوجاتی ہے اور اس کے حواس ادراک وشعور سے عاجز اور درماندہ ہوجاتے ہیں۔

(فکر ونظر اسلام آباد، سیرت نمبر ۱۹۹۲ء، ص ۲۷۹)

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

جمال الدین افغانی کے نظریہ اخوت اسلامی کی مخالفت:

مشہور مسلم مفکر اور عالم دین جمال الدین افغانی نے اخوت اسلامی کا نظریہ پیش کیا، یعنی یہ کہ ساری دنیا کے مسلمان ایک برادری ہیں اور سب کو مل کر ان مسئلوں کو حل کرنا چاہیے جو اسلامی دنیا کو درپیش ہیں۔ سرسید احمد خاں، افغانی کے اس نظریے کے شدید مخالف تھے۔ ان کے نزدیک ساری دنیا کے مسلمان ایک وحدت یا برادری نہیں اور اُن کے نزدیک اخوتِ اسلامی کا نظریہ سراسر غیر حقیقت پسندانہ، غیر عملی اور بالکل غلط ہے۔ انہیں اس کے ماننے میں بھی تامل تھا کہ سلطان ترکی سارے مسلمانوں کے خلیفہ ہیں۔ وہ ترکوں کی خلافت کے منکر تھے۔ ان کے خیال میں اگر ہندوستانی مسلمانوں نے اخوتِ اسلامی کے نظریے کو قبول کیا تو یہ ان کے لئے حد درجہ مضرت رساں ثابت ہوگا، اس لئے کہ اس کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں کا برطانوی حکومت سے تصادم ہوگا اور اس سے مسلمانوں کو زبردست نقصان پہنچے گا، اس لئے انہوں نے اس نظریے کی بڑی شدت سے مخالفت کی اور اس کے ساتھ انہوں نے ترکوں کی خلافت کے جواز کو بھی چیلنج کیا۔

(جدید ہندوستان کے سیاسی اور سماجی افکار: ص ۴۵)

اعلیٰ عہدوں کے اہل محض ''اشراف'':

سید احمد خاں سیاسی اعتبار سے قدامت پسند تھے۔ وہ نمائندہ یا نیابتی حکومت یا منتخبہ نمائندوں کے تخیل کے شدید مخالف تھے۔ ان کے خیال میں حکومت صرف اعلیٰ خاندان کے افراد ہی کر سکتے ہیں اور حکومت کے اعلیٰ عہدے بھی اونچے خاندانوں کے لوگوں کو ملنے چاہئیں اس لئے کہ ہندوستانی رؤسا اور اشراف اسے برداشت نہ کریں گے کہ ان پر نیچی ذات یا کم حیثیت کے افراد حکومت کریں۔ کانگرس کی مخالفت کی ایک بڑی وجہ ان کی یہ افتادِ مزاج بھی تھی۔ (ایضاً ص ۴۸)

کھلی ہوئی مداہنت :

(تبصرہ بر کتاب "علی گڑھ سے دیو بند تک") مصنف کے نزدیک سید احمد خاں بڑے عالم تھے، یہ خلاف واقعہ ہے۔ وہ کسی درجے میں بھی مذہبی عالم نہ تھے اور نہ ان کی رائے اسلام اور اسلامی عقیدوں میں سند رکھتی ہے مصنف نے بار بار علی گڑھ تحریک کے بانی کو مجاہد اور غازی قرار دیا ہے اور ان کے مذہبی خیالات، جو اہل اسلام سے ہٹے ہوئے تھے، سے صرف نظر کیا ہے۔ یہ کھلی ہوئی مداہنت ہے۔

(اردو بک ریویو نئی دہلی مئی جون ۱۹۹۹، ص ۲۹۔۳۲)

پروفیسر محمد یٰسین

ہندو مسلم اتحاد کا پرچارک :

سرسید نے اپنے زمانہ میں ہندو مسلم اتحاد پر بہت زور دیا۔ بدقسمتی نے کچھ دانش وروں نے انہیں مسٹر جناح کے "دو قومی نظریہ" کا حلیف قرار دیا ہے کیونکہ انہوں نے مسلمانوں کو عصری سیاست سے الگ رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سرسید دو قومی نظریہ کے حامی نہیں تھے۔ تقسیم ہند کا تصور تو ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ وہ محض ہندوستانی مسلمانوں کے جمہوری حقوق کا تحفظ چاہتے تھے۔ انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو مادر ہند کی دو رسیلی آنکھوں سے تشبیہ دے کر ثابت کر دیا کہ باہمی اتحاد کے بغیر ملک کا کوئی مستقبل نہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ سرسید کے دوستوں میں ہندو راجگان، امرا، تجار، وکلا اور افسران بھی شامل تھے جنہوں نے علی گڑھ کالج کے لئے دل کھول کر عطیات دئے۔

(فکر و نظر علی گڑھ، سرسید نمبر ۱۹۹۲، ص ۱۶۴)

پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

عقلی توجیہہ پر اصرار مگر ماورائی بھی تسلیم :

سرسید کے یہاں عقلی تدبر اور تفکر کا بہت اثر ہے انہوں نے معجزات کے عام

رائج تصور سے انکار کیا۔ شاہ ولی اللہ کے حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ قرآن میں معجزات کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ شق الصدر یا معراج کے بارے میں وہ عقلی توجیہہ کرتے ہیں اور اسے خواب کی ایک کیفیت قرار دیتے ہیں۔ دریائے نیل کے پھٹنے کو وہ ہواؤں کی وجہ سے پانی میں راستہ بنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ معراج یا تخلیق آدم کے بارے میں انہوں نے جو باتیں کہی ہیں وہ بھی اسی طرح کی ہیں۔ سورۂ فیل میں چڑیوں کا جو ذکر ہے، اس کی تعبیر انہوں نے دوسری طرح سے کی ہے۔ اسی طرح اجنہ، شیاطین، وحی کی کیفیت وغیرہ کی وہ عقلی توجیہہ کرتے ہیں۔ وہ وحی کو نبوت کا ایک ملکہ کہتے ہیں، ایک استعداد جس سے حضرت جبرئیل کے بغیر وہ چیزیں یا باتیں رسول اللہؐ پر القا ہوتی تھیں...... اسی سلسلے میں ان کے یہاں ایک تضاد بھی سامنے آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر چیز عقل کے مطابق ہونی چاہیے لیکن اللہ کی ذات وصفات، جنت اور جہنم فرشتے، حشر نشر اور تقدیر کو وہ ماورائی تسلیم کرتے ہیں، پھر ان کی عقلی توجیہہ کرنے کے کوئی معنی سمجھ میں نہیں آتے۔

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، مارچ اپریل ۱۹۹۸، ص ۷۷)

اسرائیلی روایات قبول بھی اور نامقبول بھی:

عام مسلمانوں اور علما کو سرسید سے جو شکایت ہوئی وہ معجزات کے علاوہ مفسرین سلف پر شدید تنقید کی وجہ سے ہوئی۔ وہ بخاری کی بھی تنقید کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اسرائیلی روایات کو قبول کرنے میں جو احتیاط برتنی چاہیے تھی وہ ان لوگوں نے نہیں برتی لیکن ساتھ ہی وہ حدیث کی بہت سی صحیح روایتوں کو بھی قبول کرنے سے انکاری ہیں۔ بخاری کی کتاب التاریخ سے انہوں نے صاف انکار کر دیا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ بعض اسرائیلی روایات کو بھی قبول کر لیتے ہیں جیسے توریت اور زبور کی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چھ دن میں زمین و آسمان کی تخلیق کی اور ساتویں دن آرام کیا۔ سرسید ساتویں دن والے حصے کو چھوڑ دیتے ہیں اور بقیہ چھ دن والے حصے کو قبول کر لیتے ہیں۔ (ایضاً ص ۷۸)

روایات کے قبول ورد میں تضادات:

موضوعاتی تجزیہ کے علاوہ سیرت نگاری کے بعض دوسرے اصولوں کی روشنی میں

جب ہم خطبات احمدیہ کا جائزہ لیتے ہیں تو سرسید کے طریق کار کے بعض نقوش واضح طور پر نظر آتے ہیں جو سب کے سب مثبت نہیں بلکہ منفی بھی ہیں۔ ... روایات کی تنقیح و تجزیہ میں سرسید کبھی کبھی افراط و تفریط سے کام لیتے ہیں۔ خاص کر بعض صحیح روایات کو مسترد کرنے میں حد اعتدال سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مسلمانوں کی کتابوں کے حالات پر ...... وہ امام بخاری کی تاریخ کو "بعض بھی قدر کے لائق نہیں" بتاتے ہیں حالانکہ یہ بیان غیر منصفانہ ہے۔ اسی طرح وہ کتب احادیث میں بھی ان کتابوں کو جن کو معتبر مانتے ہیں تنقید و تنقیح سے بالاتر نہیں سمجھتے اور صحت حدیث کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں کہ درایت کی تنقیح بھی ضرور کرے ...... وہ اصل روایات احادیث کے بارے میں ایک خاص نقطہ نظر رکھتے ہیں جس کو جمہور یا تمام علمائے اسلام کا اتفاق حاصل نہیں۔ دوسرے سرسید پر عقلیت پسندی کی اتنی گہری چھاپ تھی کہ وہ کسی واقعہ کے خرق عادت کو قبول کرنے کے لئے کسی طرح تیار نہ تھے۔ اس لئے یا تو وہ اپنے اجتہادات سے کھینچ تان کر معقول توجیہ کرتے تھے یا اس کے خرق عادت ہونے ہی سے انکار کر دیتے تھے۔ اس طرح وہ صرف روایت کے قبول و رد میں افراط و تفریط کا شکار ہوئے بلکہ بسا اوقات تضادات کے بھی مرتکب ہوئے۔

(فکر و نظر خصوصی شمارہ، سرسید نمبر ۱۹۹۲ء، ص ۲۴۵-۲۴۶)

اخذ و قبول اور رد و استرداد کی اصل کسوٹی:

سرسید علیہ الرحمہ نے جو کچھ فکر و عمل کے میدان میں کیا وہ سب کا سب حرف بحرف صحیح اور قابل تقلید نہیں ہے۔ ان کی فکر میں انحراف بھی ہے، اجماع سے اختلاف بھی اور فقہی راہ سے ہٹ کر بھی کوئی دعوی بھی۔ صحیح رویہ یہ نہیں ہے کہ بلا تنقید و تحقیق سب افکار سرسید قبول کر لئے جائیں اور نہ صحیح رویہ یہ ہے کہ ان کا نام آ جائے اور ہم پڑھے بغیر تحقیق و جستجو کے بند کانوں کو ہاتھ لگائیں اور ان کو بہروں کی مانند سب کو مسترد کر دیں۔ اخذ و قبول اور رد و استرداد میں اصل کسوٹی کتاب و سنت و اجماع یا بالفاظ دیگر حق ہے۔ ان کے جو افکار و اعمال حق کی میزان میں صحیح اتریں ان کو قبول کرنا اسی طرح واجب ہے جس طرح کسی اور مسلم صاحب فکر کے افکار و اعمال، اور جو غیر صحیح ٹھہریں اور کسوٹی پر کھوٹے نکلیں ان کو مسترد کرنا واجب ہے۔

لیکن اس اخذ و رد میں ذہنی توازن ، حق و حق سمجھنے اور دیکھنے کی صلاحیت اور عصبیت و تعصب سے پاک ہونے کی شرط بڑی کٹھن ہے۔ ہو یہ رہا ہے کہ ہم فکر سرسید تو کیا تمام افکار ملی اور تحقیقات ملی کو پڑھے، جانے بوجھے اور پرکھے بغیر محض نام سن کر مسترد کر دیتے ہیں۔

(سرسید اور علوم اسلامیہ صفحہ س)

پروفیسر محمد یعقوب شاہق

دو مختلف اور متضاد اقدار کے تصادم کی گونج:

سرسید احمد خاں خود تو پرانے نظام تعلیم کے پروردہ تھے، ان کا تعلق شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے مدرسے سے بھی تھا اور مرزا مظہر جان جاناں کے جانشین شاہ غلام علی کی خانقاہ سے بھی ان کے تعلقات استوار تھے لیکن سرسید نے آگے چل کر ان دونوں مراکز سے ہٹ کر اپنے افکار و خیالات کی بنیاد ایک ایسے مکتب پر رکھی جس کے عناصر ترکیبی میں عقلیت، مادیت، اجتماعیت اور حقائق نگاری کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ کہنے کو تو یہ چند الفاظ ہیں لیکن انہی الفاظ میں اس زمانہ کے مغرب و مشرق کی آویزشوں کی داستان سمٹی ہوئی ہے۔ سرسید کے ان افکار میں دو مختلف اور متضاد اقدار کے تصادم کی گونج موجود ہے۔...... انہوں نے اردو ادب کو گل و بلبل اور حکایت زلف و رخسار سے نکال کر زندگی کے حقائق کے ہم آہنگ کیا، مذہبی میدان میں کورانہ تقلید کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور تعلیمی میدان میں زوردار تحریک چلائی لیکن اس ساری تگ و دو کا مقصد مغربی تہذیب و ثقافت کی اشاعت اور نوکریوں کے حصول سے بلند تر نہ ہو سکا۔ مغربی نظریات کے سامنے ارادۃً یا مصلحتاً انہوں نے جس سر افگندگی کا مظاہرہ کیا، اس کے تلخ ثمرات کسی نہ کسی شکل میں اب تک موجود ہیں۔.... جہاں تک علی گڑھ تحریک کی افادیت اور نتائج و ثمرات کا تعلق ہے، یہ بات متنازعہ فیہ ہے کہ انیسویں صدی عیسوی کی مادہ پرستانہ تہذیب کے غلبے اور روایتوں کی شکست و ریخت نے جن مصلحین کو جنم دیا تھا، وہ قوم و ملت کی بیماری کے صحیح اسباب کو جاننے اور صراط مستقیم کی طرف گامزن کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوئے! دراصل تہذیب جدید کی قاہری نے ذہنوں کو احساس کمتری

سے دوچار کر دیا تھا اس لئے اسلامی نظریات کو مغربی انداز فکر سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی، اور کوشش کی گئی کہ اسلامی اصولوں کو کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر مغربی طرز فکر کے قریب کیا جائے۔ سرسید کی "تفسیر القرآن" اور "تبیین الکلام" میں یہ نقطہ نظر حد اعتدال سے بہت کچھ تجاوز کر گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ نظام تعلیم اسلامی تشخص کے حوالے سے جذبہ خودی سے محروم ہی رہا۔

(فیض الحق ص [illegible])

حکیم محمود احمد برکاتی

"سلسلۃ الملوک" میں سقوط دہلی (۱۸۰۳ء) سے مغلیہ حکومت کا خاتمہ:

پہلے تو یہ سوچتے ہیں کہ ابھی سرسید نے اس سے ۱۳ سال پہلے ۱۸۳۹ء میں اسی قسم کا ایک جدول (جام جم) شائع کیا تھا جس میں دہلی کے صرف مسلمان فرماں رواؤں کے نام تھے (امیر تیمور سے بہادر شاہ ثانی تک)۔ اُس وقت بھی تو لارڈ لیک دہلی کو "فتح" کر چکا تھا مگر اس میں شاہ عالم ثانی بھی تھے، اکبر شاہ ثانی بھی اور بہادر شاہ ثانی بھی۔ پھر آخر ۱۳ سال میں حالات میں ایسا کون سا انقلاب آ گیا کہ یہ حضرات بادشاہ نہیں رہے اور شاہان انگلستان فرماں روا ہو گئے؟

پھر یہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ جب اکبر شاہ ثانی دہلی کے فرماں روا نہیں رہے تھے تو سرسید کے نانا کس کے وزیر اعظم تھے اور انہیں نواب دبیر الدولہ امین الملک بہادر مصلح جنگ وغیرہ خطابات کس نے اور کس حیثیت سے دئے تھے، اور ان دبیر الدولہ نے وہ سکے کس کے نام سے ڈھالے تھے جو بقول آپ کے غدر تک رائج رہے؟ جب اکبر شاہ ثانی فرماں روا نہیں رہے تھے تو ان کے نام کے سکے کیوں مروج تھے؟ سرسید کے نانا کے خاص دوست اختر لونی (آکڑلونی) کو نصیر الدولہ، فخر الملک، وفادار، خان بہادر، ظفر جنگ کے خطابات کس نے دئے تھے؟ اور یہ اختر لونی کے عہدے ریذیڈنٹ کا کیا مطلب تھا؟ اور یہ ریذیڈنٹ کس کی طرف سے اور کس کے دربار میں تھے؟ اور دربار عام کے

موقعوں پر ان کے سامنے کھڑے کیوں رہتے تھے، بیٹھ کیوں نہیں جاتے تھے اور نذریں کیوں پیش کرتے تھے؟ خود سرسید کو جوادالدولہ عارف جنگ کا خطاب بہادر شاہ نے کس حیثیت سے دیا تھا؟ اور اس خطاب کو وہ ۱۸۵۲ء میں ہی نہیں اور ۱۸۵۷ء میں ہی نہیں، ۱۸۹۶ء تک کیوں بڑے فخر اور اہتمام سے استعمال کرتے رہے؟ بہادر شاہ ثانی جب فرماں روا نہیں رہے تھے بلکہ تخت نشین ہی نہیں ہوئے تھے تو ان کے نام کا سکہ کیوں رائج ہوا تھا جس کا شعر آپ نے جامِ جم میں درج کیا ہے؟ --ان سوالات کے پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ صورت حال بالکل مختلف تھی۔

اصل میں اس سے تو کسی کو انکار نہیں کہ ۱۸۰۳ء میں دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تھا مگر برعظیم کے باحمیت باشندے اس کو سقوطِ دہلی کہتے ہیں، فتح دہلی نہیں۔ بعض مواقع پر بعض حقائق سے صرف نظر ہی معیار شرافت اور تقاضائے حمیت ہوتا ہے تو قومی وملی نقطہ نظر سے یہ سقوط دہلی تھا۔ دہلی پر انگریزوں کا تسلط تھا، یہ اہل وطن کے لئے کوئی گوارا اور قبول خاطر خبر نہیں تھی، ایک ناگوار حقیقت اور بارگوش خبر تھی، اسی لئے ساکنان حضرت دہلی خواہ ناخواہ حکم کمپنی بہادر کا مانتے تھے مگر مرکز عقیدت لال قلعہ تھا، تختِ طاؤس تھا، ''بادشاہ سلامت'' تھا۔ جہاں تک قانون کا تعلق ہے، اس کی رو سے بھی حکومت لال قلعے کے مکینوں ہی کی تھی۔ چاہے اس میں انگریزوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیاسی مصلحت ہی کیوں نہ ہو مگر وہ بھی قانوناً بادشاہ، اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ثانی ہی کو کہتے تھے۔

(سفر اور تلاش: ص ۸۵۔۸۶)

جنگِ آزادی میں حریفانہ شرکت:

سید مرحوم کے دامانِ حیات پر سب سے سوا بدنما اور ''نادیدنی'' داغ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ان کی شرکت حریفانہ تھی۔ جنگ آزادی بلاشک وریب جنگ آزادی تھی، یہ فرنگی غاصبوں کی مستعمرانہ حرص وآز کے خلاف وطن دوست ہندیوں کی ایک حرکت تھی، بظاہر نظر ناکام مگر نتائج وثمرات کے پیش نظر کامیاب! ہر وطن دوست طبقہ اور فرد نے اس جنگ میں حصہ لیا اور جس طبقہ اور فرد نے اس میں حصہ [illegible]

وطن دشمنی اور خدمت استعمار پر کوئی بڑے سے بڑا زبان آور اور ''قلم دراز'' بھی پردہ نہیں ڈال سکتا۔ اس جنگ میں ارباب ہند دو گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک طرف -- ہماری طرف -- بخت خاں، فیروز شاہ، فضل حق اور محمود خاں وغیرہم تھے۔ جب بھی ان کا ذکر چھڑ جاتا ہے، ہمارے دل دھڑک دھڑک ان کو سلامی دیتے ہیں:

دی سادگی سے جان، پڑوں کوہ کن کے پاؤں

دوسری طرف -- ہمارے مقابل -- منشی رجب علی، الٰہی بخش اور سرسید وغیرہم تھے۔ ان کے دامنوں پر فرنگیوں کی اعانت و حمایت و نصرت کا داغ ہے ...... وہ (سرسید) اس معرکہ میں ہماری صفوں میں نہیں، دشمن کی صفوں میں دیکھے گئے۔ ان کی ہمدردیاں اور وفاداریاں ملک و اہل ملک کے ساتھ نہیں تھیں، حکام انگریزی کے ساتھ تھیں اور دوسروں کا نہیں خود سرسید کا فخریہ بیان ہے کہ اس جنگ کو ناکام بنا دینے میں جن ملکیوں کی مساعی کو دخل تھا، ان میں وہ بھی تھے۔

(سیرت فریدیہ مطبوعہ کراچی: ص ۳۷۔۳۸)

''دائمی عمل داری'' اور ''داغِ مفارقت'':

سرسید ۱۸۹۸ء تک اس ''یقین'' میں ''مبتلا'' رہے کہ حکام انگریزی کی عمل داری ہندوستان سے کبھی نہ جا سکے گی، اور اسی یقین کی وجہ سے وہ فرنگی کی ہر جہتی خدمات مسلسل وعلی الاتصال انجام دیتے رہے..... سرسید کی وفات کو پوری نصف صدی بھی نہ بیتی تھی کہ حکام انگریزی کی عمل داری سرزمین ہند کو داغ مفارقت دے چکی تھی۔ الحاصل سرسید انیسویں صدی کی ایک عظیم شخصیت تھے، ایک ایسی شخصیت جو اس صدی کے ۳/۴ حصے پر حاوی و محیط رہی اور جس نے اس عہد کے متعدد ''اشخاص'' کو ''شخصیات'' بنا دیا۔ وہ ذاتی طور پر بہت سے محاسن و محامد اخلاق و سیرت کے حامل تھے۔ وہ ایک مصنف کی حیثیت سے بجا طور پر فراموش کر دئے گئے ہیں۔ اجتماعی مسائل میں انہوں نے ہماری خدمت نہیں، بدخدمتی کی:

خدا مجنوں کو بخشے، مر گیا اور ہم کو مرنا ہے!

(ایضاً: ص ۴۸۔۴۹)

حافظ محمود شیرانی

اینٹی اسلامک موومنٹ:

کچھ دنوں سے سرسید کا کالج پیدا ہوا ہے اور بعض علم دوست والدین اپنے بچوں کو وہاں بھیجنے لگے ہیں۔ٹونک والوں نے بھی اس سے فیض اٹھایا ہے لیکن ان کے کالج سے مجھ کو ہمدردی نہیں۔ اگر چہ کالج کا تماشائی اس کی لمبی چوڑی عمارت اور مسلمان بچوں کا ایک گروہ کثیر وہاں دیکھ کر خیرہ ہو جاتا ہے لیکن میں اس تعلیم کو Anti-Islamic Movement کے نام سے یاد کروں گا کیونکہ وہ کالج مسلمانوں کو اچھا خاصا انگریز بنا دیتا ہے اور جب یہ انگریز زیادہ پڑھ لکھ جاتا ہے تو وہ اسلامی علما، حکما اور فلسفیوں کو تو بھول جاتا ہے اور بات بات میں اپنے قول کی تائید میں کسی انگریز کو پیش کرے گا۔ وہ اگر چاہے تو ابن رشد کو اپنے قول کی تائید میں پیش کر سکتا ہے لیکن نہیں، وہ لارڈ بیکن ہی کو پیش کرے گا۔ سعدی وہ بھول جائے گا اور دوڑ کر شیکسپیئر کو لائے گا حالانکہ سعدی شیکسپیئر سے ہزار درجہ اور دس ہزار درجہ بڑھا ہوا ہے، خواہ قبولیت کے لحاظ سے خواہ قابلیت کے لحاظ سے۔ وہ اگر چاہے تو شہاب الدین مقتول کا حوالہ دے سکتا ہے لیکن نہیں، وہ ڈارون کا حوالہ دے گا۔ الغرض یہ تعلیم اگر چہ علمی لحاظ سے نہایت مفید ہے لیکن ایسی حالت میں وہ اسلامی ہمدردی کا خون کر رہے ہیں۔

(مکاتیب حافظ محمود شیرانی: ص۱۳۶)

مختار احمد مکی

سیکولرزم کا قابل قدر تصور اور نمونہ:

انیسویں صدی کے ہندوستان میں سرسید احمد خاں نے جس سیکولرزم کا تصور پیش کیا وہ آج بھی قابل قدر ہے۔ فرماتے ہیں کہ ''ہندو ہونا یا مسلمان ہونا انسان کا عقیدہ یا اندرونی خیال ہے جس کو بیرونی معاملات اور آپس کے برتاؤ سے کچھ تعلق نہیں'' ...... ''لفظ قوم سے میری

مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ یہی وہ معنی ہیں جس میں میں لفظ ''نیشن'' کی تعبیر کرتا ہوں۔قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے'' ...... سرسید احمد خاں نے صرف اپنی تحریروں اور تقریروں میں ہی ان آدرشوں کی بات نہیں کی بلکہ عملی زندگی میں بھی اس کا نمونہ پیش کیا، اس کو برتا اور اس پر گامزن رہے۔ ۶ دسمبر ۱۸۷۵ء کو ایم اے او کالج کی جانب سے سب سے پہلا ایڈریس ایک سکھ مہاراجہ سرمہندر سنگھ فرماں روائے پٹیالہ کو دیا گیا اور کالج کے فوائد تعلیم کو بتاتے ہوئے سرسید نے کہا کہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی اس میں تعلیم پائیں گے ...... تدریسی عملہ میں غیر مسلم پروفیسروں کو نہایت باعزت جگہیں دی گئیں اور کالج کے سات ہندوستانی اساتذہ میں دو ہندو یعنی جادو ناتھ چکرورتی اور پنڈت شیو شنکر نمایاں تھے، اور ان ساتوں میں سب سے زیادہ تنخواہ چکرورتی کو ہی ملتی تھی۔ پہلے ہی دن سے اس ادارہ میں سنسکرت کی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا ...... اس کالج کے پہلے گریجویٹ ایشوری پرشاد تھے ...... طلبہ کے لئے وظیفے بغیر کسی تمیز کے دئے جاتے بلکہ کچھ وظیفے تو ہندو طلبہ کے لئے ان کے ہندو ہونے کے باعث مخصوص تھے۔ سرسید نے کالج کے پہلے پرنسپل مسٹر سڈن کو تاکید کی تھی کہ جو ہندو طلبہ بی۔ اے امتیازی نمبر سے پاس کریں گے تو ان کو وہ گولڈ میڈل اپنی جانب سے دیں گے۔

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، فروری ۱۹۹۷ء: ص ۲۵۔۲۶)

سرسید کے فیصلے پر ان کے جانشینوں کی نظر ثانی:

اگر چہ سرسید نے ہندوستانی مسلمانوں کو سیاست سے الگ ہٹا کر اپنی توجہ صرف تعلیم پر مرکوز کرنے کی ترغیب دی تھی اور اس کے لئے کوشاں بھی رہے، انہوں نے علی گڑھ کو ایک معیاری تعلیم و تربیت کا ادارہ بنانے اور اس کی آبیاری پر اپنی تمام کوششیں صرف کر دیں لیکن ان کے انتقال کے بعد ان کے جانشینوں نے سرسید کے فیصلے پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی ...... چنانچہ علی گڑھ سے وابستہ اور فیض یافتہ افراد کی ایک بڑی تعداد نے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کیا۔ (ایضاً، اکتوبر ۱۹۹۸ء: ص ۶۱)

مختار الحق

ہندوستان میں لفظ قوم کی تشریح:

یہ انہی کرنوں کا فیض ہے کہ آج برصغیر ہندو پاک میں مسلمان سر اٹھا کر جینے کے قابل ہیں۔ اس سے یہ مطلب نکالنا کہ سر سید کو صرف اپنے فرقے کی بھلائی کی فکر تھی ،سراسر بہتان تراشی ہے اور یہ تاریخی ناواقفیت پر دلالت کرتا ہے...... سر سید تو ایسے تھے کہ انگریزوں کے لئے بھی اپنی گردن کٹانے کو تیار ہو گئے۔ کیا وہ واقعہ ہم بھول گئے جب ۱۸۵۷ء کے غدر میں بجنور کی صورت حال انتہائی خراب ہوگئی تو سر سید نے مسز شیکسپیئر کے پاس جا کر ان کو تشفی دیتے ہوئے کہا تھا:

> ''جب تک ہم زندہ ہیں، آپ کو گھبرانا نہیں چاہیے۔ جب آپ دیکھیں کہ ہماری لاش کوٹھی کے سامنے پڑی ہے تو اس وقت گھبرانے کا مضائقہ نہیں''۔

سر سید نے قوم اور رعایا جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں اور یہ دونوں الفاظ کسی مخصوص مذہب کے ماننے والوں یا کسی گروہ کی ترجمانی نہیں کرتے...... یہاں پر لفظ قوم کی تشریح کے لئے سر سید کے ان الفاظ کو پیش کرنا قطعی نامناسب نہ ہوگا۔ وہ کہتے ہیں:

> ''قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے، گوان میں بعض بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔ اے ہندو مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اس سرزمین پر تم دونوں نہیں بستے ؟ کیا اس زمین میں تم دفن نہیں ہوتے یا اسی گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے ہو اور اسی پر جیتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی بھی ، جو اس ملک میں رہتے ہیں، اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہے''۔

(تہذیب الاخلاق لاہور، اکتوبر ۱۹۹۳ء: ص ۱۲-۱۴)

پروفیسر مسعود الحق عثمانی

انگریزیت کا طوفان:

۱۸۵۷ء کے بعد جس طرح کا ذہنی، تہذیبی اور سیاسی انقلاب آیا تھا، اس کے بعد میرا عقیدہ ہے کہ اگر شبلی اور ابوالکلام نہ پیدا ہوئے ہوتے تو مسلمان انگریزیت کے اُسی طوفان میں بہہ گئے ہوتے جو سرسید کی تحریک نے پیدا کر دیا تھا۔ شبلی اور ابوالکلام نے مل کر اس کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی اور بلاشبہ وہ کامیاب رہے اور انہی کی کامیابی سے مسلم یونیورسٹی کی فضا اسلامی تہذیب کی امین اور ضامن بن سکی۔

(مولانا ابوالکلام اور ان کے چند بزرگ دوست اور عقیدت مند: ص ۶۹)

مسلم ضیائی

''غداری'' کے الزام سے بچانے کا نرالا جواز:

جب انگریز حکمرانوں کی حمایت سے پادریوں کی چیرہ دستی نے عوام کے دلوں میں یہ اندیشہ پیدا کر دیا کہ ان کا آخری سہارا مذہب بھی، جو کم از کم دوسری دنیا میں ان کے لئے جنت اور حور و قصور کا ضامن تھا، چھین لیا جانے والا ہے تو ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک پڑا اور انہوں نے ''انگریز نوابوں'' کے خلاف علم سرکشی بلند کر دیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب ملک کے ہر طبقے نے بدیسی حکمرانوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ اس میں علما بھی تھے اور جہلا بھی، راجہ بھی تھے اور نواب بھی، اہل حرفہ بھی تھے اور بے نوا فقیر بھی، لیکن ایک ایسا طبقہ بھی تھا جس نے ان بدیسی حکمرانوں کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ آج کے قومی تصور کی بنا پر ان لوگوں کو ''غدار'' کے نام سے پکارا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس دور کے تصورات اور خیالات کے مطابق ان لوگوں کو غدار کہتے وقت ہمیں اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ ان لوگوں نے محض اپنے آقاؤں سے نمک حلالی اور وفاداری کا ثبوت دیا تھا جو اُس وقت کے سماجی اور اخلاقی تصورات کے مطابق درست تھا۔ مگر ان وفاداروں اور نمک

حلالوں میں بھی دو گروہ تھے۔ ایک وہ جو اپنے روایتی تصورات کے مطابق انگریزوں کا ساتھ دے رہا تھا، دوسرا وہ جس نے اپنی ذاتی منفعت کے لئے جاسوسی کتوں کے مانند برطانوی حکومت کی خدمات انجام دی تھیں سید احمد خاں کا تعلق اول الذکر طبقہ سے تھا۔

(اردو نامہ کراچی، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۱ء، ص ۲۸)

مشتاق احمد

سرسید کی نادرست باتوں کا جواز:

سرسید احمد خاں کے افکار و خیالات میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو آج کے عملی تناظر میں درست نہیں ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ان باتوں پر خطِ تنسیخ کھینچیں اور جو باتیں یا خیالات عصر حاضر کے تناظر میں درست ہوں، انہیں قبول کر لیں۔ مختصر الفاظ میں جو چیزیں درست نہیں ہیں، وہ یہ ہیں:

سرسید انگریزوں کے حامی اور وفادار تھے اور انگریزی اقتدار کے موید و معاون تھے؛

وہ مسلمانوں کو ان کا دوست نہیں بلکہ انہی جیسا بنانا چاہتے تھے؛

وہ مسلمانوں کو سیاست میں حصہ لینے اور آزادی کی تحریک میں شامل ہونے سے روکتے تھے:

وہ آزادیٔ نسواں اور تعلیمِ نسواں کے بھی خلاف تھے اور

وہ مسلم عوام کی تعلیم و تربیت اور ترقی کے بھی حامی نہیں تھے؛

وہ صرف ہندوستان کے مسلم اشرافیہ کی تعلیم، ترقی اور فلاح و بہبود کے حامی تھے؛

انہوں نے کبھی عوام کی بات نہیں کی اور نہ ہی ان کی نظر میں عوام اور خواص مساوی تھے؛

مزید برآں ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو الگ الگ قومیں قرار دینے کی بات بھی سب سے پہلے انہوں نے کہی تھی، گویا دو قومی نظریے کے اصل بانی وہی تھے؛

لیکن ان ساری باتوں کے بارے میں سرسید احمد خاں کو معاف کیا جا سکتا ہے، اس لئے کہ ان کا اپنا تعلق بھی اشرافیہ سے تھا اور اس وقت تک ہر جگہ مفکروں اور دانشوروں کے مخاطب اول اور

لائقِ ترجیح اشرافیہ طبقے کے لوگ ہی ہوتے تھے۔ سر سید مارکسزم سے واقف نہ تھے اور نہ ہی نوعِ انسان کی طبقاتی تقسیم اور طبقاتی معاشرے کی برائیوں سے آگاہ نہ تھے۔

(نیاز مانہ لاہور، جنوری ۲۰۰۶ء، ص د)

مشتاق حسین

حُبِ دنیا کی تعلیم دینے کے باعث مخالفت:

سید احمد خاں کے ظہور کی علما کی جانب سے جو مخالفت ہوئی، اس کا سبب تو ظاہر ہی تھا کہ سید صاحب نے عقائد میں دخل دیا، اصول قدیمہ متفق علیہا میں ترمیم کی لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس مخالفت پر جوش دلانے والا سید صاحب کا مسلمانوں کو ایک حرام چیز یعنی حب دنیا کی تعلیم دینا تھا کیونکہ عقائد میں دخل دینے والے تو اُن سے پہلے ہی بہت سے گزر چکے تھے مگر چونکہ انہوں نے کسی قسم کا دنیوی لالچ نہیں دیا تھا اس لئے ان سے ایسی عظیم مخالفت کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

(سر سید کا اسلام: ص ۹، بحوالہ سر سید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک کے ناقدین: ص ۲۴۹)

علما کے نیست و نابود کرنے میں اہلِ کالج کی ہمت:

...... آج تک جو کچھ اہلِ کالج نے ہمت صرف کی ہے، وہ محض ان علما کے نیست و نابود کرنے میں کی ہے۔ علما کی جانب سے خواہ کسی قسم کا اختلاف ہوا ہو یا نہ ہوا، لیکن یہ برابر اس فکر میں رہتے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے، ان ملاؤں کی بیخ بنیاد نکال پھینک دی جائے۔ متعصب، زاہد خشک، تنگ خیال، پست حوصلہ، قوم کو غارت کرنے والے، قوم کو تباہ و برباد کرنے والے، یہ تمام معزز خطابات علما کو کالج ہی کی طرف سے عنایت ہوئے ہیں۔ (ایضاً: ص ۱۳۲)

مشیر الحق

اردو اور دیوناگری رسم الخط پر اختلاف:

سر سید کا یہ ... صحیح ہو سکتا ہے کہ ہندوؤں میں ایثار کا جذبہ نہیں پایا جاتا لیکن یہ

حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ انہوں نے بھی اپنی ملت کے مفادات کو ملک کے عظیم تر مفاد کے حق میں قربان کر دینے کے لئے آمادگی ظاہر نہ کی۔ مثال کے طور پر زبان کے مسئلے پر اختلاف میں سرسید نے مسئلے کی بنیادی اہمیت کو نہیں سمجھا۔ انہوں نے اپنے چاروں طرف بہت سے ہندوؤں کو اردو بولتے دیکھا تھا اور بہت جلد فیصلہ کر لیا کہ یہ ان کی مادری زبان ہے، لیکن ایسا نہیں تھا۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سے ہندو، بیشتر یوپی کے باشندوں میں سے، اردو جانتے ہیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اردو ان کی مادری زبان نہیں تھی۔ (جب ہم اردو کہتے ہیں تو ہماری مراد اس ہندوستانی زبان سے ہوتی ہے جو عربی اور فارسی الفاظ سے مرکب ہوتی ہے اور فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، ورنہ دونوں ملتیں ایک ہی بنیادی زبان بول رہی تھیں) سرسید کو اس مسئلے پر اور زیادہ معروضی انداز سے غور کرنا چاہیے تھا۔ قطع نظر اس سے کہ اردو کی نشو و نما کس طرح ہوئی اور اردو کے نشو و نما اور ارتقا میں ہندوؤں نے کتنا حصہ لیا، اس سے اس حقیقت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ ہندوؤں کی اکثریت، خصوصاً ہندو عورتیں اس زبان کو، اگر وہ دیوناگری رسم الخط میں نہ لکھی ہو، نہیں پڑھ سکتیں۔ یہ معاملہ آج کے ہندوستان میں انگریزی زبان کی پوزیشن سے مشابہ تھا۔ ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے کی غالب اکثریت انگریزی زبان سے اچھی طرح واقف ہے، اور بہت سے ہندوستانی اہل قلم کی انگریزی زبان کو نمایاں دین بھی ہے مگر یہ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے کہ انگریزی ہندوستانیوں کی مادری زبان نہیں ہے۔ سرسید کی فکر میں یہ بنیادی نقص تھا۔ ان کی رائے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مفادات مشترک تھے، اس کے باوجود وہ حقیقت پسندانہ نقطہ اختیار کرنے پر آمادہ نہ تھے۔

(جامعہ نئی دہلی، جولائی تا دسمبر ۱۹۹۸ء: ص ۱۸۵۔۱۸۶)

مظہر الدین صدیقی

نیچری تصور کی غیر محدود وسعت:

سرسید نے اسلام کا جو نیچری تصور قائم کیا تھا، وہ اس کے حدود کو بعض اوقات اتنی وسعت دیتے ہیں کہ اسلام اور الحاد میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔

(فکر و نظر اسلام آباد، اپریل ۶۹ء: ص ۷۶۲)

سرسید نے اسلام اور فطرت کی وحدت پر بڑا زور دیا ہے لیکن ان کا تصور فطرت بالکل مبہم ہے ان کا یہ دعویٰ کہ اسلام اور فطرت ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں، محض ایک دعویٰ ہے جس کا وہ کوئی ثبوت فراہم نہیں کر سکے۔

(ایضاً: ص ۶۷ ـ ۶۸)

حدیث اور فقہ کا بالکلیہ ردّ:

سرسید کا حدیث اور فقہ کو بالکلیہ ردّ کر دینا غیر مناسب اور غیر ضروری ہے کیونکہ فقہ اور حدیث دونوں ہمارا قیمتی تاریخی ورثہ ہیں اور ان میں مسلمانوں کے لئے آج بھی سامان رشد وہدایت موجود ہے۔ مسلمانوں کا بحیثیت ایک ملت کے اس بات پر اجماع ہوسکتا ہے کہ حدیث اور فقہ میں وہ کون سی چیزیں ہیں جو ہماری عہد حاضر کی زندگی سے کوئی ربط نہیں رکھتیں اور وہ کون سی مفید مطلب باتیں ہیں جن کی بنا پر نئے قوانین مرتب کئے جا سکتے ہیں۔ حدیث اور فقہ کو بالکل نہ ماننے والے اپنی تاریخ کو مسترد کرنے کے مجرم ہیں۔ حدیث اور فقہ دونوں کو تاریخی ارتقا کی روشنی میں دیکھنا چاہیے اور موجودہ نظام میں ان کا صحیح مقام اس طرح متعین کرنا چاہیے کہ وہ قرآن اور سنت کی روح سے ہم آہنگ ہو۔ (ایضاً: ص ۶۸)

مظہر حسین

برطانوی سامراج کے مفادات کی حمایت:

سرسید کی یہ کتاب (سرکشی ضلع بجنور) شاید ایک خاص نظریاتی تناظر میں لکھی گئی تھی۔ وہ ہندوستان میں برطانوی سامراج کو ایک سماجی، تہذیبی اور سیاسی معاشی نظام کے طور پر دیکھنے میں ناکام رہتے ہیں۔ انہیں اس بات کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ ہندوستان کی مجموعی ترقی کے لئے اس نظام کا خاتمہ ضروری تھا، بلکہ اس کے برخلاف وہ ہندوستان کی مجموعی ترقی کے لئے اسی نظام کے وجود کو ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ برطانوی سامراج اور ہندوستانی عوام کے درمیان موجود معاشی تضاد کو نظر انداز کرتے ہیں جس نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں ہندوستانی عوام کو برطانوی سامراج کے خلاف متحدہ جنگ کرنے کی طرف مائل کرنے میں کلیدی رول ادا

کیا۔ سرسید کے لئے ہندوستانی طبقہ اشرافیہ کے درمیان موجود سیاسی معاشی تضادات کو اجاگر
کرنا ضروری نہیں تھا کیونکہ یہ برطانوی سامراج کے مفادات کے حق میں تھا۔ سرسید نے نہ
صرف انگریزی حکومت کو پچھلی ساری حکومتوں سے بہتر قرار دیا بلکہ ہندوستانی عوام کو اس
حکومت کا خیرخواہ اور وفادار رہنے کا مشورہ بھی دیا اس طرح سے سرسید نے اپنی کتاب
تاریخ سرکشی ضلع بجنور میں جو تاریخی تجزیہ پیش کیا ہے اسے تاریخ نویسی کی جدید اصطلاح میں نو
آبادیاتی ذہن کی تاویل قرار دیا جاسکتا ہے۔

(علی گڑھ تحریک -- سماجی اور سیاسی مطالعہ: ص ۴۲)

حقوقِ نسواں سے بے اعتنائی:

عورتوں کے معاملے میں سرسید اسلام کی دقیانوسی اور فرسودہ تاویل کے قائل نظر
آتے ہیں اور عورتوں کو اسی اسلام کا پابند رہنے کا درس دیتے ہیں جب کہ یہ ثابت کرنے کے
لئے کہ اسلام ترقی کا مخالف نہیں تھا، انہوں نے پورے اسلام کی مطابقت عقل اور فطرت سے
کی لیکن اسلام کی یہ تاویل جدید تعلیم یافتہ یا جدید تعلیم حاصل کرنے والے مسلم اشرافیہ کے لئے
تھی، نہ کہ پورے مسلم سماج اور مسلم عورتوں کے لئے۔ سرسید مہذب قوموں کی ان کوششوں کو
سراہتے تھے کہ انہوں نے اپنی عورتوں کی اصلاح کر کے ان کو نہایت اعلیٰ درجہ کی ترقی پر پہنچادیا
ہے لیکن انہوں نے ہندوستان کے مسلم معاشرے کی عورتوں کی قابلِ رحم حالت کی واقفیت کے
باوجود ان کی اصلاح اور ترقی کو قابل اعتنا خیال نہ کیا اور ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ اس طرح
سرسید کا یہ عمل اسلام سے متعلق ان کے اس دعوے کے منافی دکھائی دیتا ہے کہ اسلام عورت اور
مرد کے حقوق کی برابری کا قائل تھا۔ انہوں نے مرد اور عورت کو ایک نظر سے نہیں دیکھا، یہاں
پر ان کی فکر کا تضاد اور عورتوں کے خلاف ان کا چھپا ہوا تعصب ابھر کر سامنے آتا ہے، اسی لئے
انہوں نے حکومت کو مشورہ دیا کہ عورتوں کی تعلیمی صورتِ حال کو بہتر بنانے کی سمت میں کوئی
کارروائی نہ کی جائے۔ (ایضاً: ص ۲۰۳-۲۰۴)

سرسید کو اس بات کا احساس تھا کہ عورتوں کی تعلیم کے متعلق ان کے خیالات پر لوگوں
کو تعجب ہوتا ہے، یہاں تک کہ ان کے دوست بھی ان کی تنقید کرتے ہیں اور انہیں "تعلیم نسواں

کا مخالف" قرار دیتے ہیں، پھر بھی وہ اپنی رائے پر جمے رہے۔ انہوں نے عورتوں کو ادنیٰ اور مردوں کو اعلا قرار دیا۔ انہوں نے عورتوں کو کم تر سمجھ کر کوئی بھی سماجی رول ان کے سپرد نہیں کیا۔ وہ عورتوں کے معاملے میں دقیانوسی خیال کے حامل تھے لیکن جدید انگریزی تعلیم یافتہ مسلم نوجوانوں کو یورپین تہذیب و تمدن کے معیار کے مطابق مہذب اور متمدن کرنا چاہتے تھے۔ (ایضاً ص۲۰۶)

انگریزی تعلیم سے مسلمانوں کی بیزاری کا افسانہ:

کیا ہندوستان میں اور خصوصاً شمالی ہندوستان میں، جہاں سے یہ تحریک چلائی گئی تھی، مسلمان اپنی آبادی کے اعتبار سے تعلیم کے میدان میں پیچھے تھے؟ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کرنے سے قبل ایک بات واضح کردینی چاہیے کہ سرسید نے ضرور گاہ گاہ پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی سماجی اعتبار سے پسماندہ صورت حال کے پیش نظر ان سے اپنے تعلق کا اظہار کیا اور ان کو ایک جماعت خیال کیا اور سیاسی اور تصوراتی اعتبار سے ان کو ایک قوم قرار دیا لیکن ان کی فکر کے محور بنیادی طور پر شمالی ہندوستان اور وہ بھی شمال مغربی صوبے کے مسلمان تھے۔ مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق جو سرکاری اعداد و شمار پیش کئے گئے اور بحث کی گئی، اس سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ بنگال کے علاوہ دوسرے باقی تمام صوبوں کے ہائی سکولوں میں مسلمانوں کی تعداد تناسب کے اعتبار سے بالکل مناسب تھی، بلکہ شمال مغربی صوبے کے سکولوں میں مسلم طلبہ کی تعداد غیر مسلموں سے زیادہ تھی اور اس کے بعد کے دور میں مسلمانوں کی تعداد خصوصی طور پر سکولوں میں بڑھتی گئی، البتہ یہ ضرور ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مسلم طلبہ کی تعداد تشفی بخش نہیں تھی لیکن اس کی وجہ مسلمانوں کی سماجی حالت اور ان میں پھیلی ہوئی معاشی بد حالی تھی، نہ کہ تہذیبی اور مذہبی تعصب..... انگریزی تعلیم سے مسلمانوں کی بیزاری محض افسانہ تھا جسے سیلکٹ کمیٹی اور عام مسلمانوں میں اس کو حقیقت بنا کر پیش کیا گیا۔ (ایضاً ص۲۲۲۔۲۲۳)

تعلیمی تحریک کا محور "طبقہ اشرافیہ":

جن مسلمانوں کے لئے علی گڑھ تحریک چلائی گئی تھی اور جن کو تحریک کے لیڈران تعلیم

کے میدان میں پس ماندہ تصور کرتے تھے، ان کا تعلق کس طبقے سے تھا؟ کیا وہ غریب اور عام مسلمان تھے؟ سرسید عام مسلمانوں کی بدحالی پر بھی وقتاً فوقتاً اظہار افسوس کرتے تھے لیکن شاید اپنے اس مفروضے کو ثابت کرنے کے لئے کہ مسلمان من حیث القوم مائل بہ زوال تھے اور اس طرح سے مسلمانوں کی بدحالی سے ان کے تعلق کا اظہار تعلیم کے میدان میں طبقہ اشرافیہ کو زیادہ سے زیادہ حصہ دلانے میں معاون ثابت ہوسکتا تھا، وہ نچلے طبقے کے مسلمانوں کے بارے میں سنجیدہ نہیں تھے علی گڑھ تحریک کے لیڈران خود کو شرفا میں شمار کرتے تھے اور حقیقتاً ان کا تعلق بھی طبقہ اشرافیہ سے تھا۔ سرسید اکثر نامی گرامی خاندانوں کی بربادی کا رونا روتے تھے اور اسی طبقے کے لئے فکرمند رہتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے نتیجہ میں ''قوم کی بربادی'' نے ان کے بال سفید کردئے۔ یہ غم ان کے لئے نہایت ہی جاں کاہ تھا۔ مسلمانوں کی تعلیم کا منصوبہ تیار کرتے وقت سرسید اور سیلیکٹ کمیٹی کے ممبران کے پیش نظر مسلمانوں کا بنیادی طور پر یہی طبقہ تھا۔ انہوں نے ''عوام الناس'' کے لئے کسی قدر عام تعلیم کی ضرورت یقیناً محسوس کی تھی لیکن مسلم کالج کے قیام تک اس ضرورت کا احساس بھی جاتا رہا تھا۔ علی گڑھ تحریک کے لیڈروں کی تقریروں سے، کالج کے منصوبے سے، ہوسٹلوں میں طلبہ کی شاہانہ اور عیش پسندانہ زندگی کے بنائے نقشوں سے بھی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تعلیمی تحریک کا محور نچلے طبقے کے مسلمان نہیں تھے بلکہ اس کا متحمل مسلم طبقہ اشرافیہ ہی ہوسکتا تھا۔ (ایضاً:ص ۲۲۴)

ڈاکٹر مظہر مہدی

ترقی اور تعلیم کا دُہرا معیار:

عورتوں کے معاملے میں سرسید اسلام کی روایتی تاویل کے قائل تھے اور ان کو اسی اسلام کا پابند رہنے کی تلقین کرتے تھے جبکہ یہ ثابت کرنے کے لئے، کہ اسلام ترقی کا مخالف نہیں ہے، انہوں نے پورے اسلام کی مطابقت عقل اور فطرت سے کی لیکن اسلام کی یہ تاویل جدید تعلیم یافتہ یا جدید تعلیم حاصل کرنے والے مسلم اشرافیہ کے لئے تھی، نہ کہ پورے مسلم

سر سید نے مسلم معاشرے میں عورتوں کی پست حیثیت کے بارے میں مغربی تنقید کے پیش نظر اس پستی کی ذمے داری اسلامی احکامات پر مسلمانوں کا عمل نہ کرنا قرار دیا اور کہا کہ اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جو عورتوں اور مردوں کے مساوی حقوق کا قائل ہے، لیکن جب عمل کرنے کا معاملہ پیش آیا تو انہوں نے عورتوں کو مساوی حقوق کا مستحق خیال نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں عورتوں اور مردوں کے مساوی حقوق کا دعویٰ یورپی ناقدین کو قائل کرنے کے لئے پیش کیا گیا تھا۔

(اسلام اور عصر جدید نئی دہلی، اپریل ۱۹۹۵ء ص ۵۶۔۵۷)

سر سید نے مسلم معاشرے کی تشکیل نو کے لئے ضروری جدید تعلیم کو صرف مردوں تک محدود کر دیا اور اس کے ثمرے سے عورتوں کو محروم رکھا۔ انہوں نے مردوں کو مقدم سمجھا، ان ہی کو فوقیت دی اور عورتوں کو جدید تعلیم کا مستحق نہیں گردانا...... سر سید کے تعلیمی افکار کا المیہ یہی ہے کہ انہوں نے عورتوں اور مردوں کی تعلیم کا دُہرا معیار قائم کیا، بلکہ یہ کہنا شاید زیادہ مناسب ہوگا کہ انہوں نے ''اشراف'' مردوں اور عورتوں کی تعلیم کا دُہرا معیار مقرر کیا کیونکہ ''اجلاف'' مرد اور عورت ان کے تعلیمی پروگرام سے خارج تھے...... عورتوں کے لئے سر سید نے جدید علوم وفنون کو شجرِ ممنوعہ جانا بلکہ اس تعلیم کی بھی حمایت نہیں کی جسے وہ مردوں کے لئے مردود قرار دے چکے تھے۔ انہوں نے مردوں کے لئے تو یونیورسٹیوں کی باتیں کیں لیکن لڑکیوں کے لئے سکول تک کا دروازہ نہ کھولا اور اس بات کی دہائی دی کہ عورتوں کی تعلیم کے لئے ہندوستان کے حالات اس وقت ناسازگار تھے لیکن سر سید جیسے مفکر مصلح اور مردِ عمل کے لئے عورتوں کی تعلیم کے باب میں صرف گفتگو کر کے حالات کے ناسازگار ہونے کی دہائی دینا اور ان کی تعلیمی حیثیت کو بہتر بنانے کی غرض سے سماجی حالات کو سازگار بنانے کی کوشش نہ کرنا تاریخی ذمے داری سے گریز کرنا تھا۔ خود سر سید نے مسلم معاشرے کی تشکیل نو کی خاطر اس کی تعبیر وتفسیر پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کو بدلنے کی عملی کوشش بھی کی لیکن یہ کام انہوں نے مرد سماج کے لئے کیا، عورتوں کے لئے نہیں کیونکہ مسلم معاشرے کی تشکیل نو کا جو ذہنی خاکہ انہوں نے بنایا تھا اس میں عورتوں کو کوئی رول ادا نہیں کرنا تھا...... عورتوں کی سماجی حیثیت اور ان کے تعلیمی مسائل پر سر سید

کے مباحث کا محور صرف طبقۂ اشرافیہ کے خاندان کی عورتیں تھیں، عام مسلمان عورتیں ان کے غور و فکر کا مرکز نہیں تھیں اور نہ ان کا وجود ان کے لئے قابل اعتنا تھا۔ اگر انہوں نے کہیں ان کا ذکر بھی کیا تو مشکوک کردار کے طور پر، جن سے اشراف لڑکیوں کو علیحدہ رکھنے کی ضرورت تھی تاکہ ان سے میل جول کے نتیجے میں کہیں اشراف لڑکیوں کا کردار نہ متاثر ہو جائے۔ ان کا یہ خدشہ ان کے طبقاتی زاویۂ فکر کا نتیجہ تھا، اس لئے انہوں نے ایسے عام سکولوں کے قیام کے تصور کی مخالفت کی جہاں عام مسلم لڑکیوں کے ساتھ اشراف لڑکیاں تعلیم حاصل کر سکتیں۔

(ایضاً ص ۶۳۔۶۹)

عورتوں کے لئے دقیانوسی نصاب کی حمایت:

سرسید نے مسلم عورتوں کے لئے جس قسم کے نصاب کی حمایت کی، اس سے زیادہ دقیانوسی ممکن نہ تھا۔ اس میں دنیاوی علوم کی ذرہ برابر گنجائش بھی انہوں نے پیدا نہیں کی۔ مسلم عورتیں جس ذہنی پستی میں مبتلا تھیں، اس حال میں اُن کو رکھنے کے لئے یہ نصاب کافی تھا۔ انہوں نے ان کو تاریخ، جغرافیہ اور بنیادی حساب جیسے مضامین پڑھنے کی بھی اجازت نہیں دی اور تعلیم نسواں کے نصاب میں جدید علوم کی شمولیت کے حامیوں پر مغرب زدگی کا الزام عائد کیا۔ سرسید نے مسلم عورتوں کی موجودہ حالت اور حیثیت میں ذرہ برابر رد و بدل بھی گوارا نہیں کیا۔ انہوں نے ان کے لئے کسی قسم کے بھی ایسے سکول کی پرزور مخالفت کی جہاں ہر طبقے کی عورتیں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے داخل ہو سکتی تھیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں کٹر خواص پسند رویے کا مظاہرہ کیا اور مسلم طبقۂ اشرافیہ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی لڑکیوں کے لئے مسلم اشراف میں رائج نظام تعلیم کے طرز پر گھروں کے اندر تعلیم کا انتظام کریں۔ (ایضاً: ص ۱۲۵)

معین احسن جذبی

فرقہ وارانہ اختلافات سے فائدہ اٹھانے کا مشورہ:

انگریزی حکومت کو دوام اسی صورت میں نصیب ہو سکتا تھا جب وہ مضبوط بنیادوں پر قائم ہو۔ سرسید کو اس کی فکر [illegible] سارے منصوبوں کا

دارومدار اسی پر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ۱۸۵۸ء میں حکومت کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی الگ الگ فوج رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں تاکہ بغاوت کی صورت میں ایک کی سرکوبی دوسرے سے کی جائے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں ان کی مراد یہ ہے کہ حکومت اپنے استحکام کی خاطر فرقہ وارانہ اختلافات سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتی!

(حالی کا سیاسی شعور، ص ۵۴)

بغاوت کا مسخ کردار:

انہوں نے بغاوت کے کردار کو مسخ کیا۔ ان کا یہ کہنا کہ بغاوت قومی نہیں تھی، اس حقیقت کو جھٹلانا ہے کہ اس میں ہر مذہب، ہر ملت اور ہر طبقے کے لوگ شریک تھے۔ اسی طرح جہاد کے فتوے کو جعلی قرار دینا اصل واقعہ پر پردہ ڈالنا ہے۔ (ایضاً: ص ۶۵)

کالج میں انگریزی طرز معاشرت اور اطاعت کی تربیت:

جوہرِ قابل پیدا کرنا جب برطانوی یونیورسٹیوں کا مقصد نہ تھا تو پھر ان کی نقل یعنی علی گڑھ میں تو یہ سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ سرسید کا سارا زور تربیت پر تھا جو عام طور سے انگریزی کھیلوں، انگریزی طرز معاشرت اور آداب مجلس کے حصول پر منحصر تھی۔ سیاسی اعتبار سے کالج کا مقصد مسلمانوں کو تاج برطانیہ کی کارآمد اور وفادار رعایا بنانا تھا اس لئے کالج کے قواعد میں یورپین سٹاف کو کالج کا ایک لازمی عنصر قرار دیا گیا تاکہ مسلمانوں اور انگریزوں میں اتحاد و یک جہتی پیدا ہو اور حکومت کو بھی کالج کی خیر خواہی پر اعتماد رہے۔ طلبہ میں جہاں جسمانی صحت، وقت کی قدر اور فرض کا احساس پیدا کیا جاتا وہاں اطاعت کی بھی مشق کرائی جاتی کیونکہ سرسید کے نزدیک یہ محکوم قوم کا زیور تھا۔ (ایضاً: ص ۶۳)

دین و دنیا کی علیحدگی سے دین کی اہمیت ختم:

سرسید نے مغربی تہذیب کا مطالعہ بڑی گہری نظر سے کیا تھا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں مذہب کی حیثیت اتنی جماعتی نہیں رہتی جتنی کہ انفرادی ہو جاتی ہے۔ سرسید نے بھی دین و دنیا کو الگ کر کے مذہب کو ایک انفرادی چیز بنا دیا بلکہ اتنا زور دیا کہ اس کے مقابلے میں دین کی کوئی

اہمیت نہ رہی، مثلاً ''پیٹ ایسی چیز ہے کہ دین رہے یا جائے، خدا ملے یا نہ ملے، بھرا چاہیے'' (ایضاً ص ۶۶)

وفادار بنانے میں سب سے بڑے آلۂ مذہب کا استعمال

مسلمانوں کو انگریزوں کا طرف دار اور وفادار بنانے میں سرسید کے پاس سب سے بڑا آلہ مذہب ہی تھا۔ وہ مسلمانوں کے باغیانہ جذبات سے بہت خائف تھے اس لئے ۱۸۵۷ء کے بعد جہاد کے مسئلے کو بار بار اپنی تحریر و تقریر میں اٹھاتے رہے۔ خطباتِ احمدیہ بھی اس ذکر سے خالی نہیں لیکن تفسیر القرآن میں انہوں نے خاص طور سے اس پر زور دیا۔ اس سے سرسید کا اصل منشا انگریزوں کے ذہن سے جہاد کے خوف ناک تصور کو دور کرنا ہی نہیں بلکہ مسلمانوں میں ایک ایسا مذہبی عقیدہ بھی پیدا کرنا تھا جس کے ہوتے وہ کبھی بھی انگریزوں کے خلاف تلوار نہ اٹھا سکیں۔ (ایضاً ص ۶۷)

ڈاکٹر سید معین الحق

مضحکہ خیز تاویلوں کے باعث بدظنی:

سید احمد خاں نے اسلام کے دینِ فطرت ہونے کی حیثیت پر زور دیا اور اس کو ثابت کرنے کی غرض سے ان کو بہت تاویلیں کرنا پڑیں۔ بعض اوقات یہ تاویلیں ان کے عہد کے مذاق کے مطابق تھیں اور ان لوگوں کے لئے باعث اطمینان ثابت ہوئیں جن کو وہ الحاد کے خطرات سے محفوظ کرنا چاہتے تھے لیکن ایسے بھی مواقع آئے جہاں ان کی تاویلیں مضحکہ خیز بن گئیں بہرحال تفسیر کی اشاعت نے سید احمد خاں کے مذہبی عقائد کی طرف سے بہت سے ان مسلمانوں کو بھی بدظن کر دیا جو اُن کی تعلیمی اور سیاسی خدمات کو مستحسن اور ضروری تصور کرتے تھے (مثال کے طور پر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ ان کو علی گڑھ تحریک کے تعلیمی پہلو سے کس قدر دلچسپی تھی! وہ سید احمد خاں کے تعلیمی اور سیاسی نظریات کے حامی تھے لیکن تفسیر القرآن پر اُنہوں نے نہایت سخت تنقید کی ہے اور کہا ہے کہ سید احمد خاں میں تفسیر لکھنے کی اہلیت نہیں تھی)۔ علما اور مشائخ کی مخالفت بھی بہت زیادہ

بڑھ گئی اور بعض طبقوں میں تو تکفیر تک نوبت پہنچ گئی۔ یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ ان کے اکثر عقائد اور خیالات کو جمہور مسلمانان نے نہیں مانا اور سید احمد خاں کی بڑی تصانیف میں ان کی تفاسیر بائبل وقرآن ہی سب سے کم مقبول ہوئیں۔ یہی نہیں بلکہ ان کا اثر یہاں تک ہوا کہ ان کی بعض نہایت عمدہ تصانیف سے بھی اس قدر فائدہ نہیں اٹھایا گیا جس قدر کہ اٹھایا جا سکتا تھا۔

(سرکشی ضلع بجنور مطبوعہ کراچی ص۹۲۔۹۳)

معین الدین

علی گڑھ کالج میں انگریزوں کا اپنا کھیل:

علی گڑھ کالج اسی قومی قصر کا ایک گوشہ تھا جس کا نقشہ سرسید کے ذہن میں یہ تھا کہ یہ ایک آزاد قومی ادارہ ہوگا۔ مگر اس کے قیام میں بقول عابد اللہ غازی قوم نے ساتھ نہیں دیا۔ حکومت وقت کی سرپرستی ضرور حاصل ہوگئی اور ادارہ قائم ہو گیا لیکن اس کی آزادی ختم ہوگئی اور سرسید کا نصب العین بھی گمراہ ہو گیا۔ وہاں تو انگریزوں کا رسوخ بڑھ رہا تھا اور انگریز اور مسلمان کی دوستی کے پردے میں انگریز اپنی قوم اور حکومت کا کھیل کھیل رہے تھے۔ علی گڑھ کالج کے اغراض ومقاصد کی عملی شکل جو کالج میں نظر آئی، اس کی تصویر سید عابد حسین نے ان الفاظ میں کھینچی ہے:

> ''علی گڑھ کالج کا تو بنیادی مقصد یہ تھا کہ ان کے طلبہ میں ایک ظاہری چستی، ایک نمائشی صیقل اور انگریزی حکومت کی ساختہ وفاداری اور پرداختہ رضا جوئی کا سلیقہ پیدا ہو جائے جس کی بدولت ڈگری، نوکری اور پنشن کے مرحلے آسانی سے طے ہو سکیں۔''

(جامعہ نئی دہلی، جولائی تا دسمبر ۱۹۹۸ء، ص۲۸۳۔۲۸۴)

ممتاز احمد

ہماری نوجوان نسل کا جھٹکا:

۱۸۵۷ء میں جنگِ آزادی کی ناکامی کے نتیجے میں برصغیر میں مسلمانوں کا بچا کھچا سیاسی اقتدار بھی ختم کیا جا چکا تھا اور انگریز پوری طرح ہندوستان کے سیاہ وسپید کے مختار بن چکے

تھے، تاہم مسلمانوں کا معاشی و مادی ابتلا کا شکار ہو جانا کوئی اتنا بڑا حادثہ نہ تھا جو بطور امت کے ان کے اجتماعی شعور میں بنیادی تبدیلیوں کا سبب بنتا۔ اس طرح کے حادثات قوموں کی زندگی میں ہوتے ہی رہتے ہیں اور زندہ قومیں بحرانوں سے مضمحل اور ضعیف نہیں ہوتیں بلکہ انہیں اپنی قوت و شوکت کے لئے ایک چیلنج سمجھ کر عروجِ نو کے لئے بحرانوں کو بطور زینے کے استعمال کرتی ہیں۔ اصل حادثہ اور اصل المیہ معاشی و مادی نقصانات کے علاوہ تھا اور وہ المیہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے اختتام اور انگریزوں کے سیاسی اقتدار کے آغاز کی درمیانی مدت میں مسلمانوں کے اندر سے کوئی ایسا رجلِ رشید پیدا نہیں ہوا جو ایک کی تعمیر اور دوسرے کی تخریب کے اصل وجوہ سے باخبر ہوتا اور تہذیبی انتشار کی اس فضا میں مسلمانوں کے لئے ایک ایسا لائحہ عمل تجویز کرتا جو انہیں غیر ملکی استحصال کے خلاف سینہ سپر ہونے اور دینِ حق کا علمبردار ہونے کی راہ دکھاتا۔ برعکس اس کے اس دور میں مسلمانوں کے اندر سے جو افراد اُٹھے، انہوں نے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو انگریز کی سیاسی غلامی سے سمجھوتہ کرنے کا مشورہ دیا بلکہ تہذیبی دائرے میں بھی ہتھیار ڈال دینے کی تلقین کی۔ سرسید اور ان کے رفقا کی کوششوں سے اس دور کے مسلمان نوجوان کو ڈگری اور اس ڈگری کے نتیجے میں کلرکی اور پھر اس کے نتیجے میں ڈبل روٹی تو حاصل ہوئی لیکن یہ نوجوان اس انقلابی روح سے محروم ہو گیا جو ستاروں پر کمندیں ڈالنے کے لئے مہمیز بنتی تھی۔ میکالے نے کہا تھا کہ ہم ہندوستان میں ایک ایسا نظامِ تعلیم رائج کریں گے جو نام کے مسلمان تو باقی رکھے گا لیکن ان کی روح انگریزوں جیسی ہوگی۔ سرسید نے کہا کہ ایک غیر قوم ہمارے نوجوانوں کا جھٹکا کیوں کرے، ہم خود ہی انہیں ذبح کئے دیتے ہیں؛ چنانچہ علی گڑھ تعلیمی تحریک نے جو نسل تیار کی، وہ تخلیقی صلاحیتوں سے محروم اور زندگی کے ہر دائرے میں مغربی تہذیب کی مقلد تھی۔

(فنون لاہور، مئی جون ۱۹۶۷ء، ص ۷۶۔۷۷)

پروفیسر مسز ممتاز معین

انتہا پسندی کا شکار:

سید احمد خاں نے یہ ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی کہ اسلام کی مبادیات میں کوئی

بات فطرت اور علوم فطرت کے خلاف نہیں ہے۔ کسی نظریہ کو پیش کرتے ہوئے جس چیز کی وضاحت ضروری قرار پاتی ہے وہ اسلام کے بنیادی تصور کا تعین ہے۔ اس میں شک نہیں ہے۔ مسلمان کی روزمرہ کی زندگی میں بہت سے موہوم نظریات اور رسوم بار پاچکے تھے۔ غیر تعلیم یافتہ عوام ان میں اور ایمان کی بنیادی تعلیمات میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے۔ ظاہر ہے ایمان میں اور قوانین فطرت میں تطابق پیدا کرنا نہ ممکن تھا اور نہ ضروری۔ کوئی بھی سنجیدہ مصلح ایسی کوشش نہیں کرے گا لیکن بدقسمتی سے یہ درست ہے کہ اپنے زمانہ میں رائج اسلام کی تطہیر کے جوش میں سید احمد خاں انتہاپسندی کا شکار ہو گئے۔

(تاریخ تحریک علی گڑھ ص ۱۰۳)

ناشائستہ زبان کا استعمال:

انہوں نے انقلاب کے قائدین کے خلاف بسا اوقات سخت الفاظ استعمال کئے ہیں اور کئی جگہ ناشائستہ زبان استعمال کی ہے۔ دراصل ان کے لئے یہ قریباً ناقابل برداشت تھا کہ ان کے اپنے ہم مذہب تو حکومت برطانیہ کے خلاف جنگ میں ملوث ہوئے جبکہ بجنور کے ہندو چودھری اس کی حمایت کررہے تھے۔ سید احمد خاں چاہتے تھے کہ صورت اس کے برعکس ہوتی!

(ایضاً ص ۸۳)

ڈاکٹر منظر حسین

متحدہ قومیت اور حقیقی سیکولرازم کے علم بردار:

سرسید ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے اور ہمیشہ متحدہ قومیت اور حقیقی سیکولرازم کے علم بردار...... اپنے نظریے کی تائید میں سرسید نے ہندو اور مسلمانوں کو مادر ہند کی دو رسیلی آنکھوں سے تشبیہہ دے کر ثابت کر دیا کہ باہمی اتحاد کے بغیر ہندوستان کی ترقی کا تصور ناممکن ہے...... مدرسۃ العلوم کے قیام کا ایک مقصد سرسید کے نزدیک یہ بھی تھا کہ یہ ادارہ قومی ایکتا، آپسی اتحاد و اتفاق کے لئے ممد و معاون ثابت ہوگا...... ان کے نزدیک قوم کا تصور ہندو اور مسلمان دونوں سے تھا اور وہ ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد اور باہمی ہم آہنگی کے علم بردار رہے۔

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، مارچ اپریل ۱۹۹۸ء ص ۶۴-۶۵)

پروفیسر منوّر ابنِ صادق

لادینی نصاب میں مذہبی تعلیم کی پیوندکاری:

علی گڑھ تحریک میں مغربی تعلیم کی مبالغہ آمیز تشہیر کی گئی اور دینی تعلیم کو قریب قریب نظرانداز کردیا گیا۔ اگرچہ مسلمانوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لئے مذہبی تعلیم کا کچھ حصہ بھی شامل نصاب کیا گیا لیکن اس کی حیثیت برائے نام تھی ...... جہاں تک اصول کا تعلق ہے، لادینی نصاب میں مذہبی تعلیم کی پیوندکاری سرسید کے نظریے کے خلاف تھی ...... لیکن افسوس کہ وہ ''سرکاری تسلط سے آزاد یونیورسٹی'' کے علم بردار ہونے کے باوجود سرکاری گرانٹ کے لالچ سے آزاد نہ ہوسکے، زمانے کی رو میں بہہ گئے اور جب علی گڑھ کالج قائم کرنے کا وقت آیا تو انہوں نے اپنے نظریے کے علی الرغم مسلمانوں کی تعلیم کے جسد و جان کو علیحدہ علیحدہ کرکے رکھ دیا۔ علی گڑھ دوسرے کالجوں سے کچھ مختلف نہ تھا، اس میں ''مذہبی تعلیم'' کا پیوند محض مسلمانوں کو جھانسہ دینے کے لئے تھا...... سرسید، جو اسلامی تعلیم و تہذیب کے احیا کے جذبے سے اٹھے تھے، آخرکار مغربی تہذیب و تعلیم کی اشاعت و ترویج میں مگن ہوگئے۔ وہ صرف سائنسی علوم ہی نہیں بلکہ یورپی علوم کی تعلیم و تدریس پر بھی بہت زور دیتے تھے اور مشرقی علوم پر شدید نکتہ چینی کرتے تھے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ مغربی تہذیب و تمدن اور طرز معاشرت کو افضل و ارفع سمجھنے لگ گئے۔ اس کے مقابلے میں اسلام اور اسلامی نظام کے متعلق احساس کہتری میں مبتلا تھے اور اسے مغربی نظریات کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ان کے رفقا اور تربیت یافتگان کا لہجہ بھی اسلام کی وکالت میں ہمیشہ معذرت خواہانہ رہا۔ یہ گویا میکالے کے اس خواب کی تعبیر تھی جو اُس نے ۱۸۳۵ء میں دیکھا تھا کہ ایک ایسا طبقہ پیدا کردیا جائے جو نسلاً تو ہندوستانی ہو لیکن اپنے ذہن اور مزاج کے اعتبار سے انگریز ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال صحیح دینی شعور اور اسلامی تحریک کے لئے سازگار نہ تھی۔ بلاشبہ جدید تعلیم نے مسلمانوں کو علمی سیاسی شعور عطا کیا اور وہ عصری تقاضوں کا سامنا کرنے کے اہل بن گئے لیکن ساتھ ہی اپنے تہذیبی سرمائے سے کٹ کر وہ گویا اپنے آپ سے بیگانہ ہوگئے...... یوں علی

گڑھ کے زیر اثر مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کے لئے جو قائدین تیار ہوئے، وہ علم دین سے بے بہرہ اور صحیح اسلامی تقاضوں سے قریب قریب بے خبر تھے۔

(تعلیم و تعلم، ص ۱۵۵ تا ۱۶۰)

مغربی تہذیب و تمدن سے مرعوب طبقہ:

پروفیسر (منور ابن صادق) صاحب کے نزدیک یہ علی گڑھ کی مغرب پسندی ہی کا شاخسانہ ہے کہ پاکستان میں اسلامی نظامِ تعلیم کے نفاذ میں مسلسل ناکامی ہو رہی ہے۔ فرماتے ہیں: ''جو لوگ علی گڑھ تحریک کے عام مزاج سے واقف ہیں، اُنہیں اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ ہم آج تک پاکستان میں اسلامی نظام قائم نہ کر سکے۔ علی گڑھ والوں کے خلوص پر شبہ نہ بھی کیا جائے تو بھی ان کے طریق کار سے اتفاق ناممکن ہے۔ وہ مغربی تہذیب و تمدن اور سیاست و معاشرت سے اس درجہ متاثر، بلکہ مرعوب، تھے کہ اسلام کو نافذ نہ کر سکے۔ یہ وہ تلخ حقیقت ہے جس کا اعتراف خود علی گڑھ تحریک کے وابستگان خاص اور سرسید کے مداحوں (مثلاً مولانا حالی) نے بھی کیا ہے۔

(تعلیم کے اسلامی آفاق، ص ۶۲)

ڈاکٹر منور حسین

دین کے اہم ماخذ سُنّت کے ساتھ زیادتی:

مذہب کی تفہیم و تعبیر کے سلسلے میں بھی سرسید کی کاوشوں کو دو حصوں میں تقسیم کرنا چاہیے۔ ایک حصہ اصولی اور نظری مباحث کا ہے۔ اس معاملے میں وہ اپنے وقت کے بہت سے دینی علما سے بھی آگے تھے کہ انہوں نے مذہب کی روح کو زیادہ بہتر سمجھا تھا اور اس کی معقول تفہیم کی زیادہ بہتر صلاحیت رکھتے تھے۔ دوسرا حصہ ان مذہبی اصولوں کے انطباق کا ہے جس میں انصاف کی بات یہ ہے کہ انہیں شدید ناکامی ہوئی۔ اس کی ایک وجہ سائنس سے ان کی حد درجہ مرعوبیت قرار دی جاتی ہے مگر شاید زیادہ صحیح بات سائنس اور اس کی تفصیلات سے ان کی کلی واقفیت کا نہ ہونا ہے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ انہوں نے دین کے اہم ماخذ سنت

(حدیث) کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے اور ایسی تمام احادیث کو یک قلم مسترد کردیا ہے جو اُن کی عقل کی میزان پر پوری نہ اترتی تھیں یا مغربی ذہن کو مطمئن کرنے کے لئے ان کا قلم جن سے قاصر نظر آتا تھا۔ قرآن مجید میں درج بعض اہم حقائق کا انکار یا تاویل بھی اسی قبیل کی چیز ہے۔ شاید اس کمزوری کا احساس ہی انہیں اپنی مذہبی تعبیرات کی مزید اشاعت سے دست کش ہونے کا سبب بنا۔

(تہذیب الاخلاق علی گڑھ، مارچ اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۶۰)

متحدہ قومیت کی وکالت:

سرسید نے ہمیشہ متحدہ قومیت کی وکالت کی، اس کے حق میں دلیلیں فراہم کیں اور اس تصور کو فروغ دینے کے خواہش مند رہے مگر لسانی تنازعے کے آئینے میں ان کی نگاہوں نے یہ دیکھا کہ اب یہ دونوں فرقے کبھی متحد و متفق نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے پیشین گوئی کی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج وسیع ہوتی جائے گی۔ اس پیشین گوئی کو دعوت و تلقین سمجھنا بوالعجبی اور ستم ظریفی ہے۔ اس ملک میں افتراق و انتشار کا بیج انگریزوں نے بویا، اہل ہندان کا آلہ کار بنے۔ سرسید کو علیحدگی پسند تحریک کا بانی کہنا دراصل انگریزی اس حکمتِ عملی کا حصہ ہے کہ اپنا جرم دوسروں کے سرمنڈھ دیا جائے۔ (ایضاً)

میر نجابت علی

ہندو مسلم اتحاد پر تاحیات کامل یقین:

سرسید کو عام طور پر ایک مسلم مصلح کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے لیکن درحقیقت وہ ایک سچے محب وطن تھے۔ سرجان اسٹریچی اپنی کتاب ''انڈیا - اِٹس ایڈمنسٹریشن اینڈ پروگریس'' میں لکھتے ہیں:

> ''سرسید کے علاوہ کوئی دوسرا شخص ان اثرات (نسل اور مذہب کے تعصبات) سے اپنے آپ کو اتنا الگ نہیں رکھ سکتا تھا اور نہ ہی سرسید کی طرح کسی نے اپنی ساری زندگی اور اپنے طور طریقوں سے اپنے ہندو ساتھیوں کی عزت اور ان سے اپنے تعلق کا بھرپور

اور عملی ثبوت دیا ہوگا''۔

سر سید مسلمانوں کے انڈین نیشنل کانگرس میں شامل ہونے سے متفق نہیں تھے۔ کانگرس کی طرف سے ان کا یہ رویہ کانگرس کے بنیادی اصولوں سے کسی اختلاف کی بنا پر نہیں تھا..... یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ سر سید کا انتقال کانگرس کے مستحکم اور مقبول عام ہونے اور مہاتما گاندھی کی تحریک آزادی میں جوش و خروش پیدا ہونے سے قبل ہی ۱۸۹۸ء میں ہو چکا تھا۔ اگر سر سید تحریک آزادی کے شباب کے وقت زندہ ہوتے تو اُن کا ردِعمل شاید بہت مختلف ہوتا۔ کانگرس کے بنیادی اصول، جیسے ہندو مسلم اتحاد اور قومی ترقی، پر انہیں کامل یقین تھا۔

(سر سید احمد خاں: ص ۲۱ تا ۲۳)

نسیم الظفر

عدم توازن اور انتہا پسندی:

انگلستان کے قیام کے دوران میں مغربی تہذیب کی تابناکیوں، خیرگی اور جگمگاہٹ سے دو چار ہوئے۔ سر سید ان جلوہ سامانیوں کی تاب نہ لا سکے، ان کی نگاہیں خیرہ ہوئیں اور دماغ مسحور۔ تہذیب مغرب کی تیز و تند شراب نے اس حد تک ان کے دماغ کو متاثر کیا کہ اپنی رائے میں توازن قائم نہ رکھ سکے اور انتہا پسند ہو گئے۔ ..... مغربی تہذیب سے اس حد تک مرعوب اور متاثر ہوئے کہ اسلامی تاریخ، روایات، قوانین اور آئین سے یک سر منحرف ہو جانا چاہتے تھے، اسی میں انہیں مسلمانوں کی نجات نظر آتی تھی۔

(شب چراغ: ص ۲۸۔۲۹)

ملک نصر اللہ خاں عزیز

غیرتِ اسلامی اور حمیّتِ قومی کا جنازہ:

سر سید مرحوم ..... کے بارے میں لوگوں کے مختلف خیالات ہیں۔ بعض انہیں قوم کا مخلص خادم سمجھتے ہیں، بعض ان کو اخلاص کی رعایت دینے کے لئے تیار نہیں۔ حقیقت حال کا علم

اللہ کو ہے لیکن ان کے ''تصورِ فہم'' کے بارے میں شاید دو رائیں نہیں ہوں گی کہ وہ عیسائیوں کے اس نقطہ نگاہ سے متاثر ہو گئے تھے کہ دین اور ہے اور قومی سیاست اور ...... اسلام کے متعلق اس دو عملے پن ہی نے تبلیغ اسلام کا یہ تصور پیدا کیا کہ خدا کی زمین کے کسی خطے پر کیسا ہی کافرانہ نظام قائم رہے، اس کو بدلنے کی ضرورت نہیں۔ بس مسلمانوں کو اسلام کی عبادات و رسوم پر عمل کرنا چاہیے اور غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام پہنچاتے رہنا چاہیے۔ یہ معذرت خواہانہ اور عافیت پسندانہ طرزِ عمل ہی اس امر کا باعث ہوا کہ جب ہندوستان پر انگریزی حکومت کا تسلط قائم ہو گیا تو بڑے بڑے مدعیانِ علم و فضل نے برطانوی اقتدار کے حق میں مدحیہ قصیدے پڑھنے شروع کر دئے اور انگریزوں کو یہ یقین دلانے میں ان کی ہمتیں صرف ہونے لگی کہ تم تو خدا کی طرف سے حکومت کرنے پر مامور ہو اور قرآن مجید میں جو یہ لکھا ہے کہ ''اے مومنو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسولؐ کی اطاعت اور اولوالامر کی، جو تم میں سے ہوں'' تو وہ اولولامر تم ہی ہو، تمہاری اطاعت اور وفاداری خدا کی طرف سے واجب ہے اور جو تم سے بغاوت کرتا ہے وہ نمک حرام ہے حالانکہ اسلام اور غلامی پر قناعت، یہ دو متضاد چیزیں ہیں، ایک دل میں دونوں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اور ملک خدا کا تھا، انگریزوں کا نہیں تھا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کا فاسد نظام حکومت اپنی جلو میں جو کچھ لے کر آیا، اسے مسلمان قبول اور اختیار کرتے گئے اور غیرت اسلامی اور حمیت قومی کا جنازہ نکلتا چلا گیا...... تبلیغ اسلام کا یہ تصور اس قسم کا ہے کہ ایک فوج بس صرف اس امر پر قناعت کرلے کہ وہ غنیم کی طرف بندوق چلاتی رہے اور جس علاقے کی حفاظت اور مدافعت اس پر فرض ہے اس پر غنیم کو قابض و متصرف رہنے دے، گویا اس نے جنگ کرنے کا حق ادا کر دیا کیونکہ اس نے بندوقیں چلانا جاری رکھا۔

(زندگانی کی گزرگاہوں میں: ص ۱۵۷ تا ۱۵۹)

علی گڑھ کی پیداوار حریت پسند قیادت کی عقیدتوں کے اصل مراکز:

تحریک حریت وطن کے پورے دور میں مسلمانوں کے اندر جتنی قیادت ابھری وہ علما اور علما سے عقیدت رکھنے والے لوگوں پر مشتمل تھی۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسرت موہانی اور دوسرے رہنما جو چند علی گڑھ سکول کی پیداوار تھے مگر وہ سرسید

مرحوم کی بجائے دیوبند، دہلی اور فرنگی محل لکھنؤ کے عقیدت مند تھے۔ (ایضاً ص ۲۴۸)

نعیم صدیقی

اہلِ مغرب سے مرعوبیت اور انحرافی نقطۂ نظر کا فروغ:

میرے دیرینہ نقطۂ نظر کے مطابق سرسید ہماری قوم کے دورِ شکست کے ذہنی قائد بنے۔ انہوں نے شکست کی حقیقت کے اعتراف کو نقطۂ آغاز بنایا۔ دورِ شکست کی قیادت کے لحاظ سے ہم انہیں زیادہ سے زیادہ الاؤنس دینا چاہتے ہیں مگر دو باتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے بعد کے معاشرے پر ایسے بُرے اثرات پڑے کہ ان کا نوٹس لئے بغیر چارہ نہیں۔ ایک یہ کہ انگریزوں اور اہلِ مغرب کی فکر و دانش، ان کی معاشرت اور اُن کی ثقافت کے لئے ہمارے ہاں مرعوبیت تیزی سے پھیلی اور وہ طبقہ پیدا ہوا جو ''دیسی انگریز'' کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسری یہ کہ سرسید کی تحریروں سے دینی اعتقادات، امورِ غیب، تاریخِ انبیا، معجزات اور جہاد وغیرہ کے متعلق مسلمانوں میں ایک انحرافی نقطۂ نظر فروغ پانے لگا جس کی انتہا اب بعض طبقوں کو الحاد اور سیکولرزم تک لے آئی ہے۔

(ترجمان القرآن لاہور، ستمبر ۱۹۸۲ء)

پروفیسر سید نورالحسن نقوی

کسی بھی معاملے میں مدلّل حمایت کے بعد اسی شدت سے مدلّل مخالفت:

سرسید بہت غور و فکر کے بعد کوئی رائے قائم کرتے تھے اور نہایت مضبوطی سے اس پر قائم رہتے تھے لیکن ایک دو نہیں، ان کی زندگی کے متعدد واقعات گواہ ہیں کہ وہ اپنی رائے پر نظرِ ثانی کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ انہوں نے جب جب اپنی رائے کو غلط پایا فوراً اس میں ترمیم کر لی۔ ذریعہ تعلیم کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ جس شد و مد کے ساتھ انہوں نے دیسی زبانوں کی حمایت کی تھی، آگے چل کر اسی شدت کے ساتھ اس کی مدلل مخالنت کی۔

(تہذیب کراچی، مارچ ۱۹۹۸، ص ۴۲)

سید نورالرحمٰن

مجتہدانہ حیثیت میں سب سے بڑا گناہ:

سرسید نے اپنے اجتہادات میں باوجود غیر معمولی لیاقت و قابلیت کے بے شمار غلطیاں کی ہیں اور بعض ایسی رکیک اور مہمل تاویلات پر اُتر آئے ہیں جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیونکر وہ ان طفل تسلیوں سے اپنے علمی دماغ اور تنقیدی ذوق کو مطمئن کر سکے۔ اگرچہ سرسید نے جہاں کہیں علمائے اسلام سے اختلاف کیا ہے (اور اُن کی تعداد بہت ہے) وہاں بعض اکابر علمائے اسلام اور مفسرین ان کے ہم خیال بھی پائے جاتے ہیں لیکن اکثر مسائل ایسے بھی ہیں جہاں ان کا اجتہاد تمام دنیا سے الگ ہے اور وہ تنہا ان عقائد کے حامل نظر آتے ہیں۔

(حیاتِ سرسید: ص ۱۰۵)

وہ جدید ترقیات سے اس درجہ متاثر اور مرعوب ہو چکے تھے کہ بغیر غور وفکر کے ان کو قبول و تسلیم کر لیتے تھے، چنانچہ ان کے اکثر کاموں میں یہ مغرب پرستی یا اس کا غیر محسوس اثر نمایاں ہے۔ مذہبی اجتہاد کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا کہ اول انہوں نے مغربی علم و حکمت کو حقائق سمجھ لیا اور پھر مذہب کی تاویل کی لے اس قدر بڑھائی کہ بجائے مغربی علوم کے مذہب ہی کو جھکنا پڑا۔ مجتہدانہ حیثیت میں یہ سب سے بڑا گناہ ہے۔ (ایضاً ص ۱۰۷)

وحیدالزماں

دینی علوم وفنون میں غیر ماہر

میں کہتا ہوں، سرسید پر یہی مثال لَيْسَ هٰذَا بِعُشِّكَ فَادْرُجِي (یہ تیرا جونجھ [گھونسلہ] نہیں، یہاں سے چل دے) صادق آتی ہے۔ بے شک وہ اردو کے منشی بے بدل اور پالیٹکس میں بڑے ماہر اور کامل تھے لیکن دینی علوم میں ان کو کافی مادّہ نہ تھا، نہ دنیوی علوم اور فنون یعنی فلسفہ قدیمہ اور جدیدہ میں۔ ایک بار میں نے ان سے پوچھا: ”آپ نے دینی

مسائل، جیسے حشر و نشر، وجودِ ملائکہ اور جن اور شیطان، معجزات وغیرہ میں کیوں بحث کی؟ آپ تو صرف مسلمانوں کی دنیاوی بہبودی کے خواہاں اور جویاں ہیں تو آپ کو دینی عقائد میں خلل ڈالنے کی کیا ضرورت داعی ہوئی"؟ جواب میں فرمانے لگے: "میں نے ان عقائد میں اس لئے گفتگو کی کہ اس زمانہ کے تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان فلسفۂ جدیدہ حاصل کرنے کے بعد قرآن و حدیث سے بے اعتقاد ہو جاتے ہیں۔ میں نے قرآن کو جہاں تک ہو سکا، فلسفۂ جدیدہ سے مطابق کر دینا چاہا تاکہ ان نئے مغربی تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایمان قرآن پر قائم رہے"۔ میں نے عرض کیا: "حقیقت میں یہ بڑا کام ہے۔ بے ادبی معاف ہو، حضور نے مشرقی تعلیم کہاں پائی اور مغربی تعلیم کا پاس کس کالج یا یونیورسٹی سے حاصل کیا ہے کیونکہ یہ اہم کام اسی سے ہو سکتا ہے جو فلسفۂ قدیم اور جدید اور سارے دینی علوم میں کافی مہارت رکھتا ہو۔ جیسے وہ ایک مغربی علوم کا ڈاکٹر اور پروفیسر ہو، ویسے ہی مشرقی علوم کا بھی پورا عالم اور فاضل ہو"۔ اس پر سر سید صاحب ذرا ترش رُو ہوئے۔ میں نے بحث موقوف کرنا مناسب سمجھا اور خاموشی اختیار کی۔

(حیاتِ وحید الزماں، ص ۱۵۶۔۱۵۷)

ڈاکٹر وحید قریشی

دین کو ایک گوشے میں ڈال دینے کی رسم:

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ہندی مسلمانوں کے دو الگ الگ گروہ ملتے ہیں جو مختلف دنیاؤں کے باشندے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک طرف خالص دینی تعلیم حاصل کرنے والی جماعت ہے جو چند برس میں دیوبند سے نکل کر برصغیر کی مساجد میں امامت کی کرسیوں پر متمکن دکھائی دیتی ہے۔ یہ مخلوق قرونِ وسطیٰ کی سماجی زندگی میں سانس لے رہی ہے اور اسے ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کہ دنیا گول ہے یا چپٹی۔ دوسری طرف مغربی تعلیم حاصل کرنے والی جماعت ہے جسے دین کی خبر نہیں اور مادی زندگی ہی کو سب کچھ جانتی ہے۔ سر سید اور اُن کے رفقا نے یہ سمجھا تھا کہ مغربی تعلیم اور مغربی تمدن کو جدا جدا کر کے مسلمانوں کو صرف جدید تعلیم دے کر اُن کی مذہبی زندگی کو بدستور بحال رکھا جا سکتا ہے۔ سر سید نے علی گڑھ کی فضا کو دینی رکھنے کے لئے

جو کچھ کیا اس سے ان کے خلوص پر یقین آتا ہے لیکن یہ دیکھ کر افسوس بھی ہوتا ہے کہ ان کی پوری خواہش کے باوجود دین علی گڑھ کے رگ و پے میں سرایت نہ کرسکا ۔ دینیات کا نصاب علی گڑھ میں زائد مضمون تھا جس کا تعلق امتحان لینے والی یونیورسٹی کے نصابات سے بالکل نہ تھا۔ دینیات کو پورے مغربی نصاب کی تفصیلات میں سمونے کا عمل ممکن نہ تھا اور یہ سمٹ سمٹا کر ایک مضمون کی حدود چار دیواری میں رہ گیا اور باقی جملہ علوم و مضامین سیکولر رہے۔ جدید نظام تعلیم میں دین کو بحال رکھنے کے لئے اسے جداگانہ مضمون بنانے کی کوشش الگ یونیورسٹی بنانے کے بعد بھی جاری رہی لیکن دین کو ایک گوشے میں ڈال دینے کی رسم کچھ ایسی ضرر رساں ثابت ہوئی کہ اب تک مختلف یونیورسٹیوں میں اسلامیات کی چھوٹی چھوٹی کالونیاں بنی ہوئی ہیں لیکن اُن کے اثر کا حلقہ یونیورسٹی کے دوسرے شعبوں پر معمولی سا نفوذ رکھنے کا اہل بھی نہیں ہوسکا۔ سرسید نے نوجوانوں کو دین کے قریب رکھ کر مغربی علوم سے واقف کرانے کا جو منصوبہ بنایا تھا اس کا پہلا حصہ ناکام ہوگیا۔ ان کے مقابلے میں شبلی نے ندوے کو آباد کیا کہ وہ دنیوی کام طبقہ علما میں کیا جائے جو سرسید نوجوانوں کے سلسلے میں کر رہے تھے۔ علما کو جدیدیت سے آشنا نہ کرایا جاسکا، نوجوان دین سے نا آشنا رہے۔ مسلمان معاشرے کی دولخت زندگی انہی دو انتہاؤں کے درمیان معلق رہی ۔ دین و دنیا کی یہ علیحدگی برطانوی دور کے مسلمانوں کی فکری زندگی کا عظیم سانحہ ہے۔

(قرآن حکیم کی روشنی میں تعلیم: ص ۱۵۰۔۱۵۱)

مفتی ولی حسن ٹونکی

گمراہ کن اور خطرناک فتنہ کے بانی مبانی:

موجودہ دور میں جو نئے نئے فتنے اسلام میں پیدا ہوئے ان میں سب سے گمراہ کن اور خطرناک فتنہ نیچریت ہے۔ فرقہ نیچریت سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے علوم جدید حاصل کرکے احکام شریعت کو قبول کرنے اور ان پر عمل کرنے کے لئے اپنی جزوی عقل کو معیار بنایا اور مغربی تہذیب و تمدن کو حق و باطل کا معیار ٹھہرایا۔ جنہوں نے اپنا اصول ہی یہ بنایا کہ جو چیز اُن

کی عقل سے باہر اور یورپ کے نزدیک ناپسندیدہ ہو، وہ غلط اور ناقابل قبول ہے خواہ قرآن و حدیث اس کی تائید کرتے ہوں، چنانچہ ان حضرات نے انبیاء کرام کے تمام معجزات، ملائکہ، جنات، جنت ودوزخ وغیرہ قرآن وحدیث سے ثابت شدہ مسلمات کا انکار کیا ہے۔ اس فرقہ کے بانی مبانی سرسید تھے سرسید صاحب نے سیرت پر ''خطبات احمدیہ'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف فرمائی جس کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ اس وقت کے یو۔ پی کے ایک انگریز گورنر سرولیم میور نے ''دی لائف آف محمد'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں اپنی گندی اور متعصبانہ ذہنیت کی وجہ سے حضور اکرم ﷺ کے خلاف خوب زہر اگلا.... اس وقت مسلمانوں میں غیرت وحمیت دینی موجود تھی چنانچہ سرسید صاحب نے اسی حمیت دینی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے جواب میں ''خطباتِ احمدیہ'' لکھی اور جواب لکھتے لکھتے خود بھٹک گئے اور ہر وہ حدیث جواُن کی سمجھ سے بالاتر تھی یا وہ احادیث جن پر انگریزی مؤلف نے اعتراضات کئے، ان کا جواب دینے کی بجائے صاف طور پر ان احادیث کا ہی انکار کردیا.... اصل بات یہ ہے کہ سرسید کے نزدیک انبیا علیہم السلام عام انسانوں کی طرح تھے، ان سے مافوق الفطرت اور خرقِ عادت کوئی کام سرزد نہیں ہوسکتا تھا، اسی وجہ سے معجزات کا انکار کیا اور اُن کے نزدیک یہ تمام معجزات سراسر لغو، بے ہودہ افسانے اور بے بنیاد قصے ہیں جو محض جہلا کو خوش کرنے کے لئے گھڑ لئے گئے ہیں اور علما نے اپنی نادانی کی وجہ سے ان کا انکار کرنے کی بجائے اپنی کتابوں میں جگہ دے دی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سرسید صاحب یورپین مستشرقین کے پروپیگنڈے سے صرف متاثر ہی نہیں بلکہ ان سے مرعوب بھی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اسلام کے جن عقائد پر ان کی طرف سے اعتراضات ہوتے تو سرسید صاحب کی کوشش ہوتی کہ ان کا جواب دینے کی بجائے ان عقائد ہی کو اسلامی عقائد کی فہرست سے نکال دیا جائے حالانکہ جن باتوں کا انکار سرسید صاحب نے محض عقلیت کی بنا پر کیا تھا، آج سائنس دانوں نے اس کو ثابت کردیا اور عملی طور پر پیش کر کے دکھا دیا ہے۔

(اس دور کا عظیم فتنہ: ص ۲۶ تا ۲۹)

پروفیسر ہارون الرشید

تفسیرِ سرسید نہایت غلط تاویل بلکہ تحریف کا نمونہ:

سرسید نے قرآن کی تفسیر لکھی اور اسلام کو عقل اور قانون قدرت کے مطابق ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ توحید و رسالت کے علاوہ ملت اسلامیہ کو اپنے تمام عقائد سے دست بردار ہونے کی ضرورت پیش آ گئی۔ سرسید نے ان تمام عقائد کا، جو ملت اسلامیہ کے نزدیک مسلمہ ہیں اور رسول اللہؐ کے زمانے سے لے کر اب تک مسلمان ان پر یکساں ایمان و اعتقاد رکھتے تھے، انکار کر دیا۔ انہوں نے قرآن کے بیان کردہ معجزات یا بظاہر خلافِ عقل یا خلافِ قانون طبعی امور کو قانونِ فطرت کے مطابق ثابت کیا اور اس طرح ان کی تفسیر کا ایک بڑا حصہ مادہ پرست عقلیت کے ہاتھوں نہایت غلط تاویل بلکہ تحریف کا ایک عجیب و غریب نمونہ ہو کر رہ گیا۔

(اردو ادب اور اسلام، جلد دوم: ص ۲۷۔۲۸)

انجیل میں تحریف لفظی سے انکار:

سرسید مسلمانوں کے مسلمہ عقیدے کے برخلاف بائبل میں تحریف لفظی کے قائل نہیں تھے۔ اب ظاہر ہے کہ جو تفسیر موجودہ بائبل کو حرف بہ حرف صحیح اور الہامی مان کر لکھی جائے گی، وہ کیسی ہوگی! اور جب ان احکام و تعلیمات کو قرآنی احکام و تعلیمات پر چسپاں کیا جائے گا تو پھر قرآن کی کیا حالت ہوگی! یہی وجہ ہے کہ ان کی تفسیر بائبل (تبیین الکلام) کو صرف مسلمانوں ہی نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا بلکہ عیسائیوں نے بھی سنجیدگی سے اس کا مطالعہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ شیخ محمد اکرم لکھتے ہیں:

> ''جان آرنلڈ، جن کی سرسید سے خط و کتابت تھی، اس تفسیر کے متعلق لکھتے ہیں کہ اگر تفسیر بائبل کا کام مسلمانوں ہی کے ہاتھوں ہو جائے تو پھر عیسائیوں کو یہ ثابت کرنا دشوار نہ ہوگا کہ اگر انجیل صحیح ہے تو (نعوذ باللہ) قرآن ضرور جھوٹ ہے۔''

(ایضاً: ص ۲۳۔۲۴)

مغربی تہذیب وتمدن سے مرعوبیت کا عالم:

سرسید نے اصلاح کے جوش میں ان چیزوں کی بھی اصلاح کرنی چاہی جن میں اصلاح کی ضرورت نہ تھی۔ مغربی علم وسائنس اور تہذیب وتمدن کو انہوں نے معیارِ خیر وشر قرار دیا اور اسلام اور مشرقی تہذیب وتمدن کو اسی معیار پر جانچنا شروع کیا چنانچہ اسلام کی بہت سی واضح تعلیمات اور عقائد کا انہوں نے صرف اس بنا پر انکار کر دیا کہ وہ مغرب والوں کی نگاہ میں مضحکہ خیز یا نا قابل قبول تھے۔ کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اپنی تمام دانش مندی، خودداری اور تدبر کے باوجود سرسید مغربی تہذیب وتمدن اور علم وسائنس سے بہت زیادہ مرعوب تھے اور ان کا علم دین بھی نہایت ناقص تھا؟ (ایضاً: ص ۲۹)

پروفیسر ہارون خاں شروانی

ہندو مسلم بے تعصبی کا شاہکار علی گڑھ کالج:

......وہ زمانہ تھا جب فرقہ واریت کا ڈنک ہندوستانیوں کے جسم میں پیوست نہیں ہوا تھا اور اب جو سید احمد خاں نے علی گڑھ میں کالج بنایا تو اس کی بنیاد میں بے تعصبی کی سیمنٹ کی پکی کاریاں لگا کر ایک ایسی عمارت کھڑی کی جس کا ثانی ہندوستان میں ملنا دشوار ہے...... دیکھنا یہ ہے کہ غیر فرقہ واریت کے جو آدرش سید احمد خاں نے اپنی تقریروں اور اپنے ایڈریسوں میں بیان کئے، اُن پر واقعتاً کس حد تک عمل ہوا۔ اگر ہم علی گڑھ کالج کی ابتدائی تاریخ پر غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ اس میں پہلے ہی دن غیر مسلموں کو بجنسہٖ ان شرائط پر اور انہی حقوق کے ساتھ داخل کیا گیا جو مسلمانوں کے لئے تھے۔ جب سکول ۱۸۷۶ء میں کھلا تو اس میں طلبہ کی جملہ تعداد ۸۹ تھی جس میں ۶ طالب علم ہندو تھے، اور کالج میں تو ۱۸۸۱ء سے ۱۸۸۹ء تک مشکل سے کوئی ایسا سال ہوگا جس میں ہندو طلبہ کی تعداد مسلمانوں کی تعداد کے برابر ہی نہیں بلکہ ان سے بڑھی ہوئی نہ ہو...... اسی طرح کالج سٹاف میں بھی سید صاحب نے اپنے مخصوص نظریے کے اعتبار سے ابتدا ہی سے غیر مسلم پروفیسروں کو نہایت باعزت جگہیں دیں۔ چنانچہ سٹاف کی پہلی فہرست میں من جملہ سات ہندوستانی اساتذہ کے دو ہندو یعنی جادھو چند چکرورتی اور پنڈت

شیوشنکر کے نام نظر آتے ہیں اور ان ساتوں میں سب سے زیادہ تنخواہ چکرورتی ہی کو ملتی تھی اسی طرح جہاں تک وظیفوں کا تعلق ہے، اکثر وظائف ہندو مسلمانوں دونوں کے لئے یکساں کھلے ہوئے تھے۔ لیکن بعض ایسے وظیفے بھی تھے جو صرف ہندوؤں کے لئے وقف تھے۔

(نگار کراچی، سرسید نمبر [نومبر دسمبر ۱۹۷۰ء]: ص ۷۷۔۷۸)

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

قرآن کو اپنی منشا کے مطابق بنانے کے لئے تاویلیں:

مسلمان علما اور سرسید کے مابین جو اختلاف پیدا ہوا اس کی بنیاد سراسر مذہبی ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ انہوں نے اپنی دانست میں مسلمانوں کی ترقی کو اس امر میں منحصر سمجھا کہ قرآن مجید کی تفسیر معتزلی عقائد کے مطابق کی جائے۔ چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے انہوں نے سلف صالحین کے انداز سے ہٹ کر عقلی رنگ میں قرآن کی تفسیر لکھنی شروع کی جو اگرچہ ناتمام رہ گئی تاہم ان کے مخصوص عقائد سب کے سب منظر عام پر آ گئے ..... سرسید نے قرآن کو اپنی منشا کے مطابق بنانے کے لئے تاویل کا دروازہ چوپٹ کھول دیا کہ ..... نواب محسن الملک کو مجبوراً یہ کہنا پڑا کہ ''سید صاحب! قرآنی آیات کی جو تاویلیں آپ نے کی ہیں وہ انسان تو کیا خود خدا کو بھی نہیں سوجھی ہوں گی''۔ بے شک قرآن میں تاویل جائز ہے، حنابلہ جیسے ارباب ظاہر کو بھی اس سے مفر نہیں لیکن بہر حال تاویل کسی قاعدہ کے ماتحت ہونی چاہیے اور اس کی حدود مقرر کرنا از بس ضروری ہے۔ سرسید نے یہ غضب کیا کہ اسلامی تعلیمات کو انیسویں صدی کے فلسفہ اور سائنس سے مطابق کرنے کی غرض سے قرآن کو اپنی رائے کا پابند بنا دیا۔ تاویل کا فتنہ بظاہر معمولی ہے لیکن اس کے نتائج بھی انکار معجزات کی طرح بڑے دُور رس اور مضر ہوتے ہیں۔ اگر ہر شخص کو تاویل لایعنی کی اجازت عام دے دی جائے تو پھر کلام اللہ (اعوذ باللہ) بازیچہ اطفال بن کر رہ جائے گا اور تاریخ شاہد ہے کہ سرسید کے بعد ان کے جانشینوں اور بعض ارباب غرض نے قرآن مجید اور احادیث نبوی کو سچ مچ بازیچہ اطفال بنا دیا۔

(حقیقت اسلام لاہور، فروری ۱۹۴۷ء، ص ۲۲ تا ۲۹)

اسلام کا نادان دوست:

سرسید نے بیک وقت ان دو کشتیوں میں پاؤں رکھا جو مخالف سمتوں میں جارہی تھیں۔ایک طرف انہوں نے یہ چاہا کہ مسلمان مغربی علوم سے آشنا ہو کر حکومت میں عہدے حاصل کر سکیں، دوسری طرف ان کی آرزو یہ بھی تھی کہ وہ مغربی علوم کی سمیت سے محفوظ رہیں۔ چنانچہ سم قاتل کے ازالہ کے لئے جو تریاق انہوں نے تجویز کیا وہ یہ تھا کہ دینِ اسلام کی تصویر کو سائنس کے فریم میں فٹ کیا جائے...... چونکہ قرآن کا انکار کرنے سے اسلام ہی ہاتھ سے جاتا تھا اس لئے اس کی آیات میں تاویل پر اکتفا کیا مگر احادیث کے انکار میں انہوں نے کوئی تامل نہیں کیا۔نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ وہ اسلام کے نادان دوست ثابت ہوئے یعنی انہوں نے ان تمام احادیث کا، جو اُن کے مسلک کے خلاف تھیں، انکار کر کے ہندوستان میں فتنہ انکار حدیث کا پہلا تخم بو دیا جس کے اثمارِ تلخ آج ہماری قوم کے سامنے اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ یہ مانا کہ ان کی نیت بری نہ تھی مگر اسلام کی حقانیت کے اثبات کا جو طریقہ انہوں نے اختیار کیا وہ یقیناً برا تھا۔ان کے دل میں اسلام کا درد تھا مگر ان کی نگاہ دُور بیں نہ تھی۔اُن کی تفسیر نے مسلمانوں کو نفع کی بجائے نقصان پہنچایا...... سرسید اور ان کے بعض رفقا نے استخفاف حدیث ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی عقل کو حق وباطل یا صدق وکذب کا معیار بنا کر ملت اسلامیہ میں بہت بڑے فتنہ کا دروازہ کھول دیا۔ان کی دیکھا دیکھی آگے چل کر وکیلوں، مختاروں، مدرسوں، ایڈیٹروں، مدیروں بلکہ سرکاری دفاتر کے کلرکوں کو بھی یہ حوصلہ ہو گیا کہ وہ اپنی اپنی عقل کی کسوٹی پر احادیث کو پرکھنے لگے۔

(الاعتصام لاہور، ۷ افروری ۱۹۹۵ء: ص ۳۷-۳۸)

حرفِ آخر

سرسید احمد خاں

علی گڑھ کالج میں مذہبی تعلیم کی قابلِ افسوس حالت:

مذہبی تعلیم کالج اور سکول میں جو دینی قرار پائی ہے، اس کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ مسلمان طالب علم ضروری مسائل عقائدِ مذہبی اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نکاح، وراثت، ہبہ اور وصیت سے واقف ہو جائیں۔ مذہبی تعلیم کو اس اس قدر بڑھانا جس سے تعلیم انگریزی میں ہرج اور مشکل پیش آئے، مقصود نہیں ہے، اور اسی لئے ہفتے میں صرف ایک دن مذہبی تعلیم کا ہے۔ اگر کتب مذہبی تعلیم کا سلسلہ عمدہ طرح سے قائم کیا جائے تو اس مدت میں جس قدر میں کہ انگریزی تعلیم ختم ہوتی ہے، مذہبی تعلیم میں بخوبی دستگاہ حاصل ہو سکتی ہے لیکن اگر سلسلہ تعلیم خراب طور پر ہو، جیسا کہ اب ہے، تو بجز اوقات ضائع کرنے کے اور کوئی معتد بہ فائدہ متصور نہیں۔

(خطباتِ سرسید، جلد دوم، ص ۴۶۱)

مینجنگ کمیٹی کا نسبت مذہبی تعلیم کے صرف یہ کام ہے کہ تمام بورڈروں کو پانچوں وقت کی نماز پڑھنے پر تاکید رکھتی ہے چنانچہ سب بورڈر پانچوں وقت کی نماز پڑھتے ہیں اور جس قدر کہ انہوں نے مذہبی کتابیں پڑھی ہوتی ہیں، ان میں ہر سال امتحان لے کر ہر ایک کے امتحان کے نمبر بتا دیتی ہے جو اکثر افسوس کے لائق ہوتے ہیں۔ (ایضاً ص ۴۶۲)

انگریزی پڑھنے اور علومِ جدیدہ سیکھنے کے بداثرات:

تمام اخلاق اور صفاتِ انسانی کا مجموعہ اور تمام لُبِّ لباب خدا کی مخلوق کے پیدا ہونے کے مقصد کا ان پانچ حرفوں میں ہے جس کو ہم ''اسلام'' کہتے ہیں..... نہایت افسوس اور رنج ہوتا ہے جب کہ میں دیکھتا یا سنتا ہوں کہ ہماری قوم کے بعض لڑکے جو انگریزی پڑھنا شروع کرتے ہیں، اس کا پورا پورا ادب نہیں کرتے۔ جو سوشل اور اخلاقی صفات یورپین میں

ہیں، وہی نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ اگر ہم صدیوں تک کوشش کریں تو شاید وہاں تک پہنچیں مگر افسوس یہ ہے کہ ہمارے نوجوان ان کی خوبیوں کا تو دھیان تک نہیں کرتے اور ان میں جو عیب ہیں، ان کو اختیار کر لیتے ہیں بزرگوں سے بے پروائی سے پیش آنے لگے، ماں باپ کا ادب جیسا چاہیے اس قدر بجالانا چھوڑ دیا، اپنے سے عمر میں جو بڑا ہے اس کا اور اپنے بزرگوں کے دوستوں کا لحاظ ترک کر دیا۔ یہ تمام باتیں نہایت رنج دہ ہیں۔

(مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص ۳۹۲-۳۹۳)

اب تو گویا بالاتفاق تمام مسلمان اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انگریزی پڑھنے اور علوم جدیدہ کے سیکھنے سے مسلمان اپنے عقائد مذہبی میں سست ہو جاتے ہیں بلکہ ان کو لغو سمجھنے لگتے ہیں اور لامذہب ہو جاتے ہیں اور اسی سبب سے مسلمان اپنے لڑکوں کو انگریزی پڑھانا نہیں چاہتے۔ مسلمانوں پر کیا موقوف ہے، انگریز بھی ایسا ہی خیال کرتے ہیں، چنانچہ ڈاکٹر ہنٹر صاحب نے اپنی کتاب میں، جو انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی نسبت لکھی ہے، یہ فقرہ مندرج فرمایا ہے:

> ''کوئی نوجوان، خواہ ہندو خواہ مسلمان، ایسا نہیں ہے جو ہمارے انگریزی مدرسوں میں تعلیم پائے اور اپنے بزرگوں کے مذہب سے بداعتقاد ہونا نہ سیکھے۔ ایشیا کے شاداب اور تروتازہ مذہب جب مغربی (یعنی انگریزی) علوم کی سچائی کے قریب آتے ہیں، جو مثل برف کے ہے، تو سوکھ کر لکڑی ہو جاتے ہیں۔''

آمنا وصدقنا، یہ قول ڈاکٹر ہنٹر صاحب کا بالکل سچ اور بتمامہٗ سچ ہے۔

(تہذیب الاخلاق، جلد دوم، ص ۱۹۲-۱۹۳)

تعجب یہ ہے کہ جو تعلیم پاتے جاتے ہیں اور جن سے قومی بھلائی کی امید تھی وہ خود شیطان اور بدترین قوم ہوتے جاتے ہیں۔ جس کو نہایت سعادت مند سمجھو، اخیر وہ شیطان معلوم ہوتا ہے۔

(خطوط سرسید، ص ۱۴۱)

کتابیات

(بلحاظ حروفِ تہجی)

۱۔ آثار الصنادید کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (ارشد علی) آواز عالمگیر ایجوکیشنل پبلشرز جہلم (۱۹۹۸ء)

۲۔ آزاد قوم کا نظامِ تعلیم اور پاکستان (ڈاکٹر محمد شجاع ناموس) اشاعت منزل لاہور (۱۹۵۰ء)

۳۔ آزاد کی کہانی، خود آزاد کی زبانی (بروایت: عبد الرزاق ملیح آبادی) مطبوعاتِ چٹان لاہور (۱۹۶۲ء)

۴۔ ابوالکلام آزاد (مرتبہ: عبد اللہ بٹ) معیارِ ادب کراچی (۱۹۸۶ء)

۵۔ اختلاف کے پہلو (جمال پانی پتی) اکادمی بازیافت کراچی (۲۰۰۲ء)

۶۔ ادب، علمی اور فکری زاویے (ڈاکٹر عبد الحق حسرت کاسگنجوی) نفیس اکیڈمی کراچی (۱۹۹۴ء)

۷۔ ادبیاتِ مودودی (خورشید احمد) اسلامک پبلی کیشنز لاہور (۱۹۷۶ء)

۸۔ اردو ادب اور اسلام [جلد دوم] (ہارون الرشید) اسلامک پبلیکیشنز لاہور (۱۹۷۰ء)

۹۔ اردو کی علمی ترقی میں سرسید اور ان کے رفقا کا حصہ (ڈاکٹر اے ایچ کوثر) لائبریری پروموشن بیورو کراچی (۱۹۸۴ء)

۱۰۔ اس دور کا عظیم فتنہ (مفتی ولی حسن ٹونکی) اقرا روضۃ الاطفال کراچی (۱۹۸۴ء)

۱۱۔ اسبابِ بغاوتِ ہند (مقدمہ نگار: ڈاکٹر ابواللیث صدیقی) اردو اکیڈمی سندھ کراچی (۱۹۵۷ء)

۱۲۔ اسبابِ بغاوتِ ہند (مقدمہ نگار: فوق کریمی) یونیورسٹی پبلشرز علی گڑھ (۱۹۵۸ء)

۱۳۔ اسلام اور پاکستان (ڈاکٹر اسرار احمد) مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (۱۹۸۳ء)

۱۴۔ اسلامی فرقے (عبد العزیز خاوری) مکتبہ خاوریہ لاہور (۱۹۸۴ء)

۱۵۔ اصلاح الخیال (محمد اشرف علی تھانوی) کتب خانہ جمیلی لاہور (س۔ن)

۱۶۔ افادات و ملفوظات مولانا عبیداللہ سندھی (پروفیسر محمد سرور) سندھ ساگر اکادمی لاہور (۱۹۸۴ء)
۱۷۔ اقبال اور برِصغیر کی تحریکِ آزادی (پروفیسر ڈاکٹر محمد ریاض) آئینۂ ادب لاہور (۱۹۷۸ء)
۱۸۔ اقبال کا ادبی مقام (خواجہ محمد زکریا) مکتبہ عالیہ لاہور (۱۹۸۷ء)
۱۹۔ اکبر الٰہ آبادی کا سیاسی شعور (ارشاد حسین نقوی) الحمرا اکیڈمی لاہور (۱۹۷۴ء)
۲۰۔ المیہ تاریخ (ڈاکٹر مبارک علی) پروگریسو پبلشرز لاہور (۱۹۹۳ء)
۲۱۔ النبوۃ (سید علی) انجمن دارالتالیف لکھنؤ (س۔ن)
۲۲۔ امیر علی: His Life and Work (کے۔ کے۔ عزیز) پبلشرز یونائیٹڈ لاہور (۱۹۶۸ء)
۲۳۔ انتخاب آل احمد سرور (مرتبہ: فقیر احمد فیصل) لاہور اکیڈمی لاہور (س۔ن)
۲۴۔ انتخاب احتشام حسین۔ لاہور اکیڈمی لاہور (س۔ن)
۲۵۔ انتخاب مقالاتِ شبلی۔ اردو اکیڈمی سندھ کراچی (۱۹۶۰ء)
۲۶۔ انگریز کے باغی مسلمان (جانباز مرزا) مکتبہ تبصرہ لاہور (۱۹۹۰ء)
۲۷۔ اوراقِ گم گشتہ (مرتبہ: رئیس احمد جعفری) محمد علی اکیڈمی لاہور (۱۹۶۸ء)
۲۸۔ بین الاقوامی ایجنسیوں کا تعارف (اسرار عالم) دارالعلم نئی دہلی (۱۹۹۸ء)
۲۹۔ پاکستان کا معمارِ اول (صفدر سلیمی) ادارہ طلوعِ اسلام لاہور (۱۹۶۷ء)
۳۰۔ تاریخ تحریک علی گڑھ (جسٹس قدیر الدین احمد) آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی (۱۹۸۱ء)
۳۱۔ تاریخ دعوت و جہاد (عبیداللہ فہد فلاحی) فضلی سنز کراچی (۱۹۸۶ء)
۳۲۔ تاریخ فکرِ اسلامی (پروفیسر محمد اجتبا ندوی) المرکز نئی دہلی (س۔ن)
۳۳۔ تاریخ و تحریکِ پاکستان۔ گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی (۱۹۸۴ء)
۳۴۔ تحریر فی اصول التفسیر (سرسید احمد خاں) مطبع مفید عام آگرہ (۱۸۹۲ء)
۳۵۔ تحریکِ اسلامی شاہ ولی اللہ سے علامہ اقبال تک (پروفیسر خورشید احمد) ادارہ مطبوعات طلبہ لاہور (۱۹۷۵ء)
۳۶۔ تحریک جامعہ محمدی (سید محمد متین ہاشمی) جامعہ محمدی شریف ضلع جھنگ (۱۹۷۳ء)
۳۷۔ تحریک علی گڑھ تا قیام پاکستان (ڈاکٹر ایچ۔ بی۔ خان) الحمد اکادمی کراچی (۱۹۹۸ء)
۳۸۔ تذکرہ (ابوالکلام آزاد) ساہتیہ اکادیمی نئی دہلی (۱۹۸۵ء)
۳۹۔ تذکرہ سرسید (محمد امین زبیری) پبلشرز یونائیٹڈ لاہور (۱۹۶۱ء)
۴۰۔ تذکرۂ محسن (محمد امین زبیری) نیشنل بک ہاؤس لاہور (۱۹۸۷ء)
۴۱۔ تذکرۂ وقار (محمد امین زبیری) عزیزی پریس آگرہ (۱۹۳۸ء)

۴۲۔ تصفیۃ العقائد (محمد قاسم نانوتوی) دارالاشاعت کراچی (۱۹۷۶ء)
۴۳۔ تعلیم اسلامی تناظر میں (جلد چہارم) انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز اسلام آباد (۱۹۸۶ء)
۴۴۔ تعلیم کے اسلامی آفاق (مسرت شوکت چیمہ) اسلامک ایجوکیشنل ٹرسٹ لاہور (۱۹۹۵ء)
۴۵۔ تعلیم و تعلم (مرتبہ: مسعود صدیقی) صادقیہ پبلی کیشنز لاہور (۱۹۷۳ء)
۴۶۔ تعلیمی فلسفہ اور تاریخ (محمد عیسیٰ خاں) علمی کتاب خانہ لاہور (۱۹۹۲ء)
۴۷۔ تفسیر حقانی (عبدالحق حقانی) دارالاشاعت تفسیر حقانی دہلی (۱۳۵۷ھ)
۴۸۔ تفہیم و تجزیہ (ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی) کلیہ علومِ اسلامیہ شرقیہ جامعہ پنجاب لاہور (۱۹۹۹ء)
۴۹۔ تنقیدی تحریریں (کریم الدین احمد) آئینۂ ادب لاہور (۸۴۔۱۹۸۳ء)
۵۰۔ توضیح الاحکام (مفتی محمد عمر الدین) مطبع حنفیہ پٹنہ (۱۳۲۵ھ)
۵۱۔ تہذیب الاخلاق [جلد چہارم] (مرتبہ: ملک فضل الدین) اللہ والے کی قومی دکان لاہور (س۔ن)
۵۲۔ جدید ہندوستان کے سیاسی اور سماجی افکار (ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی) ترقی اردو بیورو نئی دہلی (۱۹۸۵ء)
۵۳۔ جستجو (ڈاکٹر تحسین فراقی) یونیورسل بکس لاہور (۱۹۸۷ء)
۵۴۔ جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی (ڈاکٹر اسرار احمد) مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (۱۹۹۱ء)
۵۵۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء (خورشید مصطفیٰ رضوی) الفیصل لاہور (۱۹۹۰ء)
۵۶۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء—واقعات و شخصیات (محمد ایوب قادری) پاک اکیڈمی کراچی (۱۹۷۶ء)
۵۷۔ چند ہم عصر (عبدالحق) انجمن ترقی اردو ہند دہلی (۱۹۴۲ء)
۵۸۔ حالی کا ذہنی ارتقا (ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں) مکتبہ کارواں لاہور (۱۹۶۶ء)
۵۹۔ حالی کا سیاسی شعور (معین احسن جذبی) آئینۂ ادب لاہور (۱۹۶۳ء)
۶۰۔ حیات النذیر (سید افتخار عالم بلگرامی) شمسی پریس دہلی (۱۹۱۲ء)
۶۱۔ حیاتِ جاوید (الطاف حسین حالی) نامی پریس کان پور ((۱۹۰۱ء)
۶۲۔ حیاتِ سرسید (نورالرحمٰن) انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ (۱۹۵۰ء)
۶۳۔ حیاتِ وحید الزماں (محمد عبدالحلیم چشتی) مرتبہ و مطبوعہ وزیر احسان رشید کراچی (طبع دوم)
۶۴۔ خطباتِ عبدالحق (مرتبہ: ڈاکٹر عبادت بریلوی) انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی (۱۹۵۲ء)
۶۵۔ خود نوشت افکار سرسید (مرتبہ: ضیاء الدین لاہوری) جمعیت پبلیکیشنز لاہور (۲۰۰۴ء)
۶۶۔ خود نوشت حیات سرسید (مرتبہ: ضیاء الدین لاہوری) جمعیت پبلیکیشنز لاہور (۲۰۰۵ء)
۶۷۔ دینی مدارس کی مثالی خدمات (زاہد الراشدی) مکتبہ کتاب گھر لاہور (۲۰۰۱ء)



۶۸۔ ذاکر صاحب اپنے آئینۂ لفظ و معنی میں (ضیاء الحسن فاروقی) جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی (۱۹۸۷ء)
۶۹۔ روشن خیال سر سید احمد خاں (زاہد چوہدری) ادارہ مطالعۂ تاریخ لاہور (۱۹۹۹ء)
۷۰۔ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی (عزیز الرحمٰن جامعی) تعلیمی ساجی مرکز دہلی (۱۹۶۱ء)
۷۱۔ زاویۂ نظر (شمیم احمد) روبی پبلشرز کوئٹہ (۱۹۸۷ء)
۷۲۔ زندگانی کی گزرگاہوں میں (ملک نصر اللہ خاں عزیز) تسنیم پبلی کیشنز لاہور (۱۹۹۴ء)
۷۳۔ سرسید احمد خاں (عبدالسلام خورشید) قومی کتب خانہ لاہور (۱۹۶۳ء)
۷۴۔ سرسید احمد خاں (میر نجابت علی: ترجمہ سید ابوالحسنات) ترقی اردو بورڈ نئی دہلی (۱۹۷۳ء)
۷۵۔ سرسید احمد خاں -- ایک سیاسی مطالعہ (عتیق صدیقی) مکتبہ جامعہ نئی دہلی (۱۹۷۷ء)
۷۶۔ سرسید احمد خاں -- حالات و افکار (عبدالحق) انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی (۱۹۷۵ء)
۷۷۔ سرسید احمد خاں -- شخصیت اور فن (جمیل یوسف) اکادمی ادبیاتِ پاکستان اسلام آباد (۱۹۹۹ء)
۷۸۔ سرسید احمد خاں اور اُن کا عہد (پروفیسر ثریا حسین) ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ (۱۹۹۳ء)
۷۹۔ سرسید احمد خاں اور اُن کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ (ڈاکٹر سید عبداللہ) مکتبہ کارواں لاہور (۱۹۶۰ء)
۸۰۔ سرسید احمد خاں اور جدت پسندی (ڈاکٹر محمد علی صدیقی) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی (۲۰۰۳ء)
۸۱۔ سرسید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک کے ناقدین کا تحقیقی جائزہ (ڈاکٹر سید محبوب شاہ) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کراچی (۲۰۰۰ء)
۸۲۔ سرسید احمد خاں کا مقدمہ (رعایت اللہ فاروقی) سوادِ اعظم اہلِ سنت چترال (س۔ن)
۸۳۔ سرسید احمد خاں کا نیا مذہبی طرزِ فکر (پروفیسر محمد عمر الدین) ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور (۱۹۹۵ء)
۸۴۔ سرسید اور اردو صحافت (طاہر نسیم) مکتبہ عالیہ لاہور (۱۹۸۰ء)
۸۵۔ سرسید اور حالی کا نظریۂ فطرت (ڈاکٹر ظفر حسن) ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور (۱۹۹۰ء)
۸۶۔ سرسید اور علوم اسلامیہ (مرتبہ: محمد یٰسین مظہر صدیقی) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۲۰۰۱ء)
۸۷۔ سرسید تاریخی و سیاسی آئینے میں (ڈاکٹر شان محمد) انوار بک ڈپو علی گڑھ (۱۹۶۷ء)
۸۸۔ سرسید تحریک کا ردِعمل (ڈاکٹر صدیقہ ارمان) علی گڑھ مسلم اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کراچی (۱۹۹۹ء)
۸۹۔ سرسید، جناح، مشرقی (رابعہ شیر زمان) مدنی پبلی کیشنز راولپنڈی (۱۹۹۰ء)
۹۰۔ سرسید سے اقبال تک (قاضی جاوید) نگارشات لاہور (۱۹۸۶ء)
۹۱۔ سرسید کا علمی کارنامہ (قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی) اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کراچی (۱۹۶۴ء)

۹۲۔ سرسید کی ادبی خدمات اور ہندوستانی نشاۃِ ثانیہ (ڈاکٹر قدسیہ خاتون) کتابستان الہ آباد (۱۹۸۱ء)
۹۳۔ سرسید کی اسلامی بصیرت (جمال خواجہ) نیو علی گڑھ موومنٹ علی گڑھ (۱۹۸۷ء)
۹۴۔ سرسید کی فکر اور عصرِ جدید کے تقاضے (خلیق احمد نظامی) انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی (۱۹۹۳ء)
۹۵۔ سرسید کی کہانی، اُن کی اپنی زبانی (مرتبہ: ضیاء الدین لاہوری) جمعیۃ پبلیکیشنز لاہور (۲۰۰۵ء)
۹۶۔ سرسید کے سیاسی افکار (ڈاکٹر فوق کریمی) ایشیا بک سنٹر لاہور (۱۹۹۰ء)
۹۷۔ سرکشی ضلع بجنور (مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الحق) سلمان اکیڈمی کراچی (۱۹۶۲ء)
۹۸۔ سرکشی ضلع بجنور (مرتبہ: شرافت حسین مرزا) ندوۃ المصنفین دہلی (۱۹۶۴ء)
۹۹۔ سفر اور تلاش (حکیم محمود احمد برکاتی) مجلس مطبوعات و تحقیقات اردو جامعہ کراچی (س۔ن)
۱۰۰۔ سید جمال الدین افغانی -- حیات و افکار (شاہد حسین رزاقی) اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی (۱۹۹۲ء)
۱۰۱۔ سیرتِ فریدیہ (مرتبہ: حکیم محمود احمد برکاتی) پاک اکیڈمی کراچی (۱۹۶۴ء)
۱۰۲۔ سیلیکٹڈ ڈاکومنٹس فرام دی علی گڑھ آرکائیوز (مرتبہ: یوسف حسن) یونیورسٹی پریس علی گڑھ (۱۹۶۶ء)
۱۰۳۔ شب چراغ (نسیم المظفر) اشاعت منزل لاہور (۱۹۵۴ء)
۱۰۴۔ شبلی نامہ (شیخ محمد اکرام) تاج آفس بمبئی (س۔ن)
۱۰۵۔ شہابِ ثاقب (علی بخش خاں) مطبع نول کشور لکھنؤ (۱۸۷۳ء)
۱۰۶۔ شہاب نگر (قدرت اللہ شہاب) جنگ پبلشرز لاہور (۱۹۹۱ء)
۱۰۷۔ طیفِ نثر (ڈاکٹر سید عبداللہ) نذر سنز لاہور (۱۹۶۴ء)
۱۰۸۔ عزیزانِ علی گڑھ (رشید احمد صدیقی) بیکن بکس ملتان (۱۹۹۰ء)
۱۰۹۔ عقائدِ اسلام (محمد ادریس کاندھلوی) المطبع الاسلامی السعودی پاکستان (س۔ن)
۱۱۰۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی [جلد چہارم] (سید محمد میاں) ایم برادرس دہلی (۱۹۶۰ء)
۱۱۱۔ علی گڑھ تحریک -- سیاسی اور سماجی مطالعہ (مظہر حسین) انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی (۱۹۹۳ء)
۱۱۲۔ علی گڑھ کی علمی خدمات (خلیق احمد نظامی) انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی (۱۹۹۴ء)
۱۱۳۔ فتنۂ انکارِ حدیث کا منظر و پس منظر (افتخار احمد بلخی) مکتبہ چراغِ راہ کراچی (س۔ن)
۱۱۴۔ فرنگیوں کی لن ترانیاں (محمد رحیم دہلوی) مکتبہ رضیہ کراچی (۲۰۰۱ء)
۱۱۵۔ فکرِ روشن (آل احمد سرور) ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ (۱۹۹۵ء)
۱۱۶۔ فیض الغنی (پروفیسر محمد یعقوب شاہق) سدا بہار پبلشرز لاہور (۲۰۰۱ء)
۱۱۷۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی (نور الحق قریشی) مکتبہ احسان ملتان (س۔ن)

۱۱۸۔ قرآنِ حکیم کی روشنی میں تعلیم (ڈاکٹر وحید قریشی) آل پاکستان سلامک ایجوکیشن کانگرس لاہور (س۔ن)

۱۱۹۔ کلیاتِ نثرِ حالی [جلد دوم] (مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب لاہور (۱۹۶۸ء)

۱۲۰۔ گفتگو (مرتبہ مظہر جمیل) مکتبہ دانیال کراچی (۱۹۸۶ء)

۱۲۱۔ لغزشیں (حافظ عبدالرزاق) ادارہ نقشبندیہ اویسیہ جہلم (س۔ن)

۱۲۲۔ لکچروں کا مجموعہ [جلد اول] (ڈپٹی نذیر احمد) مفیدِ عام اسٹیم پریس آگرہ (۱۹۱۸ء)

۱۲۳۔ مائی الاسلام [جلد اول] (اصغر علی روحی) منظورِ عام پریس لاہور (۱۹۳۱ء)

۱۲۴۔ مائی لائف -- اے فریگمنٹ (محمد علی جوہر) شیخ محمد اشرف لاہور (۱۹۴۲ء)

۱۲۵۔ مجموعہ لکچرز و اسپیچز نواب محسن الملک۔ مرتبہ و مطبوعہ ملک فضل الدین لاہور (۱۹۰۴ء)

۱۲۶۔ محرف قرآن سرسید احمد خاں (سید تصدق بخاری) ادارہ العلم والتحقیق نوشہرہ (۱۹۹۹ء)

۱۲۷۔ مسلم ثقافت ہندوستان میں (عبدالمجید سالک) ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور (۱۹۵۷ء)

۱۲۸۔ مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش (سید ابوالحسن ندوی) مجلس نشریاتِ اسلام کراچی (س۔ن)

۱۲۹۔ مسلمان اور مغربی تعلیم پاک و ہند میں (سید محمد سلیم) ادارہ تعلیمی تحقیق لاہور (۱۹۸۹ء)

۱۳۰۔ مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش [حصہ سوم] (سید ابوالاعلیٰ مودودی) رسالہ ترجمان القرآن پٹھانکوٹ (۱۹۴۲ء)

۱۳۱۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل (سید طفیل احمد منگلوری) مکتبہ جامعہ دہلی (۱۹۴۰ء)

۱۳۲۔ مسلمانوں کی تعلیمی فکر کا ارتقا (بختیار حسین صدیقی) ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور (۱۹۸۳ء)

۱۳۳۔ مصلحین امت (ڈاکٹر احمد امین: ترجمہ شیخ نذیر حسین) مکتبہ علمیہ لاہور (۱۹۶۳ء)

۱۳۴۔ مضامین جمال الدین افغانی (مترجمہ محمد عبدالقدوس قاسمی) ادارہ فروغِ اردو لاہور (طبع دوم)

۱۳۵۔ مضحکات، مطائباتِ سرسید (شیر علی خاں سرخوش) گیلانی برقی پریس لاہور (س۔ن)

۱۳۶۔ مطالعہ پاکستان (عبدالقادر خاں) پنجاب پبلشنگ کارپوریشن لاہور (۱۹۸۴ء)

۱۳۷۔ مطالعہ سرسید احمد خاں (عبدالحق و دیگر) الرائیس ٹریڈرز لاہور (س۔ن)

۱۳۸۔ مغرب کے زیر اثر مسلمانوں کا سیاسی مسلک فکر و عمل (ڈاکٹر کلیم صدیقی) مسلم انسٹی ٹیوٹ لندن (۱۹۹۱ء)

۱۳۹۔ مقالات جمال الدین افغانی (مترجمہ سید مبذر الدین رفعت) دارالاشاعت سیاسیہ حیدرآباد دکن (۱۹۴۳ء)

۱۴۰۔ مقالات حالی (جلد اول) انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی (۱۹۵۵ء)

۱۴۱۔ مقالات سرسید [جلد دہم] (مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب لاہور (۱۹۶۲ء)

۱۴۲۔ مقالات شبلی (جلد ہشتم) مطبع معارف اعظم گڑھ (۱۹۵۰ء)

۱۴۳۔ مقالات قومی سرسید سیمنار (مرتبہ ریاض الرحمن شروانی) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ (۲۰۰۰ء)

۱۴۴۔ مقاماتِ ناصری (میر ناصر علی دہلوی) انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی (۱۹۶۹ء)
۱۴۵۔ مکاتیب حافظ محمود شیرانی۔ مجلس یادگار حافظ محمود شیرانی لاہور (۱۹۸۱ء)
۱۴۶۔ مکاتیب نواب محسن الملک ونواب وقار الملک (مرتبہ: محمد امین زبیری) شمسی مشین پریس آگرہ (س۔ن)
۱۴۷۔ موجِ کوثر (شیخ محمد اکرام) مرکنٹائل پریس لاہور (۱۹۴۰ء)
۱۴۸۔ ایضاً ... ... فیروز سنز لاہور (۱۹۵۴ء)
۱۴۹۔ موعظۂ حسنہ (ڈپٹی نذیر احمد) مطبع انصاری دہلی (۱۳۰۸ھ)
۱۵۰۔ مولانا آزاد اور ان کے چند بزرگ دوست اور عقیدت مند (ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری) ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کراچی (۱۹۹۷ء)
۱۵۱۔ مولانا آزاد، سرسید اور علی گڑھ (ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری) انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی (۱۹۹۲ء)
۱۵۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ فکر ونظر کی چند جہتیں (ضیاء الحسن فاروقی) مکتبہ اخوت لاہور (۱۹۹۶ء)
۱۵۳۔ مولانا اشرف علی تھانوی اور تحریکِ آزادی (پروفیسر احمد سعید) خالد ندیم پبلی کیشنز راولپنڈی (۱۹۷۲ء)
۱۵۴۔ مولوی نذیر احمد دہلوی۔۔احوال وآثار (افتخار احمد صدیقی) مجلس ترقی ادب لاہور (۱۹۷۱ء)
۱۵۵۔ میری علمی اور مطالعاتی زندگی (مرتبہ: عبدالقیوم حقانی) موتمر المصنفین اکوڑہ خٹک (۱۹۹۱ء)
۱۵۶۔ میکالے کا نظریۂ تعلیم (عبدالحمید صدیقی) روبیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی کراچی (۱۹۶۵ء)
۱۵۷۔ نصرۃ الابرار (مرتبہ: محمد لدھیانوی) مطبع صحافی لاہور (۱۸۸۸ء)
۱۵۸۔ نقشِ سرسید (ضیاء الدین لاہوری) دارلکتاب لاہور (۲۰۰۴ء)
۱۵۹۔ نمودِ فن (اسرار احمد سہاروی) فروغ ادب اکادمی گوجرانوالہ (۱۹۹۸ء)
۱۶۰۔ نئے اور پرانے چراغ (آل احمد سرور) اردو اکیڈمی سندھ کراچی (۱۹۵۷ء)
۱۶۱۔ ولی خاں اور قراردادِ پاکستان (مرتبہ: محمد فاروق قریشی) فکشن ہاؤس لاہور (۱۹۹۷ء)
۱۶۲۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم (ڈاکٹر سلامت اللہ) مکتبہ جامعہ نئی دہلی (۱۹۹۰ء)
۱۶۳۔ ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج (ڈاکٹر رفیق زکریا) ترقی اردو بیورو نئی دہلی (۱۹۸۵ء)
۱۶۴۔ یادگارِ شبلی (شیخ محمد اکرام) ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور (۱۹۷۱ء)
۱۶۵۔ یادوں کی برأت (جوش ملیح آبادی) شالیمار آفسٹ پریس دہلی
۱۶۶۔ ۲+۲=۵ (شمیم احمد) زمرد پبلی کیشنز کوئٹہ (۱۹۹۲ء)
۱۶۷۔ ۵۔اے ذیلدار پارک (گفتگو سید مودودی، مرتبہ رفیع الدین ہاشمی) البدر پبلی کیشنز لاہور (۱۹۷۹ء)

اخبارات و رسائل

(شماروں کے حوالے متن میں)

روزنامے

۱۔ انصاف لاہور

۲۔ جسارت کراچی

۳۔ جنگ لاہور

۴۔ نوائے وقت لاہور

ہفت روزے

۱۔ آج کل لاہور

۲۔ الاعتصام لاہور

۳۔ چٹان لاہور

۴۔ خدام الدین لاہور

۵۔ زندگی لاہور

۶۔ فرائیڈے ٹائمز لاہور

۷۔ فرنٹیئر پوسٹ لاہور

ماہنامے

۱۔ اردو بک ریویو نئی دہلی

۲۔ اسلام اور عصر جدید نئی دہلی

۳۔ ابلاغ کراچی

۴۔ التبلیغ راولپنڈی

۵۔ الجمعیۃ راولپنڈی

۶۔ الحق اکوڑہ خٹک

۷۔ الرحیم حیدر آباد

۸۔ الشریعۃ گوجرانوالہ

۹۔ العصر پشاور

۱۱۔ المعارف لاہور

۱۲۔ بیدار ڈائجسٹ لاہور

۱۳۔ تخلیق لاہور

۱۴۔ تذکرہ لاہور

۱۵۔ ترجمان القرآن لاہور

۱۶۔ تعمیرِ افکار کراچی

۱۷۔ تہذیب کراچی

۱۸۔ تہذیب الاخلاق لاہور

۱۹۔ تہذیب الاخلاق علی گڑھ

۲۰۔ تہذیبِ نسواں لاہور

۲۱۔ ثقافت لاہور

۲۲۔ جامعہ نئی دہلی

۲۳۔ حقیقتِ اسلام لاہور

۲۴۔ دارالعلوم دیوبند

۲۵۔ درویش لاہور

۲۶۔ ذکر و فکر دہلی

۲۷۔ رحیق لاہور

۲۸۔ ساحل کراچی

۲۹۔ سپوتنک لاہور

۳۰۔ فاران کراچی

۳۱۔ فکر و نظر اسلام آباد

۳۲۔ فکر و نظر علی گڑھ

۳۴۔ قومی ڈائجسٹ لاہور

۳۵۔ کانفرنس گزٹ علی گڑھ

۳۶۔ ماہِ نو لاہور

۳۷۔ محدث لاہور

۳۸۔ محدث بنارس

۳۹۔ معارف اعظم گڑھ

۴۰۔ منشور کراچی

۴۱۔ نقطۂ نظر اسلام آباد

۴۲۔ نقیب ختمِ نبوت ملتان

۴۳۔ نگار کراچی

۴۴۔ نیاز زمانہ لاہور

سہ ماہی

۱۔ آواز لاہور

۲۔ اردو نامہ کراچی

۳۔ فکر و نظر اسلام آباد

تعلیمی اداروں کے میگزین

۱۔ اورینٹل کالج میگزین لاہور

۲۔ برگ گل کراچی

۳۔ علومِ اسلامیہ علی گڑھ

۴۔ کریسنٹ لاہور

۵۔ مسلک ملتان

کتابی سلسلہ

ضیاءالدین لاہوری کی دیگر تالیفات

سرسید کی کہانی، اُن کی اپنی زبانی

الطاف حسین حالی کی روایت کے مطابق سرسید احمد خاں [illegible]
ابوسلمان شاہجہان پوری کے طویل مقدمے نے [illegible] بنا دیا ہے۔

خودنوشت حیاتِ سرسید

سرسید احمد خاں کی منتشر تحریروں سے ایک روانی کے ساتھ تدوین [illegible]
معلوم ہوتا ہے جیسے سرسید نے اسے اپنے آخری دور میں خود نوشت کے طور پر [illegible]
حوالے کے ساتھ۔ سرسید کی صحیح تصویر ان کے اپنے آئینے میں۔ جنگِ آزادی کے دوران [illegible]
کے کارندوں کی سیاہ کاریوں کے ثبوت۔

خودنوشت افکارِ سرسید

سرسید احمد خاں کی بیسیوں تصانیف اور متعدد جرائد ورسائل سے خود نوشت کے انداز میں مرتب کئے گئے
موصوف کے مذہبی، معاشرتی، تعلیمی اور سیاسی افکار کا مجموعہ۔ سینکڑوں ذیلی عنوانات۔ برصغیر کی [illegible]
شخصیت کے عقائد ونظریات پر حوالہ جات کی ایک جامع اور مستند کتاب۔

نقشِ سرسید

سرسید کی حیات اور ان کے افکار کے متعدد پہلوؤں پر برصغیر کے مؤقر علمی جرائد میں شائع ہونے والے
ضیاء الدین لاہوری کے تحقیقی مضامین کا مجموعہ۔ یہ مضامین متعلقہ موضوعات پر ہمارے شعبہ ہائے
نشرواشاعت اور تعلیمی نصاب کے اختراعات کے رد میں فکر کی درست سمت متعین کرتے ہیں۔

آثارِ سرسید

مختلف جرائد اور اخبارات میں سرسید کے شیدائی قلمکاروں کے ساتھ کئے گئے ضیاء الدین لاہوری کے علمی
مباحث کا مجموعہ۔ معروف اور نامور مضمون نگاروں اور مصنفین کی تحریروں میں تضادات اور تحریفات کی
نشان دہی۔ سرسید کے ساتھ چند تخیلاتی انٹرویوز کا ایک خاکہ: سوالات مؤلف کے اور جوابات سرسید کی
تحریروں سے باقاعدہ حوالوں کے ساتھ۔ چند عنوانات کے تحت سرسید سے متعلق تحریروں سے چھوٹے
چھوٹے اہم اور دلچسپ نکات کا بلا تبصرہ انتخاب۔

کتابیاتِ سرسید

سرسید کی تصانیف کے مطبوعہ نسخوں کے کوائف ان کی پچاس سے زائد تالیفات کے سرورق ہائے کی عکسی نقول
کے ساتھ۔ ان کی حیات اور افکار پر تالیف کی گئی کتابوں کی فہرست۔ ''تہذیب الاخلاق'' اور ''علی گڑھ انسٹیٹیوٹ
گزٹ'' میں تحریر کردہ سرسید کے مضامین کا اشاریہ۔ اس کے علاوہ ان کی حیات کے اہم سنین کی فہرست۔

بہادر شاہ ظفر کے شب و روز

وقت کے روزنامچوں اور اخبارات کے اقتباسات سے مرتب کردہ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے روزمرہ معمولات کا آنکھوں دیکھا حال۔ شاہی محل کے اندر اور باہر کے حالات کا بیان متحرک تصاویر کے مناظر کی مانند۔ بادشاہ کی حکومتی مصروفیات اور نجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ایک جامع خاکہ۔ باہمی معاہدوں اور سرکاری خط و کتابت کے الفاظ میں مغل سلطنت کے خلاف انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کے متعدد نمونے۔

مغلیہ دہلی کے آخری ایام

۱۸۵۷ء کے فیصلہ کن چار ماہ۔ دہلی کے اندر اور باہر کیا کچھ ہوتا رہا؟ اپنوں اور غیروں کی مصروفیات کیا کیا عالم تھا؟ حریت پسندوں، انگریزی جاسوسوں اور سرکاری فوج کی کارروائیوں کی مصدقہ رپورٹیں جو وقت کے روزنامچوں، اخباری اطلاعات اور انگریز انٹیلی جنس افسروں کی باہمی سرکاری خط و کتابت سے منتخب کی گئی ہیں۔

رویت ہلال موجودہ دور میں

دینی تقاضوں کے مطابق رویتِ ہلال کے مفہوم کی وضاحت۔ علوم فلکیات کے جدید اصولوں کی روشنی میں رویت ہلال کے مشاہدات کا جائزہ اور نیا چاند دکھائی دیے جانے والی شام کا تعین۔ مشرقِ وسطیٰ اور دیگر ممالک کے مابین غیر حقیقی اختلافِ رویت کا پس منظر اور قبل از وقت چاند ہو جانے کے اعلانات کا فکر انگیز تجزیہ۔

جوہرِ تقویم

ہزار ہا سالوں پر مشتمل ہجری و عیسوی تقویم کے کسی بھی سال کا مکمل کیلنڈر جمع، تفریق، ضرب، تقسیم کے بغیر چند سیکنڈ میں دستیاب۔ میلادالنبی ﷺ سے منسوب سال سے لے کر اکیسویں صدی عیسوی کے اختتام تک ہر شمسی مہینے کے آغاز کی تقابلی قمری تاریخ مع مہینہ، ہجری سال اور ہفتے کا دن۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا سے اکیسویں صدی عیسوی تک ہر مہینے کی رویتِ ہلال سے متعلق مستند فلکیاتی معلومات۔ عہدِ نبویؐ کے دور کی تقویم پر تحقیقی جدولیں۔

ہجری عیسوی تقابلی سنین

نہایت مختصر انداز میں ۵۶۹ عیسوی سے ۲۱۰۰ عیسوی تک ہر یکم محرم کی عیسوی تاریخ دن، مہینے اور سال کے تعین کے ساتھ۔ مقابل صفحوں پر ان عیسوی سالوں کی یکم جنوری کی قمری تاریخیں دن، مہینے اور سال کے تعین کے ساتھ۔

HIJRA AND CHRISTIAN CALENDARS

انگریزی خواں طبقے کے لئے ''جوہرِ تقویم'' کا متبادل